ہماری بات

ہر ہندوستانی کو مفت اور معیاری تعلیم کا آئینی حق دینے کے سلسلے میں دو بڑے اہم واقعات حال ہی میں رونما ہوئے ہیں جو آنے والے دنوں میں اس ملک کی تصویر اور تقدیر دونوں کو بدل سکتے ہیں۔ پہلا یہ کہ ہماری عدالتِ عظمیٰ نے حکومت کی طرف سے تجویز کی گئی اس شرط کو جائز قرار دے دیا کہ ان پرائیویٹ اسکولوں کو، جو کسی نہ کسی قسم کی سرکاری مراعات حاصل کر چکے ہیں یا کر رہے ہیں، اپنے یہاں 25 فیصد نشستیں آس پاس رہنے والے سماج کے کمزور، غریب اور پچھڑے ہوئے کنبوں کے بچوں کے لیے محفوظ کرنی ہوں گی تاکہ یہ محروم بچے بھی مفت اور معیاری تعلیم حاصل کر سکیں۔ اس طرح حقِ تعلیم ایکٹ کے عملی نفاذ کے راستے میں حائل ایک بڑی قانونی رکاوٹ دور ہو گئی ہے۔



دوسرا واقعہ یہ ہوا کہ حکومت نے اقلیتوں کے اپنے تعلیمی اداروں کو، خواہ وہ سرکاری مراعات حاصل کر رہے ہوں یا نہ کر رہے ہوں، اس ایکٹ کی پابندیوں سے مستثنیٰ کر دیا ہے۔ اقلیتوں کے بعض حلقے حکومت کے فیصلوں کو شک کی نظر سے دیکھ رہے تھے اور انھیں یہ تشویش لاحق تھی کہ حقِ تعلیم ایکٹ سے کہیں وہ بالواسطہ طور پر سرکاری کنٹرول میں نہ آ جائیں اور تعلیم کے سلسلے میں ان کی مذہبی آزادی کم نہ ہو جائے۔ حکومت نے بجا طور پر محسوس کیا کہ یہ مذہبی تعلیمی ادارے پہلے ہی سماج کے غریب اور محروم بچوں کو تقریباً مفت تعلیم دینے کی پالیسی پر گامزن ہیں لہٰذا انھیں سرکاری پابندیوں کے دائرے میں لانا کسی طرح بھی سودمند نہیں ہوگا۔

تعلیم کو لازمی قرار دیتے ہوئے ابتدائی درجات میں مفت اور معیاری تعلیم کا حق تفویض کرنے والا یہ قانون آزاد ہندوستان کی تاریخ کا بے حد اہم قانون ہے جس کے کامیاب نفاذ کو حکومت نے بھی ایک طرح سے اپنے وقار کا سوال بنا لیا ہے۔ چنانچہ اس کے لیے جس طرح کا بھی بنیادی ڈھانچہ درکار ہے، سرکاری پرائمری و مڈل اسکولوں میں جس طرح کی بھی نئی اور معیاری سہولتیں اس قانون کے تحت دینا ہوں گی، جہاں جہاں جتنے بھی نئے اسکول کھولنے ہوں گے اور ان کے لیے جس قدر بھی اساتذہ درکار ہوں گے، سب کا انتظام کرنے کے لیے حکومت نے اپنے خزانوں کا منھ کھول دیا ہے۔ مرکزی وزیر برائے فروغ انسانی وسائل جناب کپل سبل تو یہ خواہش بھی رکھتے ہیں کہ اس قانون کو پوری دنیا کے لیے ایک رول ماڈل تصور کرتے ہوئے عمل میں لایا جائے (ملاحظہ ہو زیرِ نظر شمارے کی کور اسٹوری)۔ اس کے علاوہ انھوں نے یہ بھی واضح کیا ہے کہ یہ قانون کسی اقلیتی ادارے بالخصوص مسلم مدرسوں کے قطعی خلاف نہیں ہے، اور اصل قانون میں وہی ترامیم کی گئی ہیں جن کی سفارش مسلم پرسنل لا بورڈ اور دوسرے مذہبی حلقوں نے کی تھی۔

دو اور اہم واقعات بھی ان ہی دنوں میں محض سات روز کے فرق سے رونما ہوئے ہیں جن کا تعلیم سے سیدھا تو نہیں لیکن بالواسطہ تعلق ضرور ہے۔ پہلا واقعہ ہے ملک کے پہلے مین بر اعظمی میزائل یا آئی سی بی ایم (انٹر کانٹی نینٹل بیلسٹک میزائل) کا کامیاب تجربہ اور دوسرا ہے قطبی مصنوعی سیارہ خلا میں لے جانے والی گاڑی پی ایس ایل وی (پولر سیٹلائٹ لانچ وہیکل) کے ذریعہ ملک کے سب سے بڑے مصنوعی سیارے کا زمینی مدار میں قیام، جس کی بدولت ملک کے دفاعی نظام اور دوسرے ادارے ہندوستان اور آس پاس کے ملکوں کی زمین کے چپے چپے پر نظر رکھ سکیں گے۔ ان دونوں کامیابیوں کا براہ راست تعلق ملکی دفاع اور تحفظ کے بندوبست سے ہے اور ان سے ملک نے یہ بھی اشارہ دے دیا ہے کہ وہ ایک بڑی عالمی طاقت بننے کی راہ پر گامزن ہو چکا ہے۔ لیکن یہ کامیابیاں تعلیم سے بھی جڑی ہوئی ہیں۔ خاص طور سے اعلیٰ اور معیاری تعلیم سے۔ وہ ذہین اعلیٰ دماغ سائنس داں اور ٹیکنیشین جنھوں نے ملک و قوم کو ان کامیابیوں سے سربلند کیا ہے، ہوا میں پیدا نہیں ہوئے۔ وہ بھی ہمارے تعلیمی نظام سے آئے ہیں، جس میں حقِ تعلیم ایکٹ کی مدد سے مستقبل میں اور بھی نکھار آئے گا۔ کامیابیاں کسی بھی طرح کی ہوں وہ کسی ایک فرد، حلقے یا سماج پر اثر انداز نہیں ہوتیں، ان کی باہمی قوت سے ایک مشترکہ توانائی جنم لیتی ہے جو پوری قوم کا حصہ بن جاتی ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ دوسروں سے پچھڑ جانے والی اقلیتیں، جو اسی قوم کا حصہ ہیں، اور ہماری اردو برادری جس کی لسانی شناخت نے ہماری بخشیری وحدت کو جلا بخشی ہے، تعلیم کے حق سے پھوٹنے والے سرچشموں سے خود کو کس طرح فیض یاب کرتی ہیں!



ڈاکٹر محمد ہاشم قنوانی
سابق ممبر راجیہ سبھا، نئی دہلی

اردو دنیا کا مئی 2012 کا شمارہ حسب معمول طباعت و کتابت کے حسن کا مرقع ہے اور معنویت بھی۔ تحقیق کے معیار سے محققانہ اور معلوماتی مضامین کا خزانہ۔ اس کے مندرجہ ذیل مضامین بہت زیادہ پسند آئے۔ چودھری محمد علی کے خطوط، ٹوک پر خار پر جینے کی تمنا، میری زندگی اور اردو، مفتی صدرالدین آزردہ، راجندر منچندا بانی، اردو صحافت کی عظیم شخصیت، عابد علی خان، کاش کلیات چودھری محمد علی کے مرتب مضمون چودھری محمد علی کے خطوط میں چودھری اس اہم ترین کیفیت جس کا اظہار ان خطوط میں ملتا ہے یعنی خشیت الٰہی کو نظر انداز نہ کرتے۔ مضمون بعنوان سعادت حسن منٹو میں مضمون نگار کے اس فقرے سے اتفاق نہیں کیا جاسکتا کہ منٹو دنیا کے عظیم افسانہ نگار تھے یا یہ کہ صحت زبان کے معیار سے ان کی تحریریں معیاری نہیں۔ اعلیٰ پائے کے تحقیقی اور معلوماتی مضامین سے مجرپور 'اردو دنیا' اپریل 2012 کا شمارہ باصرہ نواز ہوا۔ سب سے زیادہ جناب اطہر مسعود صاحب کا مضمون بعنوان 'اردو میں نصابی کتابیں اور مولوی اسمٰعیل کی معلوماتی کتابوں سے فیض یاب ہوا اسی طرح تنقیدی مضمون بعنوان 'تفحیک روزگار، کلاسیکی کے تحت 'جگر مرادآبادی' اور شہریتن کے تحت 'خیرآباد'، 'اردو میں آپ بیتی' مضمون 'سرراضا علی کی آپ بیتی اعمال نامہ' کا کوئی نہیں اس طرح مکتوباتی ادب میں نہ تو مکاتیب شبلی کا ذکر ہے نہ مکاتیب سلیمان ندوی، مرتبہ مولوی عبدالماجد دریابادی اور نہ مکتوبات ماجدی جس کی چھ جلدیں شائع ہوچکی ہیں۔

بھگوان داس اعجاز

'اردو دنیا' کا تازہ شمارہ مئی 2012 موصول ہوا، مشکور ہوں۔ ورق گردانی کی تو بھی خوش ہوا۔ غضنفر اقبال کا انٹرویو پڑھ کر معلومات میں اضافہ ہوا۔ ان کے والد بزرگوار حضرت حیرت بدایونی اور برادران افضل محمد، احمد جلیس، اردو شعرا سے گہرا لگاؤ رہا ہے۔ ان کی اردو خدمات کو آج بھی یاد کیا جاتا ہے۔ جیلانی بانو کا انٹرویو پڑھ کر کچھ اور پڑھنے کی تمنا جاگی۔ راجندر منچندا بانی میرے ہم عمر اور ہم زبان تھے۔ ان کی باتیں اور یادیں ہمیشہ یاد رہیں گی۔ وہ بہت جلد ہم سے جدا ہوگئے۔ محمد ثناء اللہ ڈار میراجی اور انتخاب کلام میراجی نے متاثر کیا۔ سعادت حسن منٹو فن اور شخصیت پڑھ رہا ہوں اور بھی بہت کچھ ہے جو پڑھنے کو باقی ہے۔

حماد انجم ایٹوو کیٹ
کرن جوت، نوہرن بازار، سنت کبیر نگر

'اردو دنیا' ایک بین الاقوامی جریدہ ہے، اس میں کوئی شک نہیں۔ اس کی بروقت اشاعت قومی کونسل کی فعالیت کی روشن دلیل ہے۔ اردو کے تعلق سے قومی اردو کونسل



کا رول اپنی مثال آپ ہے۔ مئی کا شمارہ پیش نظر ہے۔ اردو کے چمکتے ستاروں سے مجلہ روشن ہے۔ بانی اور میراجی پہ اچھا مواد شامل اشاعت کیا گیا ہے۔ ساجدہ زیدی، مفتی صدرالدین آزردہ، حفیظ جونپوری، سعادت حسن منٹو اور اردو صحافت کی عظیم شخصیت عابد علی خان، جیلانی بانو کا انٹرویو ہنوز میرے مطالعے میں ہیں۔ رسالہ پڑھتے پڑھتے ختم بھی نہیں ہوتا ہے کہ دوسرے رسالے کے آنے کا وقت ہوجاتا ہے اور پھر پیچھے رسالہ دستیاب ہوگیا۔ اتنی محنت اور محبت سے قومی کونسل اپنا کام انجام دے رہی ہے؟ حیرت ہوتی ہے۔ کپل سبل صاحب کی مہربانیاں روز روشن کی طرح عیاں ہیں۔ کپل سبل اور جسٹس کاٹجو آج کے دور میں محسنین اردو ثابت ہوئے ہیں۔ اردو کے قالب میں جدید ٹکنالوجی کی شمولیت بہت مفید ہے۔ اردو کے تعلق سے اردو دنیا کا خبرنامہ بھی بڑا اہم ہوتا ہے۔ آپ کی ادارت میں جریدہ 'اردو دنیا' اور ترقی کرے یہی آرزو ہے۔

ایس ایچ رضوی
سی ایم پی ڈگری کالج، الہ آباد یونیورسٹی، الہ آباد

ماہنامہ 'اردو دنیا' کا شمارہ بابت ماہ اپریل 2012 زیر مطالعہ ہے۔ کیا کہنا۔ رسالہ صورت و سیرت دونوں میں اپنی بلندیوں کو چھو رہا ہے۔ اس کے تمام مشمولات لائق صد ستائش ہیں وہ چاہے تفحیک روزگار: ایک جائزہ ہو، امیر خسرو ایک سامی ہاتھی یا تجگر مرادآبادی، گوشۂ کلاسیکی ادب خاصے کی چیز ہے۔ 'گوشۂ احتشام حسین' میں شہزاد انجم کا مقالہ زبان و بیان کے اعتبار سے صدآفریں کہے جانے کا مستحق ہے مگر انجم صاحب نے احتشام حسین کے نویں تنقیدی مجموعہ کو اپنے شمار میں نہیں لیا۔ اُن کے مطابق احتشام حسین کے تنقیدی مضامین کے آٹھ مجموعے ہی ہیں۔ جب کہ یہ نواں مجموعہ 'جدید ادب' منظر اور پس منظر اتر پردیش اردو اکادمی سے 1978 میں شائع ہوا جس پر پروفیسر محمد حسن کا بصیرت افروز پیش لفظ بھی ہے۔ اسی طرح احتشام حسین کی تاریخ پیدائش کے ضمن میں ڈاکٹر شکیل نوازش رضا کا یہ دعویٰ کہ "میری تحقیق کے مطابق احتشام حسین کی درست تاریخ پیدائش 21 اپریل 1911 ہے" کو صرف نظر کیا۔ شکیل نوازش رضا نے احتشام حسین پر آج سے بیس سال قبل الہ آباد یونیورسٹی سے ڈی فل کی ڈگری لی ہے اور مقالہ جس کی ضخامت چھ سو صفحات پر محیط ہے۔ سید احتشام حسین: فکر و فن کے عنوان سے 2009 میں کراچی سے شائع ہوچکا ہے۔ دیگر مشمولات بلاشبہ دل و دماغ کے دریچوں کو وا کرتے ہیں جس کے لیے آپ مبارک باد کے مستحق ہیں۔

محمد احسان الحق (علیگ)
ہزاری باغ، پٹنہ

'اردو دنیا' ماہ اپریل 2012 کے تمام تر مضامین

بے حد دلچسپ اور معلوماتی ہیں بالخصوص پروفیسر زبیدہ حبیب کا مضمون 'اسکولوں میں اردو کی تدریس اور تعین قدر' اساتذہ کے لیے سی بی ایس سی کے اردو نصاب سے متعلق ایک گراں قدر مضمون ہے۔ ادارے کی جانب سے شائع مضمون اقلیتوں کی تعلیمی ترقی کے مشورے بھی خاصا اہمیت کا حامل ہے جسے پڑھ کر اقلیتوں کے مسائل اور ان کے حل سے متعلق معلومات حاصل ہوئی۔ کتابوں کی دنیا، عالمی اردو نامہ اور خبرنامہ پڑھ کر طبیعت خوش ہوگئی۔ خبرنامے میں مختلف النوع قسم کی علمی و ادبی خبریں شائع ہوئی ہیں۔ خاص طور پر پروفیسر وہاب اشرفی کے اعزاز سے متعلق خبر پڑھ کر بے حد خوشی ہوئی۔ یقیناً قومی کونسل برائے فروغ اردو کے ذریعے اردو کی بڑی خدمت ہو رہی ہے۔ خدا اس سے جڑے تمام لوگوں کو کامیابیوں سے ہم کنار کرے۔

عذرا ناصر

پرنسپل الفلاح شمیم آزاد جونیئر کالج، دریاپور

ماہ اپریل کا شمارہ واقعی اردو دنیا کے لیے وقف لگا۔ اردو میں آپ بیتی، اردو کا مکتوباتی ادب، اردو میں نصابی کتابیں اور مولوی اسماعیل، اردو میں مارکسی ادبی تنقید سید احتشام حسین، کیرالا کی واحد ناول نگار زلیخا حسین، کلاسیکی ادب میں جگر مرادآبادی اور ہماری مطبوعات میں لاثانی امیر خسرو، کیوئی ریڈیو اور اردو وغیرہ۔ اسکولوں میں اردو تدریس کی مصنفہ زبیدہ حبیب نے مضمون کی غرض وغایت پر خوب روشنی ڈالی۔ لیکن CBSE کے بیانیہ اشارے کو اردو میں تیار نہ کرنا اس اسکیم کے نفاذ کو ناکارہ کردے گا۔ اس کے علاوہ نئے تصور اور اصطلاحات کو عام فہم اور آسان کردیا جاتا ہے تو بہتر نتائج کی امید کی جاسکتی تھی۔ ہر جانچ کا سرسری ذکر کرنے کی بجائے مضمون میں چند اور امور کی وضاحت کی جاتی تو بہت بہتر ہوتا۔ ساتھ ہی تعین قدر کا یہ طریقہ کتنا سودمند ہوگا، نتائج کے لیے کتنی مدت درکار ہوگی، طلبا کو کیسے لائن پر رکھا جائے گا، کیسے ان تلوں سے تیل نکلے گا تشفی بخش جانچ میں گریڈنگ طلبا کے Competition کے جذبے ختم کردے گی ایسے کئی مسائل ہیں جن میں وضاحت اور رہنمائی کی ضرورت ہے۔ کیمونٹی ریڈیو کا قیام ادارے میں کس طرح کیا جائے اس کی مکمل معلومات ڈاکٹر محمد شکیل اختر صاحب سے مل جائے تو ممنون رہوں گی۔ مصنوعی رنگ کی پول کھول کر مناظر حسین صاحب کا اقدام قابل تعریف ہے۔ خورشید اقبال صاحب کا اپنا بلاگ کیسے بنائیں کارآمد ثابت ہوا ہے تصاویر تمام ہی زبردست ہیں آپ واقعی اردو دنیا کے لیے بہترین کام کر رہے ہیں خدا آپ کو استقامت عطا فرمائے، آمین!

ڈاکٹر حیات افتخار

ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبۂ اردو، قائد ملت کالج، چنئی

یہ جان کر بے حد مسرت ہوئی کہ خواجہ اکرام صاحب کا تقرر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر کی حیثیت سے عمل میں آیا ہے۔ امید ہے کہ آپ کی قیادت میں اردو زبان کا یہ مقتدرہ ادارہ مزید بلندیوں کو چھونے میں کامیاب ہوگا۔ ماہنامہ 'اردو دنیا' کا شمارہ بابت اپریل 2012 نظر نواز ہوا۔ خصوصی طور پر جو مضامین پسند آئے ان میں گوشۂ احتشام حسین میں شامل تمام مضامین کے علاوہ کمال احمد صدیقی سے انٹرویو تھا جس میں آپ نے ساختیات کو بے معنی موضوع سے تعبیر کیا تھا لیکن اس کی وضاحت نہیں کی تھی۔ ہوسکتا ہے آپ کے پاس اس کا تفصیلی جواب ہو۔ اگر ایسا ہے تو قارئین کی یہ خواہش ہوگی کہ آپ اس پر مزید روشنی ڈالیں تاکہ ان کے ادبی شعور میں اضافہ ہو۔



محمد الطاف

نظامت فاصلاتی تعلیم، کشمیر یونی ورسٹی، سری نگر

ماہنامہ 'اردو دنیا' کا اپریل کا شمارہ نظر نواز ہوا۔ میں گزشتہ دس سالوں سے متواتر اس رسالے کا نہایت ہی باریک بینی سے مطالعہ کرتا ہوں زیر نظر شمارے کے دوسرے مشمولات کے علاوہ معروف عرض داں اور ممتاز شاعر جناب کمال احمد صدیقی اور فاروق ارگلی کی گفتگو لائق تحسین ہے۔ اس گفتگو سے کمال احمد صدیقی کی ادب اور ادبی مسائل کے تئیں غیر شعوری وابستگی کا پتہ چلتا ہے۔ میں اس گفتگو کے عنوان ''ساختیات بے معنی موضوع اور تضیع اوقات ہے'' سے بہت مایوس ہوا کیونکہ اس گفتگو میں کہیں بھی اس لکھتے پر کمال صاحب کی وضاحت نہیں ملتی ہے۔ کمال احمد صدیقی اُردو کے قابل قدر اور ذی احترام شاعر ہیں۔ اس طرح شاعری اور عروضی مباحث میں ان کی رائے کو حرف آخر مانا جاسکتا ہے لیکن ساختیات پر ان کی یہ غیر ذمے دارانہ رائے شاعری کے معاملے میں بھی ان کے عظیم مرتبے کو مشکوک و مشتبہ ٹھہرا سکتی ہے۔

آج ہی روزنامہ 'ہمارا سماج' میں یہ خبر دیکھنے کو ملی کہ آپ کا تقرر بہ حیثیت ڈائرکٹر قومی اردو کونسل میں ہوا ہے، یہ خبر میرے لیے ایک خوش آئند بات ہے کیونکہ میں کئی دنوں سے اس فکر میں تھا کہ کونسل کے لیے کسی ایسے آدمی کو منتخب کیا جانا چاہیے جو اردو کا ہو اور معلوماتی تکنالوجی کی روز افزوں ترقی سے ہم آہنگ ہو، تاکہ اردو کونسل اس سمت میں نمایاں پیش رفت کا مظاہرہ کرسکے جو وقت کی اشد ضرورت بھی ہے اور حالات کا تقاضا بھی۔ اس ضمن میں پاکستان کی طرز پر تحقیقی مرکز برائے اردو پروسیسنگ (CRULP) قائم کرنے کی اشد ضرورت ہے جس کا اکیسویں صدی کا اردو طالب علم متقاضی ہے۔ مجھے قوی امید ہے کہ آپ کی زیر نگرانی اردو کونسل مکمل اہداف تک رسائی حاصل کرے گی۔

احمد عثمانی

14 علیگ اپارٹمنٹ، شمشاد مارکٹ، علی گڑھ

'اردو دنیا' حسین و خوش رنگ گلدستہ معیاری مضامین کا خزینہ انتہائی پابندی وقت کے ساتھ مہینہ کے ابتدائی دنوں میں ہی مل جایا کرتا ہے۔ گھر کے سبھی افراد اس کی دیدہ زیبی اور مضامین کے معیار کے مداح ہیں۔ اپریل کے شمارے کے تمام مضامین خراج تحسین کے مستحق ہیں۔ ڈاکٹر شبیر الحق صاحب کا مضمون 'امیر خسرو ایک سماجی باغی' ہماری مطبوعات کے سلسلے میں پہلی بار پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ مضمون دلچسپ اور معلوماتی ہے۔

فخرالدین عارفی

محمد پور، شاہ گنج، پٹنہ 800006

اپریل 2012 کا شمارہ پیش نظر ہے، ہماری بات کے عنوان کے تحت اداریہ ایک بہت اہم موضوع کا احاطہ کرتا ہے۔ فاروق ارگلی کا کمال احمد صدیقی سے لیا گیا انٹرویو کافی دلچسپ اور معلوماتی ہے۔ مفتی تبسم پر عبدالقادر شمیل کا مضمون بھی اچھا ہے۔ جگر مرادآبادی پر عبدالرشید نے یقیناً ایک اچھا مضمون تحریر کیا ہے۔ جگر کے کلام کا انتخاب بھی مناسب ہے۔ شبیر الحق صاحب نے بھی اپنے مضمون میں امیر خسرو کی شخصیت کے ایک اہم پہلو کی جانب اشارہ کیا ہے۔ 'اردو دنیا' کے کسی قمری شمارے میں دیہم بریلوی صاحب کا انٹرویو شائع ہونا چاہیے۔ اردو زبان کے فروغ میں ان کی خدمات بہت اہم ہیں۔ ان کا کلام ان کے دل کی آواز ہوتا ہے۔

آپ کی رائے

ایم راگھو راؤ

ساؤتھ سول لائنس، چھندواڑا480001(مدھیہ پردیش)

'اردو دنیا' کا اپریل 2012 کا شمارہ موصول ہوا۔ کمال احمد صدیقی کا انٹرویو دلچسپ لگا۔ 'شہر آشوب' کا مضمون بھی بہتر ہے۔ اردو شاعری کے ذخیرۂ الفاظ میں اضافہ ہوا۔ اس میں ایسے الفاظ نظم ہو گئے جو کسی دوسری صنف میں بہت کم ہیں، شہر آشوب سے انسان کے دکھ درد برداشت کرنے کی بے پناہ صلاحیت کا عرفان ہوتا ہے۔ احتشام حسین نے اردو تنقید کو ایک پروقار اسلوب عطا کیا۔ ان کے مضامین قاری کی توجہ پوری طرح اپنی طرف کھینچ لیتے ہیں۔ گلشن خطائی کا شمری کی زلیخا حسین سے کی گئی گفتگو بہت پسند آئی، عورت ہی زندگی کا محور ہے، اس کے اطراف زندگی حرکت کرتی ہے۔

ڈاکٹر محمد ناظم علی

پرنسپل گورنمنٹ ڈگری کالج، موڈتاڑ، ضلع نظام آباد، ریاست آندھرا پردیش

اپریل 2012 کا 'اردو دنیا' کا شمارہ وقت پر موصول ہوا۔ سرورق پر اقلیتوں کی تعلیمی ترقی کی میٹنگ کے مناظر و تصویریں پیش کی گئیں۔ اقلیتوں کے تعلیمی اور معاشی مسائل اور سماجی پسماندگی اظہر من الشمس ہے۔ ان کے حل کے لیے اس طرح کی میٹنگیں ثمر آور و سود مند ثابت ہو سکتی ہیں بہ شرطیکہ کھلے دل سے بحث و مباحثہ ہوں۔ ہندوستانی جمہوریت تب ہی کامیاب ہوگی جب اکثریت کے ساتھ اقلیت بھی شانہ بہ شانہ ترقی کرے۔ ہماری بات اداریہ میں مدیر نے اہم نکتے کی طرف اشارہ کیا کہ اردو بک کو Digitalize کیا جائے گا۔ یہ خوش آئند عمل ہے کہ اردو کو ٹکنالوجی سے مربوط کیا جائے گا۔ لاغر ہوں میں اتنا کہ چیونٹی نہ نگل جائے۔ بلقیس بیگم نے جامع اور جدید مضمون لکھا ہے کہ اردو میں آپ بیتی کی روایت، آدم و حوا کی تخلیق سے ہی آپ بیتی بغیر لکھے ہوئے ساتھ ساتھ چلتی ہے۔ اردو کا سخنوانی ادب بہت خوب ہے۔ غالب سے پہلے فارسی میں خطوط لکھے گئے اردو میں بھی بے پایاں بیش بہا مکتوباتی ادب موجود ہے غالب کے خطوط فن کاری کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔ اسکولوں میں اردو کی تدریس اور تعین قدر کا تجزیاتی مضمون ہے۔ سید احتشام حسین مارکسی نقاد ہیں۔ انھوں نے اردو ادب و تنقید کو مالا مال کیا ان کے ادبی نظریات سے لوگ استفادہ کرتے رہیں گے اور تنقید کی آبیاری اور فروغ و نشو و نما میں احتشام حسین ایک ستون کے مانند ہے۔ دیگر مشمولات بھی فکر انگیز اور معلومات سے پُر ہیں۔

مناظر حسن شامین

مڈل اسکول کشمی پور، چاکند، گیا

'اردو دنیا' مارچ 2012 کا شمارہ مجھے گیا میں دستیاب نہیں ہو سکا تھا لہٰذا پٹنہ سے منگوانا پڑا۔ واقعی یہ جریدہ اب بین الاقوامی معیار کا ہو گیا ہے اور اس کا انتظار شدت سے رہتا ہے۔ آپ کی ذہانت اور کاوشوں کا اس میں بڑا دخل ہے۔ کونسل کی خدمات کا اعتراف اب وہ اشخاص بھی کرنے لگے ہیں جن کی زبانوں سے صرف مخالفانہ جملے ہی ادا ہوتے تھے۔ اللہ اس دل کش رسالے کو نظر بد سے بچائے اور عمر جاودانی عطا فرمائے۔

جمال ناصر

معاون معلم گورنمنٹ اردو مدرسہ ضمیات نمبر 6 پلس ہیڈ کوارٹرس بالگام (کرناٹک)

اپنے ایک عزیز کے ذریعے آپ کا موقر ماہنامہ 'اردو دنیا' فروری 2012 والا شمارہ ضیائے چشم ہوا۔ بہت خوشی ہوئی پہلی بار ایسا محسوس ہوا کہ اردو ایک تاریخ ساز مکمل شمارہ میں نے پڑھ لیا ہے۔ میرا نظریہ کہتا ہے کہ اپنے آپ میں ایک مکمل شمارہ ہے جو ناظرین کے تمام تقاضوں کو پورا کرتا ہے نئے دور میں کمپیوٹر کے استعمال سے اُردو جاننے والوں کو روشناس کروا کر زمانے کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلنے پر آمادہ کرنے کے لیے معاون و مددگار ہے۔ ادبی تخلیقات، روزگار، ایک سفر کتابوں کا اور بچوں کی دنیا اس رسالے کی شان ہیں۔ بہت جلد میں بھی آپ کے اس رسالے کا دائمی خریدار بننا چاہوں گا۔ انشاء اللہ! اس سلسلے میں آپ کی ویب سائٹ کا استعمال کرتے ہوئے مدد حاصل کروں گا۔ یہ کونسل اردو کے فروغ کے لیے کوشاں ہے اس بات کا بھی بخوبی اندازہ ہوا۔ فیس بک پر اپنے آپ کو ظاہر کرنا، دوستوں تک اپنی تخلیقات کو پہنچانا اس ضمن میں جناب خورشید اقبال صاحب کا مضمون بہت ہی موزوں اور تفصیلی رہا۔

ڈاکٹر عبدالودود قاسمی

رام نندن مشر گرلس انٹر اسکول، لہریا سرائے، دربھنگہ

'اردو دنیا' باصرہ نواز ہوا۔ دیدہ زیب اور پرکشش، نگاہیں چکا چوند ہو گئیں۔ پہلی نظر میں اول تا آخر ورق گردانی کرتا چلا گیا اور دل سے ماشاءاللہ کی صدا بے اختیار نکلتی گئی، رسالہ صوری و معنوی دونوں اعتبار سے متزین و منقش ہے۔ یہ اردو قبیلے کے لیے افتخار کی بات ہے کہ اردو میں یہ ایک بین الاقوامی جریدہ 'اردو دنیا' کی شکل میں نہایت ہی آب و تاب کے ساتھ منظر عام پر آ رہا ہے۔ قومی اردو کونسل کے جملہ ذمہ داران قابل مبارکباد ہیں۔ ان کے علاوہ بچوں کی دنیا کو آپ نے مزید رنگین اور معلومات سے پر بنا دیا ہے۔

محمد رحمن پاشاہ

پاکارام، مشیر آباد حیدرآباد (اے پی)

ماہنامہ 'اردو دنیا' عالمی جریدہ نظر نواز ہوا۔ یہ ایک طرف عالمی میگزین ہے تو دوسری طرف یہ پوری ہندوستانی قوم کی نمائندہ ہے۔ یہ جریدہ پورے مہینے کا ایک دستاویز ہوتا ہے۔ مزید برآں یہ کہ اس میں اہم، اہم شخصیات کے انٹرویو میں شامل ہوتے ہیں۔ ہماری بات، آپ کی بات، جدید تعلیم، کور اسٹوری، کلاسیکی ادب نظم و نثر، عصری منظر نامہ، زبان و تعلیم، سائنس، کمپیوٹر تربیت اور بچوں کی دنیا اس کے علاوہ خراج عقیدت، کتابوں کی دنیا، عالمی اردو نامہ، اردو دنیا ٹی وی اور تبصرہ نامہ بھی شامل اشاعت ہے۔ ایک گزارش یہ ہے کہ کمپیوٹر تربیت کے تحت جو مضامین شائع کر رہے ہیں، اسے ایک کتابی شکل دی جائے۔

ڈاکٹر محمد منصور عالم

یونیورسٹی پروفیسر و صدر شعبۂ اردو، مگدھ یونیورسٹی، بودھ گیا

قومی اردو کونسل، نئی دلی کے ڈائرکٹر کی حیثیت سے اپنے تقرر پر میری مبارکباد قبول کیجیے۔ یقین ہے کہ قومی اردو کونسل آپ کی کاوشوں اور کارکنان کونسل کے مخلصانہ تعاون سے مزید فعال ہو کر نئی کارگزاریاں پیش کرے گی۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اردو زبان اور ہندوستانی تہذیب و قومیت کے فروغ کے لیے عزم و عمل عطا کرے، آمین!

غلام اختر

سکریٹری، مدینہ ویلفیئر سوسائٹی، ویشالی، بہار

ڈاکٹر خواجہ اکرام ہندوستان کی عظیم یونیورسٹی جواہر لال نہرو یونیورسٹی، نئی دلی کے قابل استاد ہیں جنھوں نے مختصر سے وقت میں اپنی تدریسی مصروفیات کے باوجود بہت سارے علمی و ادبی کارنامے انجام دیے ہیں۔ ابھی حال ہی میں ان کی قابلیت و لیاقت کو دیکھتے ہوئے ان کو قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دلی کا ڈائرکٹر بنایا گیا۔ اس پر ہم جملہ ارکان مدینہ ویلفیئر سوسائٹی ویشالی بہار انھیں دلی مبارکباد پیش کرتے ہیں اور یہ کونسل کے لیے بھی قابل مبارکباد ہے کہ اسے اتنا قابل پڑھا لکھا، متحرک و فعال اور دانشور ڈائرکٹر نصیب ہوا۔ ان کے لیے ہماری نیک خواہشات ان کے ساتھ ہیں۔

ندیم صدیقی

کبھی کبھی نثر، نظم سے زیادہ اہم لگتی ہے: ندا فاضلی

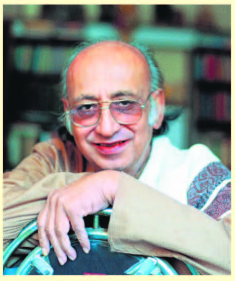

ندا فاضلی صحیح معنوں میں منفرد لب و لہجے کے شاعرہیں جنھوں نے ترقی پسندی اور جد یدیت دونوں فکری و ذھنی رویوں سے جداپنی راہ نکالی ھے۔ ان ادیبوں‌میں ندا فاضلی کا اھم مقام ھے جنھیں مرحوم شجاع خاور ادب کی تیسری دنیا کہا کرتے تھے۔ ترقی پسند شعرا نے جس کامیابی سے اپنی شاعری کا رشتہ عام انسان سے قائم کیا اتنی کامیابی ، چند استثنا ؤں کے قطع نظر ، انھیں اردو کے اعلیٰ تر ادبی معیار اپنا رشتہ استوار کرنے میں حاصل نہ ھوسکی۔ اسی طرح جدیدیت سے وابستہ ادیبوں نے انسانی حسیات کی پیچیدگیوں کو سمجھنے اور ادب کا حصہ بنانے میں قابل قد ر کردار تو ضرورادا کیا لیکن ادب کا رشتہ عوام سے توڑنے کے بھی قصوروار بن گئے۔ ندا فا ضلی کا تخلیق کردہ ادب خواہ وہ شعری ھو یا نثری، ادب کے خاص قاری کو بھی متوجہ کرتا ھے اور عام قاری بھی اس کا اثر اور لطف لیتا ھے۔ اپنے نثری شاھکاروں، 'دیواروں کے بیچ' اور 'دیواروں کے باھر' میں جو کہ ان کی خود نوشت سوانح ھے ، انھوں نے نثر کا نیا اسلوب اختیار کیا ھے جو ایک بڑی بات اس لیے ھے کہ نثر میں تجربے کی گنجائش سب سے کم ھوتی ھے۔ ندا نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ فلم نگری ممبئی میں گزارا ھے اور فلمی نغمہ نگاری میں خوب اپنے جوھر دکھائے میں پھر بھی وہ اس دنیا میں زیادہ دور تک نہیں گئے۔ انھوں نے ادب سے اپنے رشتے کو زیادہ اھمیت دی ھے، جسے اردو کے کئی ادیب فلموں میں جانے کے بعد زیادہ دور تک قائم نہ رکھ پائے۔ معروف شاعر اورادبی صحافی ندیم صدیقی نے 'اردو دنیا' کے لیے ندا‌صاحب سے جو خاص انٹرویولیا اس میں ادب اور ادبی رجحانات کے بارے میں انھوں بہت کچھ کھل کر کہا ھے۔اس انٹرویو کے اھم اقتباس ملاحظہ فرمائیں۔ ادارہ

ندیم صدیقی: آپ بیک وقت نثر اور نظم دونوں میں لکھ رہے ہیں۔ اپنے خیالات واحساسات کے اظہار کے لیے ان میں سے کس میں آسانی یا سہولت محسوس کرتے ہیں؟

ندا فاضلی: آسانی یا سہولت محسوس تو کہیں اور کبھی نہیں ہوتی۔فانی نے کیا خوب کہا ہے:

سکوں محال ہے دُنیا کے کارخانے میں
نہ آشیانے کے باہر نہ آشیانے میں

میرے لیے نثر بھی نظم ہی کی طرح اہم ہے۔ بلکہ کبھی کبھی تو (نثر) زیادہ اہم محسوس ہوتی ہے۔نظم میں قافیہ، ردیف، وزن کی معاونت، الفاظ میں غنائیت اور معنوی ذہانت پیدا کر دیتی ہے۔ نثر میں یہ خصوصیات جگانے کے لیے جی ہوئی زندگی کی روشنی ہی میں الفاظ کی ٹوک پلک سنوارنا پڑتی ہے۔آج کل حسن نظامی، سعادت حسن منٹو، شفیق خواجہ، مشتاق احمد یوسفی، اسلم فرخی وغیرہ جیسی نثر لکھنے والے دور دور تک نظر نہیں آتے۔ سلیم احمد کی نثر اپنے آپ کو پڑھوانے کا حسن بھی رکھتی تھی۔

اس وصف سے مجموعی تنقیدی نثر کیوں بیزار ہے؟ اس سوال کا جواب آج کے لکھنے والوں کی نثر کا نمائشی کردار ہے۔آج اپنے ذہن سے کم سوچا جاتا ہے۔کمپیوٹر سے زیادہ کام لیا جاتا ہے۔ میری نثر کی کاوشوں میں دیواروں کے بیچ، دیواروں کے باہر (سوانحی ناول) ملاقاتیں، چہرے اور دُنیا مرے آگے شامل ہیں۔ میرے شعری مجموعے جن کی تعداد دو درجن چھ ہے (1) لفظوں کا پل (2) مورناچ (3) آنکھ اور خواب کے درمیان (4) کھویا ہوا سا کچھ (5) شہر مرے ساتھ چل (6) زندگی کی تڑپ۔ مجھے نثر کے جملے تراشنے میں اتنی ہی محنت کرنی پڑتی ہے جتنی نظم کے مصرعوں کے دروبست میں کرنی پڑتی ہے۔ نثر ہو یا نظم دونوں میں Readability اور Oureability کو ضروری مانتا ہوں اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب زندگی کو اپنے قدموں سے ناپا جاتا ہے اور اپنی سانسوں سے جانا جاتا ہے۔

وہ صوفی کا قول ہو یا پنڈت کا گیان
جتنی بیتے آپ پر اتنا ہی سچ مان

ن س: آپ کی تحریروں میں ہندی کے اثرات نمایاں ہیں جب کہ آپ کو اُردو کا ادیب وشاعر سمجھا جاتا ہے۔کیا ہندی کے اثرات شعوری طور پر ہیں یا لاشعوری طور پر در آتے ہیں؟

ن ف: ہندی اور اُردو دو زبانیں، ہیں نہیں، سیاست نے انھیں ایک سے دو بنا دیا ہے۔ یوں تو ہر زبان کے کئی چہرے ہوتے ہیں لیکن تین چہرے زیادہ نمایاں نظر آتے ہیں، پنڈت، مولوی اور عام آدمی ان تینوں کے اظہاری پیرائے ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں مثلاً پنڈت کہتا ہے۔ میں اپنے نواس کے لیے پرستھان کر رہا ہوں اسی کو مولوی یوں کہے گا میں اپنی رہائش گاہ کے لیے رخصت ہو رہا ہوں لیکن عام آدمی عوامی زبان میں اسے یوں کہے گا میں اپنے گھر جا رہا ہوں۔ عام آدمی کی زبان میں کوئی فرق نہیں ہے اسے دیوناگری میں لکھا جائے تو

اسے ہندی بولا جائے گا۔ اگر فارسی رسم الخط میں تحریر کیا جائے گا تو اسی کو اردو کے نام سے پکارا جائے گا۔ آپ نے اپنے سوال میں جسے ہندی کہا ہے یہ وہی زبان ہے جس کا نمونہ محمد علی قطب شاہ کے یہاں یوں ہے:

پیا باج پیالہ پیا جائے نا
پیاباج یک تل جیا جائے نا

اوران سے پہلے رحیم کے یہاں اس طرح ہے:

رحیمن دھاگا پریم کا مت توڑو چٹکائے
توڑے سے پھر نا جڑے جڑے گانٹھ پر جائے

اوران سے بھی پہلے خسرو کے یہاں اس کا روپ ہے:

خسرو رین سہاگ کی جاگی پی کے سنگ
تن میرا من پیو کا دونوں بھئے ایک رنگ

انگریزی میں چسر کی زبان اور آذن اور اسپنڈر کی زبان میں جو فرق ہے وہی فرق محمد قلی قطب شاہ، رحیم، خسرو اور آج کے ابن انشا، ناصر کاظمی اور جمیل الدین عالی کی زبان میں ہے۔ ہمارے شعری، نثری ادب پر مولوی اور پنڈتوں کے Mindset کا غلبہ ہے۔ شاید اسی لیے اس میں عام آدمی کی لسانی ثقافت کی گنجائشیں کم ہی نظر آتی ہیں۔ میرے خیال میں فارسی، عربی، ترکی وغیرہ کے ساتھ علاقائی بولیاں بھی اردو کی تعمیر وتشکیل میں اسی طرح معاون رہی ہیں جس طرح ہندی میں رہی ہیں۔ دونوں کا عوامی چہرہ ایک ہی ہے۔ اس چہرے کو آرزو لکھنوی نے 'سریلی بانسری' کے ذریعے زیادہ روشن کیا تھا۔

ن ص: اُردو میں نئی نسل کے لکھنے والوں کے ہاں ادب کے تئیں وہی انہماک آپ محسوس کرتے ہیں جو انہماک اور دلچسپی آپ کے ہاں اور آپ کے ہم عصروں میں پائی جاتی تھی؟

ن ف: ایک نام سے پورے عہد کا محاصرہ ممکن نہیں ہے۔ ہر عہد میں غالب کے ساتھ ذوق بھی ہوتے ہیں مومن بھی ہوتے ہیں اور شیفتہ اور آزردہ بھی ہوتے ہیں۔ ایک اصطلاحی نام سے پورے عہد کی پہچان تنقیدی تساہل کی نشانی ہے۔ یہ بدعت ترقی پسندوں میں بھی تھی اور اسی کا شکار جدیدیت کی تحریک رہی ہے۔ ادب ایک ہی عہد میں کئی چہروں کا گلدان ہوتا ہے۔ اچھے پھول بھی ہوتے ہیں، بُرے پھول بھی ہوتے ہیں۔ نئی نسل میں بھی کئی لکھنے والے ہیں۔ ان میں خورشید اکبر بھی ہیں، عبدالاحد ساز بھی ہیں، عالم خورشید بھی ہیں، شکیل اعظمی بھی ہیں، فرحت احساس بھی ہیں اور انھیں کے ساتھ بہت سے دوسرے بھی ہیں۔ ہر عہد میں تخلیقی اور غیر تخلیقی کئی نام ہوتے ہیں۔ وقت کی چھلنی بھی اپنا کام کرتی رہتی ہے۔ نئی نسل میں کئی لکھنے والوں میں انہماک اور دلچسپی کی کمی نہیں ہے۔ ضرورت پہچاننے والی نظر کی ہے۔ جہاں تک اچھے اور بروں کا سوال ہے تو وہ آج بھی ہیں، کل بھی تھے اور آنے والے کل میں بھی رہیں گے۔ میں ادب کو ادب کی کسوٹی پر پرکھتا ہوں کسی تنقیدی فیشن کے تحت اے نشان زد نہیں کرتا۔ آپ نے نئی نسل کے تعلق سے میرے ہم عصروں کا بھی ذکر کیا ہے اس کے جواب میں، میں صرف اتنا کہوں گا کہ پرانے شعری وافسانوی انتخابات اٹھا کر دیکھیے اور بتایئے ان میں شامل ناموں میں کتنے آج فعال ہیں یا پڑھنے والوں کو یاد ہیں۔ نئی نسل کے لکھنے والوں کے بارے میں بھی یہی کہا جاسکتا ہے۔

ن ص: آپ اُردو کے مشاعروں میں ساری دُنیا میں جاتے رہتے ہیں کیا یہ مشاعرے اُردو تہذیب اور ادبی

ایک نام سے پورے عہد کا محاصرہ ممکن نہیں ہے۔ ہر عہدمیں غالب کے ساتھ ذوق بھی ہوتے ہیں مومن بھی ہوتے ہیں اور شیفتہ اور آزردہ بھی ہوتے ہیں۔ ایک اصطلاحی نام سے پورے عہد کی پہچان تنقیدی تساہل کی نشانی ہے۔ یہ بدعت ترقی پسندوں میں بھی تھی اور اسی کا شکار جدیدیت کی تحریک رہی ہے۔ ادب ایک ہی عہد میں کئی چہروں کا گلدان ہوتاہے اچھے پھول بھی ہوتے ہیں، بُرے پھول بھی ہوتے ہیں۔ نئی نسل میں بھی کئی لکھنے والے ہیں۔...ہر عہد میں تخلیقی اورغیر تخلیقی کئی نام ہوتے ہیں۔ وقت کی چھلنی بھی اپنا کام کرتی رہتی ہے

روایات کی بقا میں کوئی نمایاں کردار ادا کر رہے ہیں؟

ن ف: بڑھتی ہوئی آبادی کے ساتھ دوسرے فنون کی طرح شاعری بھی ادب کم اور Performence زیادہ ہوگئی ہے۔ ملک میں یا ملک سے باہر، ہر جگہ مشاعرے ایک جیسے ہوتے ہیں۔ صرف سامعین بدلتے ہیں لیکن شاعر وہی بلائے جاتے ہیں جو نئی نئی حرکتوں اور سیدھی سپاٹ شاعری پر تالیاں پٹواتے ہیں۔ پہلے مدعو شعرا میں ہندوستان اور پاکستان کا فرق تھا۔ پاکستان سے ڈھنگ کے شاعر عدو کیے جاتے تھے اور ہندوستان سے گلے باز یا کرتب باز بلائے جاتے تھے۔ کچھ دن بعد یہ فرق بھی آہستہ آہستہ غائب ہوگیا۔ اب امریکہ، انگلینڈ، کناڈا یا کسی دوسرے ملک میں جو شاعر بلائے جاتے ہیں یا سنوائے جاتے ہیں، ان میں اکثریت پیشہ ور شاعروں ہی کی ہوتی ہے۔ باہر کے ممالک میں اپنے اپنے دیسوں سے اُکھڑتے ہوئے اصحاب وطن سے اپنی دوری کو طرح طرح سے بہلاتے ہیں ان طرح طرح میں مشاعرہ بھی ہوتا ہے۔ کہیں وطن سے دوری کا احساس وہاں صرف نئے بسنے والوں تک محدود ہوتا ہے۔ ان افراد کی دوسری نسل اُردو تہذیب وثقافت سے میلوں دور ہوتی ہے۔ ایسی محفلیں نا سنجیدگی کی تسکین کی خاطر منعقد کی جاتی ہیں ان میں اچھی اور بُری شاعری کی تمیز نہیں کی جاتی۔ ان محفلوں کا اُردو سے تعلق صرف نام کی حد تک ہوتا ہے۔ مقصد ہر جگہ تفریح ہی سے ہوتا ہے۔

ن ص: اُردو کے تعلق سے اکثر یاوہ گوئی یا پیش گوئی کی باتیں ہوتی ہیں یا پھر زمینی حقائق سے الگ روشن مستقبل کی پیش گوئی کی جاتی ہے اس حوالے سے آپ کیا سوچتے ہیں؟

ن ف: اُردو بدقسمتی سے زمینی تقسیم کا حادثہ بن کر رہ گئی ہے۔ پاکستان بننے کے بعد اسے ایک مذہب سے جوڑ دیا گیا۔ بنگلہ تقسیم کے بعد یہ بے چاری سیاست کا کھلونا بن گئی ہے۔ کانگریس نے اسے اقلیت کا مسئلہ بنایا اور پاکستان میں اس کو کئی زبانوں کی رسہ کشی کا خمیازہ بھگتنا پڑ رہا ہے۔ انتخابات کے دوران اگر رہنماؤں کی بے سر پیر کی تقاریر کو اُن سنا کر کے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا اُردو کا حال روز بہ روز بد سے بدتر ہوتا جارہا ہے۔ اردو کے گھر جن میں لکھنؤ بھی ایک تاریخی مقام تھا لیکن وہاں بھی آج یہ صرف لیڈروں کے بھاشنوں کی کھوٹیوں پر ٹنگی نظر آتی ہے۔ لکھنؤ کے قبرستانوں تک سے اردو غائب ہونے لگی ہے اور یہ اچھا شگون نہیں ہے۔ دوسری تلخ حقیقت یہ ہے کہ دوسری علاقائی زبانوں کی طرح اردو کا اپنا کوئی علاقہ نہیں ہے۔ اردو کا علاقہ تھی وہی ہے جو ہندی کا علاقہ کہا جاتا ہے۔ غیر ہندی علاقوں میں اُردو کے ساتھ رویہ کچھ بہتر ہے۔ لیکن معیاری تعلیمی اداروں میں اردو کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے۔ ہم سردار جعفری، کیفی اعظمی، مجروح سلطان پوری، راجندر سنگھ بیدی وغیرہ کی اولادوں کا اردو سے دور ہونے کی شکایت کر سکتے ہیں لیکن تعلیم میں معیار کی قربانی دے کر اردو اسکولوں میں طلبا کے داخلے کی جذباتیت کا ماتم نہیں کر سکتے۔ اُردو کا تعلق روزگار سے کٹ چکا ہے۔ اسکولوں میں سہ لسانی فارمولے نے بھی اسے تباہ کرنے کی سازش کی ہے۔ اردو کا مستقبل ہندوستان میں اسی وقت محفوظ ہوگا جب اس کا رشتہ معاش سے جڑے گا اور

اس کے لیے اسے تخلیقی کردار کے بجائے تہذیبی معیار سے ہم رشتہ کرنا پڑے گا۔

ن ص: ہندوستان اور پاکستان کے شعرا و ادبا کے افکار و اظہار کے حوالے سے آپ نے کیا فرق محسوس کیا؟

ن ف: میں نے پہلے بھی کہا ہے کہ حالات ایک جیسے ہو سکتے ہیں، لیکن ادب میں تخلیقی ذہن ایک جیسے بالکل نہیں ہوتے۔ پاکستان میں نون الیم، ظفر اقبال، اُمید فاضلی، افتخار عارف وغیرہ ایک ہی ملک میں الگ الگ انداز و طرز کے شاعر ہیں۔ جون کا شعر ہے:

نظر پہ بار ہو جاتے ہیں منظر
جہاں رہیو وہاں اکثر نہ رہیو

ظفر اقبال کا شعر ہے:

کسی کو کوئی یہاں حسبِ آرزو نہ ملا
کسی کو ہم نہ ملے اور کسی کو تُو نہ ملا

امید فاضلی کا انداز ہے:

یہ سرد رات یہ آوارگی یہ نیند کا بوجھ
ہم اپنے شہر میں ہوتے تو گھر گئے ہوتے

اور افتخار عارف کا بیان یوں ہے:

مرے خدا مجھے اتنا تو معتبر کر دے
میں جس مکان میں رہتا ہوں اس کو گھر کر دے

پاکستان کی طرح ہندوستان میں بھی الگ الگ شعری جھاکیاں ہیں۔ باقی کا رنگ ہے:

یہ انا کیسے درمیاں آئی
ہو گئی بزم دوستاں خالی

باقی کے ہم عصر شاذ تمکنت کی غزل کا شعر ہے:

مرا ضمیر بہت ہے مری سزا کے لیے
تو دوست ہے تو نصیحت نہ کر خدا کے لیے

باقی اور شاذ ہی کے عہد میں بشیر بدر کا شعر ہے:

دنیا میں کہیں ان کی تعلیم نہیں ہوتی
کچھ خاص کتابوں کو گھر میں پڑھا جاتا ہے

باقی، شاذ، بشیر بدر ہی کے ساتھ شہریار بھی ہیں:

گھر کی تعمیر تصور میں ہی ہو سکتی ہے
مرے نقشے کے مطابق یہ زمیں کچھ کم ہے

پاکستان اور ہندوستان میں ایک ہی دور میں چلتے بھی قابلِ غور شاعر ہیں ان کے رنگ، انداز اور موضوعات ایک دوسرے سے جدا ہیں۔ خانہ بندی کا کام تنقید کا ہے۔ تخلیقی ادب ہمیشہ اس کی نفی کرتا رہا ہے۔ اظہار و موضوع کی رنگا رنگی دونوں ملکوں میں الگ الگ انداز میں نظر آتی ہے۔

ن ص: زندگی کا کوئی ایسا واقعہ جس نے آپ کی فکر و فن پر غیر معمولی اثر ڈالا ہو؟

ن ف: دو واقعوں کا میری عملی و تخلیقی زندگی پر اثر بہت گہرا ہے۔ ایک ہے ملکی تقسیم جو میرے شعور سے پہلے کا عمل ہے۔ دوسرا میرا گھر سے بے گھر ہونا جو میرے شعوری زمانے کا المیہ ہے۔ ملکی تقسیم کی وجہ سے جو خون خرابہ اور لاکھوں زندگیوں کی تباہیاں ہوئیں وہ مجھے وراثت میں ملی ہیں۔ میرے شعور نے مجھے دانستہ تنہائی کا حصہ بنایا۔ میرے گھر والے یعنی والدین، بہن، بھائی سب 1959-60 کے درمیان گوالیار میں فسادات سے گھبرا کر ہجرت کر گئے۔ میں ان کے ساتھ دلّی چھوڑنے پر راضی نہیں ہوا۔ اس وقت میں نے سوچا تھا زمین کی تبدیلی مسائل کا حل نہیں ہے۔ اسی سوچ پر میں آج بھی قائم ہوں۔ لیکن اسی سوچ کے ہاتھوں میں ماں کی شفقت اور باپ کی چاہت سے محروم رہا۔

جانے کیا کیا بول رہا تھا سرحدِ پیار، کتابیں، خون
کل میرے بستر پر تھک کر ٹوٹ رہا تھا جانے کون

ن ص: جس طرح آج اُردو کی کتابیں دھڑا دھڑ آ رہی ہیں کیا ان سے اُردو میں کوئی اضافہ بھی ہو رہا ہے یا بس رطب و یابس جمع ہو رہا ہے۔؟

ن ف: رطب و یابس ہر عہد میں ادب کا مقدر رہا ہے۔ ادب مشین کا پروڈکٹ نہیں ہوتا۔ ہر شے کا ایک سی شکل و صورت کا ہونا ممکن نہیں ہے۔ اسی رطب و یابس کے ڈھیر میں سے کام کی چیزیں نکالنا ہی پہلے تنقید کا کام تھا۔ نیاز فتح پوری نے نوجوان فراق کی پہچان کی تھی، راہی معصوم رضا نے یگانہ پر کتاب لکھی تھی۔ باقر مہدی نے اختر الایمان کی تلاش کی تھی، وارث علوی نے راجندر سنگھ بیدی کو نئے سرے سے متعارف کرایا تھا، ندیم قاسمی نے فکیب جلالی کی کتاب پر مقدمہ لکھا تھا۔ ان ناموں کی تلاش و تعارف اپنے عہد کی تنقید کی شعور مندی کا ثبوت ہے۔ آج کی تنقید گروہ بندی کا شکار ہے وہ رطب و یابس کی چھان پھٹک کے بجائے کتابوں کی بھیڑ ہی کو سلام کرتی نظر آتی ہے اور اسی قسم کے سلام و پیام سے اپنی دُکان چلاتی ہے۔ اس دکانداری میں بلا تخصیص سب شریک ہیں:

ہم ہوئے تم ہوئے کہ میر ہوئے

ناقدوں کی خیمہ بندی، اور مصلحت اندیشی نے اردو کے تخلیقی ادب کو جتنا نقصان پہنچایا ہے اس کی مثال تاریخ کے کسی دور میں ملنا مشکل ہے۔ گیان سنگھ شاطر کی کتاب کو انعام کا مستحق ٹھہرایا جاتا ہے اور رتن سنگھ اور جوگیندر پال جیسے ادیبوں کو حاشیے پر سجایا جاتا ہے۔ حسرت موہانی نے شاید اسی صورت حال کو نظر میں رکھ کر کہا تھا:

جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے

ن ص: آپ نے 'اردو دنیا' کے لیے اتنا وقت دیا اس کے لیے شکریہ!

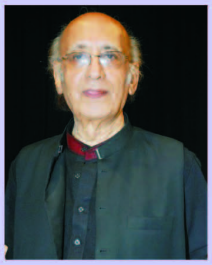

ندا فاضلی

پیدائش: گوالیار (مدھیہ پردیش) 21 اکتوبر 1940، تعلیم ایم اے (اُردو ہندی)

کتابیں: شعری مجموعے (1) لفظوں کا پل (2) مور ناچ (3) آنکھ کے درمیان (4) کھویا ہوا سا کچھ (5) شہر میرے ساتھ چل (6) زندگی کی تُرپ

نثری مجموعے: (1) ملاقاتیں (تنقید) (2) دیواروں کے بیچ (سوانحی ناول) (3) دیواروں کے باہر (سوانحی ناول) (4) چہرے (خاکے) (5) دنیا مرے آگے

انعامات: ساہتیہ اکادمی دہلی، غالب ایوارڈ، مکھر سمان (ایم پی گورنمنٹ) سردار جعفری عالمی انعام (امریکہ) ہارمنی ایوارڈ (وزیر اعظم سے) اور بہت سے ساؤتھ ایشیا، ریکارڈنگ پروجیکٹ میں ہندستان، بنگلہ دیش اور پاکستان کے منتخب ادیبوں اور شاعروں میں شامل۔

ادب کی نمائندگی: امریکہ کی مختلف ریاستیں، کناڈا کے مختلف مراکز، ملیشیا، بنگلہ دیش، لندن کے مختلف علاقے، پاکستان کے کئی شہر، سعودیہ کے کئی مراکز، خلیجی ممالک، جرمنی کے کئی ادبی مراکز میں مشاعروں میں شرکت۔

ہندی میں بھی نثر و نظم کی تقریباً تمام کتابیں اور گجراتی میں دس شعرا کے انتخاب، مراٹھی میں کئی کتابیں، شائع ہو چکی ہیں۔ مہاراشٹر، یوپی، گجرات، بہار، دلی وغیرہ کے تعلیمی نصاب میں کئی نظمیں اور مضامین شامل ہیں۔

Nadeem Siddiqui, F\9,1st Floor Rizvi Baugh Opp Rly station MUMBRA 400612 (Thane

کور اسٹوری



تعلیم کا حق اور اقلیتیں

حق تعلیم ایکٹ کے نفاذ کا مطلب صرف یہ نہیں ہے کہ اس کے تحت ہندوستانی شہریوں کو اپنے بچوں کے لیے تعلیم کا حق ملے گا۔ اس ایکٹ کے دو خاص معنی اور مقصد ہیں۔ ایک ، سب کو معیاری تعلیم دلانا ۔ دو، سماج کے تمام پس ماندہ طبقوں اورآزادی کے بعد دوسروں سے پچھڑ جانے والی اقلیتوں کو معیاری تعلیم کی سہولت بہم پہنچانا۔اب جب کہ ملک کی سب سے بڑی عدالت ، سپریم کورٹ نے اس قانون کو جائز ٹھہراتے ہوئے سرکاری مراعات پانے والے متمول پرائیویٹ اسکولوں‌میں غریب اور پسماندہ طبقوں کے 25فیصد بچوں کو مفت تعلیم دینے کی سرکاری شرط پر تصدیق کی مہر لگادی ہے، حق تعلیم قانون کے نفاذ میں حائل آخری رکاوٹ بھی دور ہو گئی ہے۔ موجودہ سماجی اور اقتصادی پس منظر میں ہمارے پس ماندہ طبقے ، پچھڑی ہوئی اقلیتیں ، بالخصوص مسلمان ، معیاری تعلیم کا حق دلانے والے اس قانون کا کس طرح فائدہ اٹھا سکتے ہیں ، حکومت کی کیا منشا ہے ،اقلیتیں کیا چاہتی ہیں ، اردو زبان کے فروغ کی اس میں کیا گنجائشیں ہیں ، زیر نظر کور اسٹوری میں‌ان سوالوں کا جواب ڈھونڈنے کی کوشش کی گئی ہے۔ فروغ انسانی وسائل کے مرکزی وزیر جناب کپل سبل نے اپنے مضمون میں اس قانون کی آفاقی اہمیت اور اس کے نفاذ سے جڑے ہوئے مسائل کا حقیقت پسندانہ جائزہ لیا ہے ، تو جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز کے ڈائریکٹر پروفیسر اخترالواسع ملک کی سب سے بڑی اقلیت کو اس سنہرے موقع کا بھر پور فائدہ اٹھانے کی طرف متوجہ کر رہے ہیں۔

ادارہ

3/21/2018 P10.jpg (923×1238)

کپل سبل

حقِ تعلیم ایکٹ: پوری دنیا کے لیے ایک مثال

تعلیم کے معیار کو برقرار رکھتے ہوئے کمزور طبقات کے بچوں کو داخلہ دینا پرائیویٹ اسکولوں کے لیے ایک مشکل کام ہوسکتا ہے، لیکن یہ کیا جاسکتا ہے۔

بچوں کے مفت اور لازمی تعلیم کے حق سے متعلق قانون، حقِ تعلیم' یا 'رائٹ ٹو ایجوکیشن' (آر ٹی ای) کو جائز ٹھہرانے کے سپریم کورٹ کے فیصلے نے ایک بار پھر عوام کی توجہ تعلیم پر مرکوز کردی ہے۔ اگرچہ اکثریت نے اس فیصلے کی پرجوش ستائش کی ہے لیکن کچھ حلقوں کی جانب سے اس قانون کے ضابطوں ڈھکی چھپی نکتہ چینی بھی جاری ہے۔

آر ٹی ای قانون کے تحت پرائیویٹ تعلیمی اداروں پر ڈالی گئی ذمہ داریوں کے باوجود بنیادی تعلیم ہر ایک کو فراہم کرنے کی بڑی ذمہ داری بلاشبہ حکومت پر عائد ہوتی ہے۔ اسکولوں میں داخلے کے لیے ہر ایک کی رسائی اور ان کی پڑھائی جاری رکھنا، جنسی اور سماجی فرق کو ختم کرنا اور بنیادی تعلیم کے معیار کو بہتر بنانا، سرو شکشا ابھیان کے ذریعے حکومت کی کوششوں کا بنیادی مقصد ہے۔

قانون میں پرائیویٹ اسکولوں سے متعلق ضابطوں کا مطلب یہ نہیں کہ مرکز اور ریاستی حکومتوں کو بنیادی ڈھانچے، دیگر سہولتیں اور آر ٹی ای قانون کے مقاصد کو پورا کرنے کے لیے ضروری ماحول فراہم کرنے کی بنیادی ذمہ داری سے مستثنیٰ کردیا گیا ہے۔ محروم گروپوں اور پسماندہ طبقات سے تعلق رکھنے والے 25 فیصد بچوں کو ہر سال پری اسکول/ پہلی جماعت میں پرائیویٹ اسکولوں میں داخلہ دلانے کے بعد بھی ملک میں 90 فیصد سے زیادہ کنبوں کو اپنے بچوں کو سرکاری اسکولوں میں ہی داخلہ دلانا پڑے گا۔

محروم گروپوں اور پسماندہ طبقات سے تعلق رکھنے والے 25 فیصد بچوں کو پرائیویٹ غیر امدادی (غیر اقلیتی) اسکولوں میں داخلہ فراہم کرنے کے ضوابط ماضی کے امتیازی برتاؤ کو ختم کرتے ہوئے سماجی ہم آہنگی پیدا کرنے کی ایک کوشش کے طور پر وضع کئے گئے ہیں۔ آر ٹی ای قانون کے اس ضابطے سے اسکول اس بات کو یقینی بنانے میں کامیاب ہوسکیں گے کہ اسکولوں کے ان طلبا میں الگ الگ سماجی طبقوں کے بچے ہوں تاکہ ہر بچہ اسکول میں کچھ نیا اور مختلف انداز لے کر آئے اور اسکولی برادری کی اقدار میں اضافہ کرے اور اس طرح علم حاصل کرنے کے لیے زیادہ جمہوری ماحول پیدا ہوسکے۔ آر ٹی ای قانون سماجی ہم آہنگی پیدا کرنے کی معتدل کوشش ہے۔

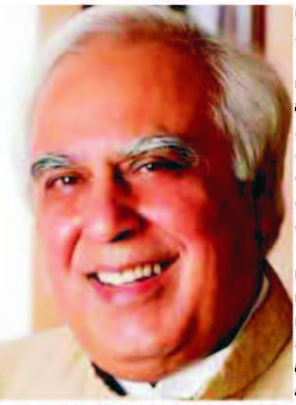

"یہ قانون جنس، ذات پات، طبقات اور برادری پر مبنی ان رکاوٹوں کو ہٹانے کا موقع دیتا ہے جو ہماری جمہوریت کے سماجی تانے بانے کو توڑنے کے درپے ہیں... مجھے یقین ہے کہ یہ ہمارے مستقبل کو بہتر بنانے والا نظریاتی قانون ہے اور اگر سرکاری حکام اور دیگر متعلقین نے اسے ٹھیک جذبے سے نافذ کیا تو یہ پوری دنیا میں پیروی کے لیے ایک مثال بن سکتا ہے"

اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اس کے تحت پرائیویٹ اسکولوں کو اپنے یہاں بہت بڑی تبدیلیاں لانی ہوں گی۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ کوئی تبدیلی محض آپ کے مطالبے سے نہیں ہوتی۔ تبدیلیاں لانے میں جو دشواریاں آتی ہیں انھیں تسلیم کرتے ہوئے اس قانون کے اطلاق کے لیے "مرحلہ وار طریقہ کار" اپنایا گیا ہے جس کے تحت پسماندہ طبقات کے بچوں کے داخلے صرف ابتدائی مرحلے میں ہی رکھے گئے ہیں۔ پری اسکول/ پہلی جماعت میں داخلوں اور آگے بڑھتے ہوئے ہر سال نئے نئے بچوں کے داخلوں کے ساتھ، رفتہ رفتہ اسکولوں کی آبادی میں ایک تنوع آتا جائے گا اور رفتہ رفتہ ان پرائیویٹ اسکولوں کی ہر کلاس میں سماج کے سبھی طبقوں کے بچے پڑھتے ہوئے نظر آئیں گے۔

اس طرح ان بچوں کو ایک ساتھ مل کر پروان چڑھنے اور ایک ایسے رشتے میں بندھنے کا موقع ملے گا کرنے کا موقع ملے گا، جو سماجی طبقہ بندی میں بھی برقرار رہے گا۔ اس رفتار سے ہونے والی پیش رفت اسکولوں کو ایسی پیشہ ورانہ صلاحیت کے فروغ میں مدد دے گی جو مختلف سماجی پس منظر سے تعلق رکھنے والے بچوں کی ذہنی و جذباتی ضرورتوں کو پورا کرسکے۔ نامساعد حالات میں رہنے والے بچے جب زندگی گزارنے کے وسیع تجربات کو آسائش کی زندگی گزارنے والے بچوں کے ساتھ بانٹیں گے تو یہ ان سب کے لیے بیش قیمت آگہی سے بھرا ہوا عمل ہوگا۔ ایک دوسرے سے مختلف پس منظر رکھنے والے بچوں کے آپس میں میل جول سے اسکول کے ماحول میں بھی کئی مثبت تبدیلیاں آسکتی ہیں۔ یہ ممکن ہے کہ ابتدائی برسوں میں غریب کنبوں کے کچھ بچوں کو، خاص طور پر انھیں جو اس کنبے میں اسکول جانے والی پہلی نسل ہوں، نصاب کو پورا کرنے میں پریشانی کا سامنا کرنا

http://urducouncil.nic.in/Urdu-Duniya/Urdu-Duniya-June-2012/P10.jpg 1/1



غریب اور محروم طبقوں کے بچوں کو داخلہ دینا پرائیویٹ اسکولوں کے لیے ، اپنے تعلیمی معیار کو برقرار رکھتے ہوئے ایک مشکل کام ہوسکتا ہے، لیکن یہ کیا جاسکتا ہے

پڑے۔ لیکن محروم گروپوں سے تعلق رکھنے والے بہت سے بچوں نے یہ ثابت کر دکھایا ہے کہ اگر انھیں سہولتوں سے بھرپور ماحول فراہم کیا جائے تو وہ نہ صرف نصاب کو پورا کر لیتے ہیں بلکہ کئی مرتبہ وہ دوسرے بچوں سے زیادہ اچھا کر دکھاتے ہیں۔

درحقیقت، اعداد و شمار سے ظاہر ہوتا ہے کہ نسبتاً غریب کنبوں کے بچے آئی آئی ٹی میں زیادہ داخلے پا رہے ہیں۔ کھیلوں کے میدان میں بھی زیادہ تر غریب گھرانوں سے تعلق رکھنے والے بچوں نے ہی مہارت حاصل کی ہے۔ بہت سے اسکولوں میں جنھیں خیراتی یا مذہبی ٹرسٹ چلا رہے ہیں، پہلے ہی بڑی تعداد میں محروم گروپوں سے تعلق رکھنے والے بچوں کو بڑی تعداد میں داخلہ دینے کی پالیسی اپنائی جا چکی ہے جب کہ تعلیم کے معیار کے ساتھ کوئی بھی سمجھوتہ بھی نہیں کیا جا رہا ہے۔

قانون کے تحت اسکولوں کو اپنی نشوونما کا عمل مکمل کرنے اور ادارہ جاتی ڈھانچے کو منضبط کرنے کے لیے ایک لمبی میعاد دی جائے گی تاکہ انھیں تعلیم کے معیار سے کسی قسم کا سمجھوتہ نہ کرنا پڑے۔ اگرچہ یہ آسان نہیں ہے لیکن ایسا کیا جا سکتا ہے۔

اسکولوں کے انتظامیہ کے لیے اس کے مالی مضمرات کے بارے میں تشویش کئی معاملات میں حقیقی ہو سکتی ہے۔ لیکن پرائیویٹ اسکولوں میں، خاص طور پر دیہی علاقوں اور چھوٹے قصبوں میں، ایک بچے پر ہونے والے اخراجات سرکاری اسکولوں سے کم ہوتے ہیں۔ اس لیے ایسے اسکولوں میں حکومت کی طرف سے عوضی میں ادا کی جانے والی رقم کمزور طبقوں سے تعلق رکھنے والے بچوں کو تعلیم دلانے کے لیے کافی ہوگی۔ لیکن ریاستوں کو معینہ مدت کے اندر اور موثر طریقے سے ادائیگی کے لیے ایک کھلا اور شفاف نظام، ترجیحی طور پر آن لائن نظام، اپنانا ہوگا۔

تاہم یہ بھی سچ ہے کہ بڑے شہروں میں کچھ اسکولوں کا، فی بچہ بجٹ ریاستی اسکولوں سے کافی زیادہ ہوتا ہے۔ اسکولوں کو اس فرق کو پورا کرنے کے لیے اختراعی طریقہ کار تلاش کرنے ہوں گے۔ اس کے لیے خیرات کرنے والے افراد، خیراتی ٹرسٹ اور کارپوریٹ فنڈنگ جیسے طریقے عمل میں لائے جا سکتے ہیں۔

ایسا لگتا ہے کہ قانون کے دیگر مثبت ضابطوں کو مناسب طور پر اجاگر نہیں کیا گیا ہے۔ والدین طویل عرصے سے داخلوں کے معاملے میں پرائیویٹ اسکولوں میں جاری غیر اخلاقی اور غیر شفاف حرکتوں سے پریشان ہوتے آ رہے تھے۔ اب اس قانون کے نفاذ اور بیدار سول سوسائٹی کی مدد سے ہمیں امید ہے کہ یہ چیز ماضی کا حصہ بن جائے گی۔ جیسا کہ سپریم کورٹ نے بار بار کہا ہے تعلیم کسی انٹرپرائز کی طرح تجارت نہیں بن سکتی۔ سماج کے مفاد میں یہی ہوگا کہ تعلیم فراہم کرنے والے ادارے اپنے لین دین اور عمل میں کھلے اور شفاف ہوں۔

ایک تشویش یہ بھی ظاہر کی جا رہی ہے کہ اس قانون کی وجہ سے زیادہ جوش میں آئے ہوئے تعلیمی افسر معائنوں کی جھڑی لگا دیں گے اور اسکول والوں کو ہراساں کریں گے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ ہر ایک کے مفاد میں ہوگا کہ حقیقی خیراتی اداروں اور افراد کے لیے ایسا سازگار ماحول پیدا کیا جائے جس میں زیادہ سے زیادہ معیاری اسکول قائم کیے جا سکیں۔ ہم سب کا اس پر پورا اتفاق ہے کہ محروم گروپوں سے تعلق رکھنے والے بچوں کو اسکول میں داخلہ لیتے وقت کسی بھی مالی یا نفسیاتی رکاوٹ کا سامنا نہیں ہونا چاہیے۔ آر ٹی ای قانون ایسی ہی رکاوٹوں کو دور کرتا ہے۔ ریاستوں کو یہ بات سمجھنا ہوگی کہ ان کی توجہ ان رکاوٹوں کو دور کرنے پر ہونی چاہیے نہ کہ اسکول کھولنے کی اس آزادی پر پابندیاں لگانے پر، جو آئین کی دفعہ 19 (1) (g) میں تفویض کی گئی ہے۔

کچھ اسکولوں اور اساتذہ نے بھی اس قانون کے کچھ ضابطوں پر شبہات کا اظہار کیا ہے جنھیں میں واضح کرنا چاہوں گا۔

پہلی غلط فہمی کا تعلق آر ٹی ای قانون کے اس ضابطے سے ہے جس کے تحت جسمانی سزا یا ذہنی طور پر ہراساں کیے جانے پر پابندی ہے۔ ہم میں سے بہت

سے ایسے ہیں جن کا خیال ہے کہ ڈسپلن سزا اور خوف سے آتا ہے۔ لیکن پوری دنیا کے ماہرین تعلیم کی واضح رائے ہے کہ جسمانی سزا اور ذہنی خوف منفی اثرات کے حامل ہوتے ہیں۔ ان کی وجہ سے ایک بچہ زیادہ ضدی اور باغی ہوسکتا ہے۔ بچوں کا جسم بہت نازک ہوتا ہے یہاں تک کہ صرف ایک تھپڑ کی چوٹ سے بچہ بہرا ہوسکتا ہے۔ کسی بھی قسم کی جسمانی سزا اور ذہنی خوف بنیادی طور پر غیر محفوظ اور صحت کے لیے نقصان دہ اور بچوں کے حقوق کی خلاف ورزی ہے اور اسی لیے ممنوع ہے۔

دوسری غلط فہمی بچے کو فیل نہ کرنے سے متعلق ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ کسی بچے کو دوبارہ اسی کلاس میں پڑھنے پر مجبور کرنا غیر محرک ہوگا اور ضروری نہیں کہ بچے کو دوسرے سال بھی اسی نصاب کی ضرورتیں پوری کرنے کے لیے کچھ خاص ذرائع حاصل ہوسکیں گے۔ فیل نہ کرنے کے ضابطے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ بچوں کی اہلیت کا تجزیہ کرنے کے طریقوں کو ختم کردیا جائے۔ آر ٹی ای ایک مسلسل اور جامع تجزیے کے طریقہ کار کو نافذ کرنے کی گنجائش فراہم کرتا ہے جو خوف سے آمیز نہ ہو۔ بچے کو ناکام ہونے کے خوف سے آزاد کرسکے اور اساتذہ کو اس قابل بنا سکے کہ وہ بچوں کے سیکھنے کی اہلیت پر انفرادی توجہ دے پائیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس طرح کے نظام میں معیار کو بہتر بنانے کے بہترین مواقع موجود ہیں۔

اساتذہ اور اسکول انتظامیہ کبھی کبھی غلط طور پر یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ جسمانی سزا کو ممنوع قرار دینے یا کسی بچے کو ایک کلاس میں دوبارہ پڑھنے کو ممنوع قرار دینے یا لڑکے یا لڑکی کو اسکول سے نکالے جانے پر پابندی سے ان کے اختیارات میں کمی ہوگی اور انھیں ڈسپلن برقرار رکھنے میں زیادہ دشواری ہوگی۔ حقوق کی تعداد معین یا لامحدود نہیں ہوتی اور بچوں کو تفویض اختیارات کا مطلب یہ نہیں کہ اساتذہ اور انتظامیہ کے حقوق کم ہوجائیں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک ایسا اسکولی ماحول تیار کرنے سے، جس میں بچوں کے حقوق کا احترام کیا جاتا ہو، اساتذہ اور انتظامیہ کے احترام میں اضافہ ہونے کا امکان ہے۔

ریاستی حکومتوں اور تعلیمی حکام کو یہ قانون اس کی اصل روح کے ساتھ نافذ کرنا ہوگا۔ جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں، زیادہ توجہ سرکاری اسکولوں پر دینی ہوگی جہاں سرد شکشا ابھیان کے تحت مرکزی بجٹ پچھلے تین برسوں میں دوگنے سے زیادہ کردیا گیا ہے۔ ہم امید کرتے ہیں کہ بنیادی تعلیم کے لیے مرکزی اور ریاستی بجٹ میں اضافہ جاری رہے گا اور کے نتیجے میں کمزور طبقات کی تعلیم کے لیے پرائیوٹ اسکولوں کو دی جانے والی عیوضی کی رقم میں بھی اضافہ ہوگا۔

قانون میں ریاستی حکومتوں اور پرائیویٹ اسکول کے انتظامیہ کو بھی شامل کیا گیا ہے تاکہ قانون کے ضابطوں اور معیار پر عمل درآمد کو یقینی بنایا جاسکے۔ ان ضابطوں کو پورا کرنے کے لیے سرکاری اسکولوں کے نظام میں بنیادی سدھار لانا ہوگا۔ اس کے ساتھ ہی ان پرائیویٹ اسکولوں کو جو ان معیارات کو پورا نہیں کرتے (بہت سے اسکول ایسے ہیں جن میں تعلیم کا معیار سرکاری اسکولوں سے بھی زیادہ خراب ہے) اپنے یہاں اصلاحات کرنی ہوں گی۔

آر ٹی ای قانون جنس، ذات پات، طبقات اور برادریوں پر مبنی ان رکاوٹوں کو دور کرنے کا موقع فراہم کرتا ہے جو ہماری جمہوریت کے سماجی تانے بانے کو توڑنے کے درپے ہیں اور جو ایسی دراڑ پیدا کرتی ہیں جو ہمارے ملک کے لیے تباہ کن ثابت ہوسکتی ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ آر ٹی ای قانون اپنے مقاصد اور وسعت کے لحاظ سے ہمارے مستقبل کو بہتر بنانے والا نظریاتی قانون ہے اور اگر سرکاری حکام، اسکولوں کے انتظامیہ اور دیگر متعلقین نے اچھی طرح سوچ سمجھ کر اسے ٹھیک جذبے سے نافذ کیا تو یہ پوری دنیا میں پیروی کے لیے ایک مثال بن سکتا ہے۔

مضمون نگار مرکزی وزارت فروغ انسانی وسائل کے وزیر ہیں

بشکریہ: بزنس آف انڈیا، دہلی، 20 اپریل 2012
انگریزی سے ترجمہ: وسیم احمد

دہلی کے ایک طالب علم کو لکھا گیا کپل سبل کا خط

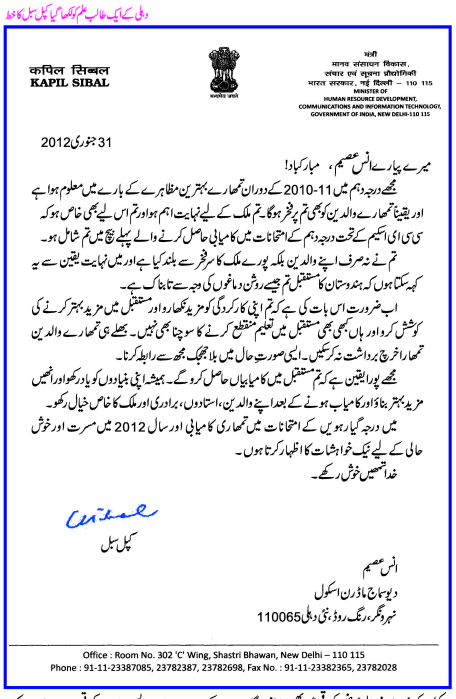

कपिल सिब्बल
KAPIL SIBAL

मंत्री
मानव संसाधन विकास,
संचार एवं सूचना प्रौद्योगिकी
भारत सरकार, नई दिल्ली – 110 115
MINISTER OF
HUMAN RESOURCE DEVELOPMENT,
COMMUNICATIONS AND INFORMATION TECHNOLOGY,
GOVERNMENT OF INDIA, NEW DELHI-110 115

31 جنوری 2012

میرے پیارے انس عصیم، مبارکباد!

مجھے درجہ دہم میں 11-2010 کے دوران تمھارے بہترین مظاہرے کے بارے میں معلوم ہوا ہے اور یقیناً تمھارے والدین کو بھی تم پر فخر ہوگا۔ تم ملک کے لیے نہایت اہم ہو اور تم اس لیے بھی خاص ہو کہ سی سی ای اسکیم کے تحت درجہ دہم کے امتحانات میں کامیابی حاصل کرنے والے پہلے بیچ میں تم شامل ہو۔

تم نے نہ صرف اپنے والدین بلکہ پورے ملک کا سر فخر سے بلند کیا ہے اور میں نہایت یقین سے یہ کہہ سکتا ہوں کہ ہندوستان کا مستقبل تم جیسے روشن دماغوں کی وجہ سے تابناک ہے۔

اب ضرورت اس بات کی ہے کہ تم اپنی کارکردگی کو مزید نکھارو اور مستقبل میں مزید بہتر کرنے کی کوشش کرو اور ہاں کبھی بھی مستقبل میں تعلیم منقطع کرنے کا سوچنا بھی نہیں۔ بھلے ہی تمھارے والدین تمھارا خرچ برداشت نہ کرسکیں۔ ایسی صورت حال میں بلا جھجک مجھ سے رابطہ کرنا۔

مجھے پورا یقین ہے کہ تم مستقبل میں کامیابیاں حاصل کروگے۔ ہمیشہ اپنی بنیادوں کو یاد رکھو اور انھیں مزید بہتر بناؤ اور کامیاب ہونے کے بعد اپنے والدین، اساتذوں، برادری اور ملک کا خاص خیال رکھو۔

میں درجہ گیارہویں کے امتحانات میں تمھاری کامیابی اور سال 2012 میں مسرت اور خوش حالی کے لیے نیک خواہشات کا اظہار کرتا ہوں۔

خدا تمھیں خوش رکھے۔

کپل سبل

انس عصیم
دیوسماج ماڈرن اسکول
نہر بنگر، رنگ روڈ نئی دہلی 110065

Office : Room No. 302 'C' Wing, Shastri Bhawan, New Delhi – 110 115
Phone : 91-11-23387085, 23782387, 23782698, Fax No. : 91-11-23382365, 23782028

Waseem Ahmad, N-24, Near Khalilullah Masjid, Jamia Nagar, New Delhi- 110025

اختر الواسع

حق تعلیم ایکٹ

اقلیتوں کے لیے شعاعِ امید





26 جنوری 1950 کو سیکولر جمہوری ہندوستان کے دستور کو نافذ کرتے وقت ہمارے قومی رہنماؤں نے ہندوستانی قوم سے یہ وعدہ کیا تھا کہ چھ سال سے چودہ سال کے بچوں کو تعلیم کی مفت فراہمی سرکاروں کی ذمہ داری ہوگی لیکن تاریخ کی یہ عجیب ستم ظریفی ہے کہ اس وعدے کے ایفا میں ایک دو نہیں باسٹھ سال لگ گئے۔ اسے خوش بختی ہی کہئے کہ یہ شرف وسعادت ترقی پسند محاذ کے دوسرے پنج سالہ دور حکومت میں مرکزی وزیر برائے فروغ انسانی وسائل جناب کپل سبل جو ایک ماہر قانون کا دماغ لیکن شاعر کا دل رکھتے ہیں کے حصے میں آئی۔

ایک ایسے ملک میں جو انسانی تاریخ اور تہذیبوں کے سفر میں اپنے علم ودانش اور روحانی کمالات کے لیے چہار دانگ عالم میں شہرت کا مالک رہا ہو اور اقبال کے لفظوں میں کہیں تو:

یونان ومصر وروما سب مٹ گئے جہاں سے
باقی مگر ہے اب تک نام و نشاں ہمارا

غیر ملکی سامراج کی حکومت نے ملک کی سیاسی و سماجی فضا پر جو منفی اثرات مرتب کیے۔ ان میں عام ہندوستانیوں تک تعلیم کی عدم دستیابی بھی تھی۔ اس کے علاوہ خود ہندوستان میں ذات پات کی بنیاد پر تفریق اور اونچ نیچ کا رویہ بھی ایک بڑی اکثریت کی تعلیم سے محرومی کا سبب بنا۔ خود مسلمانوں کے اندر بھی سرسید اور ان کے رفقا اور مابعد علی گڑھ تحریک کے جو رہنما ابھر کر سامنے آئے ان کی کوششوں کے باوجود بھی مسلمان جدید تعلیم سے خود کو کلی طور پر کبھی بھی ہم آہنگ نہیں کر پائے۔

آزادی کے بعد نئے ہندوستان کی تعمیر وترقی اور عالمی بساط پر ہندوستان کی عظمت رفتہ کی بازیافت اس وقت تک ممکن ہی نہیں تھی جب تک کہ ہر ہندوستانی زیور تعلیم سے آراستہ نہ ہوجائے اور یہی وجہ تھی کہ ہمارے قومی رہنماؤں نے چھ سال سے چودہ سال تک کے بچوں کو تعلیم

اقلیتی تعلیم کے لئے قائم شدہ قومی نگراں کمیٹی کی اسٹینڈنگ کمیٹی

مرکزی حکومت کی وزارت فروغ انسانی وسائل نے قومی مشترکہ اقل ترین پروگرام میں اقلیتوں کی تعلیم اور فلاح و بہبود سے متعلق خصوصی توجہ دی ہے اور اس سلسلے میں اقلیتی تعلیم کے لیے قومی نگراں کمیٹی 23 دسمبر 2011 کو دوبارہ تشکیل دی گئی۔ اس کی پہلی میٹنگ 5 مارچ 2012 کو منعقد کی گئی جس میں ایک اسٹینڈنگ کمیٹی کے قیام کا فیصلہ کیا گیا۔ اسٹینڈنگ کمیٹی کا قیام مندرجہ ذیل امور کے لیے کیا گیا۔

- فروغ انسانی وسائل وفروغ کی اقلیتوں سے متعلق اسکیموں، پروگراموں کے نفاذ کا جائزہ لینا
- وزارت کی اسکیموں میں ضرورت پڑنے پر تبدیلی اور بہتری لانے کا مشورہ دینا
- گذشتہ کمیٹیوں کی رپورٹ کا مطالعہ کرنے اور اقلیتی تعلیم اور بہبود سے متعلق مختلف نکات پر صلاح دینا
- این ایم سی ایم ای کو اقلیتوں سے متعلق اسکیموں، پروگراموں کے لئے نگرانی کا نظام تشکیل تجویز کرنا
- اقلیتی تعلیم سے متعلق دیگر معاملات جن پر کمیٹی حکومت اور این ایم سی ایم ای کی توجہ چاہتی ہو۔

چیئرپرسن: سراج حسین

اراکین: امتیاز احمد، محبوب الحق، حنیف لکڑاوالا، اصغر علی انجینئر، سیدہ بلگرامی امام، تیستا سیتلواڈ، ذکیہ صدیقی، رومی جعفری، عمر پیرزادہ، احمد تمیم، ظفر ایچ جنگ، محمد حلیم خاں، مولانا محمد ولی رحمانی، پی اے انعام دار، بھجن سنگھ والیہ، ریورینڈ زیویئر الفونسے، گیشے نگوانگ ساتین سہل ایچ مسلیار، پروفیسر اختر الواسع، **ممبر سیکریٹری:** جوائنٹ سکریٹری (انچارج مائنارٹی سیل)

قومی نگراں کمیٹی کی ذیلی کمیٹیاں

قومی نگراں کمیٹی کی 5 مارچ 2012 کو منعقدہ میٹنگ میں پانچ ذیلی کمیٹیاں تشکیل دینے سے اتفاق کیا گیا۔ ان کمیٹیوں کو الگ الگ کام سونپے گئے اور کہا گیا کہ وہ سبھی اپنی رپورٹ 30 جون 2012 تک اسٹینڈنگ کمیٹی کو پیش کردیں۔ یہ کمیٹیاں، ان کے اراکین اور انھیں سونپے گئے کام حسب ذیل ہیں:

ذیلی کمیٹی 1

لڑکیوں کی تعلیم کے فروغ کے لیے

یہ کمیٹی اقلیتوں میں لڑکیوں کی تعلیم کی کمی کے اسباب اور ان کے تدارک، اقلیتی علاقوں میں لڑکیوں کے لئے بہتر اساتذہ کی فراہمی، تعلیمی اداروں میں اقلیتی طبقے کی لڑکیوں کی شرکت کو یقینی بنانے اور ان

اگلے صفحے پر جاری

حق تعلیم ایکٹ مسلم مدارس کے خلاف نہیں

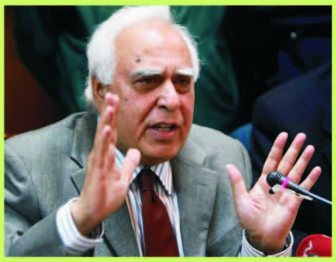

مرکزی وزیر برائے فروغ انسانی وسائل کپل سبل نے صاف طور پر کہا ہے حق تعلیم ایکٹ میں مسلم مدارس کا پورا خیال رکھا جائے گا۔ اردو اخبارات کے مدیروں سے گفتگو کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ اس بل کے تعلق سے آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ میری نیت پر شک کر رہا تھا۔ بورڈ کا کہنا تھا کہ یہ بل شریعت میں مداخلت ہے لیکن آج تک ہم نے ایسا کوئی قدم نہیں اٹھایا جس سے پرسنل لا میں مداخلت ہو۔ اس سلسلے میں پہلے بھی میں نے کہا تھا اور بعد میں گائڈ لائن بھی جاری کی تھی لیکن اس کے باوجود میری نیت پر شک کیا گیا۔ انھوں نے کہ ہم نے بل میں وہی ترمیم کی ہے جسے کرنے کو بورڈ نے ہم سے کہا تھا۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے اقلیتی کردار کی بحالی پر انھوں نے کہا کہ اس معاملے میں بھی مجھے شک کی نظروں سے دیکھا گیا اور یہ کہا گیا کہ میں اس میں رخنہ اندازی کر رہا ہوں جب کہ میں نے ہی سب سے پہلے حلف نامہ داخل کیا تھا۔ اس کے بعد جب قومی کمیشن برائے اقلیتی تعلیمی ادارہ جات کی تنخواہ روکی گئی تو کہا گیا کہ جامعہ کے اقلیتی کردار کی بحالی ہونے سے ناراض ہو کر ادارے کے افسران کی تنخواہ روکی گئی ہے۔ یہ بات سراسر بے بنیاد ہے۔ انھوں نے کہا کہ کچھ لوگ میرے خلاف یہ پرچار کرتے ہیں کہ میں مسلم مخالف ہوں جب کہ میرے مزاج میں یہ بات نہیں ہے۔ میں نے ہمیشہ مسلمانوں کو آگے لانے کی کوشش کی ہے۔ میٹنگ میں روزنامہ انقلاب کے ایڈیٹر ناتھ شکیل حسن شمسی، راشٹریہ سہارا کے سربراہ اسد رضا، ہمارا سماج کے ایڈیٹر خالد انور اور اخبار مشرق کے ایڈیٹر وسیم الحق موجود تھے۔

روزنامہ انقلاب دہلی، 28 اپریل 2012

کی فراہمی کا ذمہ سرکار کے سر ڈالا۔

اکیسویں صدی میں ایک خوش حال اور مضبوط و مستحکم علاقائی طاقت کے روپ میں ہندوستان دنیا کے نقشے پر ابھر کر آئے، اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہر ہندوستانی بچہ تعلیم سے بہرہ مند ہو، کیوں کہ انسانی وسائل کے فروغ کے لیے یہی وہ سرمایہ کاری ہے جو ہمیں دنیا کے نقشے پر معزز اور معزز بنا سکتی ہے۔ اسی لیے بروز جمعرات 27 اگست 2009 کو حق تعلیم کا نفاذ عمل میں آگیا جس میں چھ سال سے چودہ سال تک کے تمام بچوں کے لیے تعلیم کی مفت فراہمی کو لازمی قرار دیا گیا اور سرکاروں اور سرکاری اداروں پر سے متعلق دیگر مسائل سے نمٹنے کے لیے تشکیل دی گئی۔

چیئرپرسن: پروفیسر ذکیہ صدیقی

اراکین: مفتی عطاالرحمن قاسمی، سہیل ایچ مسلیار، صبیحا حسین، ڈپٹی سکریٹری مانکارٹی سیل

ذیلی کمیٹی2

پیشہ ورانہ تعلیم اور ہنر مندی کو بڑھاوا دینے کے لیے

- اقلیتوں کے غلبہ والے ضلعوں میں ووکیشنل پروگرام اور ہنرمندی سے متعلق تربیت کو فروغ دینا
- اقلیتوں کی ضرورتوں کے مطابق 2+10 کی سطح پر ووکیشنل کورسوں کا نفاذ
- اقلیتوں کے غلبے والے اضلاع میں ووکیشنل ایجوکیشن میں تربیت یافتہ اساتذہ کی فراہمی
- ووکیشنل ایجوکیشن کے لیے اسکولوں کے انتخاب کا طریقہ کار
- وزارت کے تیار کردہ NVEQF کے مسودے کا جائزہ لے کر اقلیتوں کی تعلیم سے متعلق مشورے دینا

چیئرپرسن: ریورینڈ ڈوینیز الفونسے

اراکین: محبوب الحق، ٹی پی عبداللہ کویا مدنی، بھجن سنگھ والیہ، محمد انیس اور ڈپٹی سکریٹری مانکارٹی سیل

ذیلی کمیٹی3

فروغ اردو زبان اور اقلیتوں میں روزگار کے مقصد سے انگریزی تعلیم کے حصول کے لیے

- اردو اسپیکنگ اساتذہ کی فراہمی سے متعلق مسائل سے نمٹنا،
- این سی پی یو ایل کی مختلف اسکیموں کا جائزہ لینا اور یہ ذمہ داری عائد کی گئی کہ بچوں کی پرائمری تعلیم کے لیے ایک کلومیٹر اور ثانوی تعلیم کے لیے تین کلومیٹر کی مسافت پر اسکول کھولے جانے چاہئیں۔ اسی طرح یہ فیصلہ بھی کیا گیا کہ نصاب کی کتابیں، یونی فارم اور مڈڈے میل کی فراہمی بھی سرکاروں کی ذمہ داری ہوگی۔ ان تمام سہولتوں کے باوجود اگر ماں باپ اپنے بچوں کو اسکول بھیجنے میں پس وپیش کریں گے تو ان کے خلاف قانونی کارروائی کی جاسکتی ہے اور وہ سزا کے مستوجب ہو سکتے ہیں۔

ایک اہم بات اس قانون میں یہ ہے کہ وہ تمام تعلیمی ادارے جو سرکار سے امداد لیتے ہیں یا سرکار سے رعایتی شرحوں پر انہوں نے پرائیویٹ اسکولوں کی تعمیر کے لیے زمینیں لی ہیں، فیسوں کی ادائیگی میں ان کو سستی کیا گیا ہے یا انہوں نے دوسری مراعات حاصل کی ہیں قانون کے لیے لازم ہوگا کہ وہ اپنے آس پاس کی آبادی کے 25 فی صد غریب بچوں کو اپنے یہاں داخلہ دے کر مفت تعلیم دیں۔ قانون کی اس شق کی موجودگی انتہائی اہمیت کی اس لیے حامل ہے کہ یہ ہندوستان میں موجود انڈیا اور بھارت کے بیچ بڑھتے ہوئے فاصلوں کو کم کرنے کی پہلی شعوری کوشش ہے۔ انڈیا سے مراد وہ طبقات ہیں جو محض متمول اور صاحب ثروت ہی نہیں ہیں بلکہ جو ہندوستان کے تمام وسائل پر اپنی اجارہ داری بنائے رکھنا

- جدید ٹکنالوجی سے مربوط کورسوں، ڈی ٹی پی، میڈیا وغیرہ کی تعلیم کو بڑھاوا دینا،
- اقلیتی آبادی والے علاقوں میں اردو ٹیچروں کی تربیت سے متعلق پروگرام میں سدھار لانا
- اردو زبان کو جدید ٹکنالوجی سے ہم آہنگ کرنے سے متعلق مشورے دینا،

چیئرپرسن: پروفیسر اختر الواسع

اراکین: سید حسن شجاع، ماجد دیوبندی، پروفیسر الیس آر قدوائی، سیدہ بلقیس امام، ڈپٹی سکریٹری مانکارٹی سیل

ذیلی کمیٹی4

اقلیتوں کی تعلیمی ضرورتوں کا خاکہ خطے وار اور ضلعی سطح پر تیار کرنے کے لیے

- مردم شماری کے مطابق اقلیتوں

اگلے صفحے پر جاری

فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے لیے
عام اسکولوں میں بھی اردو پڑھانے کی سفارش



ملک میں فرقہ وارانہ ہم آہنگی کو فروغ دینے کے لیے اردو زبان کو مدارس کے علاوہ عام اسکولوں اور کالجوں میں بھی ایک مضمون کے طور پر پڑھایا جائے۔ اقلیتوں کی لڑکیوں میں اسکول میں پڑھائی کے لیے دلچسپی پیدا کرنے کے لیے انھیں سائیکلیں مفت دی جائیں اور ہر اقلیتی اکثریتی علاقے میں ایک جواہر نوودیہ اسکول کھولا جائے۔ یہ سفارشات سماجی انصاف اور خواتین کی فلاح و بہبود کے لیے پلاننگ کمیشن کی ممبر ڈاکٹر سیدہ حمید کی قیادت میں تشکیل دی گئی کمیٹی کے ذریعہ اقلیتوں کا سدھار نام سے تیار کی گئی رپورٹ میں کی گئی ہیں جو اسی ہفتہ پیش کی گئی۔ اخباری رپورٹوں کے مطابق کمیٹی کے ذریعہ اقلیتوں کی فلاح و بہبود کے لیے کئی تجاویز پیش کی گئی ہیں، جن میں سبسڈی دینے، وظائف کا دائرہ بڑھانے اور بجٹ بڑھانے تک کی سفارشات کی گئی ہیں۔ ان میں سب سے اہم سفارش اقلیتوں کی لڑکیوں (بچیوں) سے متعلق ہے۔ فی الحال مدھیہ پردیش اور بہار میں لڑکیوں کو اسکول جانے کے لیے سائیکل فراہم کرائی جاتی ہیں۔ کمیٹی نے کہا ہے کہ اقلیتی فرقوں سے تعلق رکھنے والی زیادہ تر لڑکیاں اکثر و بیشتر درمیان میں ہی اسکول چھوڑ دیتی ہیں۔ ان میں اسکول میں پڑھنے کا شوق و جذبہ پیدا کیے جانے کی ضرورت ہے۔ اس کے لیے انھیں مفت سائیکلیں دی جانی چاہئیں اور اس منصوبہ کو مرکزی منصوبہ کے تحت پورے ملک میں نافذ کیا جانا چاہیے۔ اس رپورٹ میں دوسری اہم ترین سفارش اردو زبان کو مدارس کے ساتھ ساتھ دیگر اسکولوں میں بھی بطور مضمون پڑھائے جانے سے متعلق ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ اردو کو عام اسکولوں اور کالجوں میں پڑھانے کے لیے اردو اساتذہ کی تقرری کی جانی چاہیے۔ رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ اردو زبان ہندوستانی تہذیب اور ثقافت کی زبان ہے۔ اس زبان میں فرقہ وارانہ ہم آہنگی کو فروغ دینے کا تاناتانا بنا ہوا ہے۔ کمیٹی نے یہ بھی کہا ہے کہ اقلیتی اکثریتی علاقوں میں جواہر نوودیہ اسکول کھولے جائیں اور وہاں اقلیتوں کے بچوں کے لیے 50 فی صد ریزرویشن دیا جائے۔

چاہتے ہیں یہ صارفیتی کلچر کو بڑھاوا دے کر ہندوستانی معاشرے میں ہر سطح پر بازار کا تسلط قائم کرنا چاہتے ہیں۔ اسکول ہو یا اسپتال یا ہوٹل وہ سبھوں کو پانچ ستارہ کے معیار کا دیکھنا چاہتے ہیں اور مزے کی بات یہ ہے کہ غریبوں کی انتہائی معمولی شرح پر رعایتیں لے کر تعمیرات کرتے ہیں اور ہوٹل اور اسپتال میں ہی نہیں اسکولوں میں بھی بڑی بڑی قیمتیں ٹیوشن فیس اور تعمیراتی فنڈ کے نام سے وصول کرتے ہیں۔ یہ وہ طبقات ہیں جنھوں نے تعلیم کو تجارت بنا دیا ہے۔ یہ اب اسٹیل مل، ٹیکسٹائل کے کارخانوں اور دوسری صنعتوں میں پیسہ لگانے کے بجائے اسکول اور کالج کھولنے میں لگ گئے ہیں۔ سرکار کی اس پالیسی کے خلاف انڈیا کے ان نمائندوں نے خوب واویلا مچایا اور اس قانون کے خلاف سپریم کورٹ بھی جا پہنچے۔ وہ تو خیر ہو عدالت عظمیٰ کا جس نے دو ٹوک الفاظ میں یہ بتا دیا کہ غریبوں کے بچوں کی تعلیمی ضرورتوں کی ان دیکھی نہیں کی جا سکتی۔ یہ ایک قومی فریضہ ہے جس کی انجام دہی میں کسی کو رخنہ ڈالنے کی اجازت نہیں ہوگی۔

یہاں یہ واضح رہنا چاہیے کہ انڈیا کی نمائندگی کرنے والے لوگ یہ مشکل 10 فیصد ہیں جبکہ بھارت کی نمائندگی کرنے والے لوگوں کی آبادی 90 فیصد پر مشتمل ہے۔ اس لیے ابھی بھی یہ بحث جاری ہے کہ 25 فی صد غریب بچے جب انتہائی مالدار گھرانوں کے بچوں کے ساتھ بیٹھیں گے تو کیا وہ مزید احساس کمتری کا شکار نہیں ہو جائیں گے؟ کیا وہ تعلیمی مہارت میں بڑے بڑے گھرانوں کے شہزادوں کی برابری کر پائیں گے؟ کیا اس سے امیر ترین ماں باپ کے راج دلاروں کے اخلاق و اطوار پر منفی اثرات مرتب نہیں ہوں گے؟ اگر غور کیا جائے تو یہ آزاد ہندوستان میں پرانی سامراجی نفسیات اور دم توڑ چکے جاگیردارانہ ڈھانچے کی پرانی منطق اور سوچ ہے جو نئے روپ میں آگے بڑھائی جا رہی ہے۔ یہ وہ سوچ ہے جو اپنی فلک بوس عمارتوں کے آس پاس جھگی جھونپڑی والوں کے وجود کو کیٹر تصور کرتی ہے۔ یہ لوگ بھول جاتے ہیں کہ ایک سیکولر جمہوری معاشرے میں یہ بھارت کے لوگ ہیں جو اپنی جفاکشی، لگن اور محنت سے اپنی جگہ بنا رہے ہیں۔ یہ سلطانی جمہور کی طاقت ہے کہ اس ملک میں آئی میزائل کا خالق ڈاکٹر اے پی جے عبدالکلام ایک معمولی غریب مچھیرے کے گھر پیدا ہوا۔ اس ملک کا ایک اور صدر کے۔ آر۔ نارائن ایک غریب دلت پریوار کا چشم و چراغ تھا۔ اس ملک کا ایک وزیر اعظم لال بہادر شاستری غربت کی وجہ سے اسکول جانے کے لیے کشتی کا کرایہ بھی ادا نہیں کر سکتا تھا۔ اس لیے روزانہ تیر کے گھر پر دکھ کر دریا پار کرتا تھا۔

آج اگر گل کے گائے بھیس چرانے والے لالو، ملائم اور غریب آبادیوں میں رہنے والے اشوک گہلوت اور ممتا

کمیٹی کی سفارشات

- ایک ڈاٹا بیس کی تیاری تاکہ تعلیم کے متعلق تمام جانکاریاں حاصل ہو سکیں۔
- ایسے علاقوں کی نشاندہی جہاں اقلیتوں پر خصوصی توجہ دینے کی ضرورت ہے۔
- دیگر متعلقہ معاملات جن پر سب کمیٹی اپنی رائے دینا چاہے۔

چیئر پرسن: پی اے انعام دار
اراکین: خالد انور، شیخ دہلوی، پشپیندر رنگھ، محمد حلیم خاں، ڈپٹی سکریٹری/ مانیٹرنگ سیل

ذیلی کمیٹی 5

اقلیتوں سے متعلق اسکیموں پر عمل کی نگرانی کے لیے

- یہ کمیٹی ابتدائی، ثانوی اور اعلیٰ تعلیمی سطح کے سبھوں کرنے والے لوگوں کی آبادی 90 فیصد پر مشتمل ہے۔ اس

کمیٹی کی سفارشات

- ان نئی اسکیموں کی نشان دہی کرے گی جو اقلیتوں کے لیے شروع کی جا سکیں
- سروشکشا ابھیان، راشٹریہ مادھیمک شکشا ابھیان،
- کستوربا گاندھی بالیکا ودیالیہ، پولی ٹیکنک اداروں سے متعلق ذیلی مشن جیسی مختلف اسکیموں میں اقلیتوں پر مرکوز اسکیموں کی مالیاتی ترقی پر گرانی کا نظام تجویز کرے گی

چیئر پرسن: :مولانا محمد ولی رحمانی
اراکین: مس تیجنا سیتل واد، فاروق شیخ، روی جعفری، حنیف لکڑاوالا، ڈاکٹر بہاالدین محمد ندوی، ڈپٹی سیکریٹری مانیٹرنگ سیل

یہ پانچوں ذیلی کمیٹیاں تیزی سے کام کر رہی ہیں اور امید ہے یہ 30 جون 2012 تک اپنی رپورٹیں پیش کر دیں گی

مایا کے روپ میں نئی تاریخ رقم کر رہے ہیں تو پھر اگر کل کے ان غریبوں کی طرح آج کے غریب بچوں کو ان سے بہتر مواقع مل جائیں تو وہ کیا نہیں کر سکتے۔ بقول اقبال:

ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی

سچ تو یہ ہے کہ جب امیر و غریب آقا و نوکر کے بچے ایک ساتھ پڑھیں گے تو امیر زادوں کو اگر ایک طرف غربت کی سنگینیوں کا اندازہ ہوگا اور اس طرح وہ ہندوستان کی ایک دوسری تصویر سے آشنائی حاصل کریں گے اور بڑی حد تک یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ ان کے دلوں میں التفات و نرمی کے جذبات پیدا ہوں گے اور انسانی ہمدردی پر مبنی ایک نیا شعور جنم لے گا تو دوسری طرف غریب بچوں کو جب یہ موقع ملے گا تو ان کے یہاں غربت و افلاس کے سچ فاصلے ہی کم نہ ہوں گے بلکہ احساسِ کمتری اور حسد کے جذبات میں بھی کمی آئے گی اور اس طرح ہندوستانی معاشرے میں ایک صحت مند معاشرتی رویّے کو فروغ حاصل ہوگا۔

اس ایکٹ میں کچھ اور بھی انقلابی اقدامات کی داغ بیل ڈالی گئی ہے۔ مثال کے طور پر پہلی سے آٹھویں تک بچوں کو فیل نہیں کیا جائے گا۔ اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی اس شرمندگی اور مایوسی سے جو طالب علم کی شخصیت کو دیمک کی طرح چاٹنے لگتی ہے، نجات حاصل ہو جائے گی، اس کا مطلب بقول شری کپل سبل: ''یہ نہیں ہے کہ بچوں کی اہلیت کا تجزیہ کرنے کے طریقوں کو ختم کر دیا جائے۔ آر ٹی ای ایک ایسے مسلسل اور جامع تجزیے کے طریقہ کار کو نافذ کرنے کی گنجائش فراہم کرتا ہے جو دھمکی آمیز نہ ہو، بچے کو ناکام ہونے کے خوف سے آزاد کرائے اور اساتذہ کو اس قابل بنا سکے کہ وہ بچوں کی سیکھنے کی اہلیت پر انفرادی توجہ دے پائیں۔'' بزنس آف اسٹینڈرڈ، دہلی 20 اپریل 2012

اس ایکٹ کا ایک اور انقلابی پہلو یہ ہے کہ اس کے ذریعہ بچوں کی جسمانی سزا اور انہیں ذہنی طور پر ہراساں کیے جانے پر پابندی لگا دی گئی ہے۔ اس سے قدیم سوچ کے حامل لوگوں کو اور خاص طور پر اسکول کے انتظامیہ اور اساتذہ کی بڑی تعداد کے مطابق اس سے طلبہ میں ڈسپلن شکنی کا رویہ پنپے گا اور نظم و ضبط کے مسائل بھی پیدا ہوں گے۔ دیکھا جائے تو بچے کی شخصیت کی تعمیر میں پیار زیادہ اہم رول ادا کرتا ہے۔ اور جیسا کہ اس ملک کے پہلے مسلمان صدر جمہوریہ مشہور ماہر تعلیم اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے معمار ڈاکٹر ذاکر حسین نے کہا تھا: ''اچھے استاذ کی پیشانی پر علم نہیں محبت کا عنوان ہوتا ہے۔'' اور ہمارے یہاں جامعہ ملیہ اسلامیہ جیسے نہ جانے کتنے ادارے ہیں جہاں یہ تجربہ کیا گیا اور سزا کے خوف سے زیادہ بہتر نتائج محبت کے ساتھ متعلقین نے ممکن کر دکھائے۔

آر ٹی ای کے اس ایکٹ کو لے کر ان اداروں میں بڑی بے چینی رہی جو مکاتب و مدارس اور پاٹھ شالاؤں کی صورت میں ابھی تک غریبوں میں تعلیم کو عام کرنے اور انہیں کم از کم خواندہ بنانے میں لگے ہوئے تھے۔ کیوں کہ سرکار نے اس ایکٹ کے ذریعہ کلاس روم کے جم اور اسی طرح کی جو دیگر شرائط عائد کی تھیں وہ ان کے متحمل ہی نہیں ہو سکتے تھے اور ان کا یہ اضطراب و احتجاج بڑی حد تک حق بجانب بھی تھا کیوں کہ جس محاذ پر سرکار چھ دہائیوں سے زیادہ عرصہ تک غافل رہی تھی بھی بورڈ یہ نشین تھے جنہوں نے ہمارے پس ماندہ ترین بلکہ خطِ افلاس سے نیچے زندگی گزارنے والے بچوں کو نہ صرف تعلیم دی بلکہ انہیں نصاب کی کتابیں، کھانا، کپڑا اور چھت تک فراہم کی اور یہ سب بھی بغیر کسی فیس و اجرت کے۔ یہ بڑی خوشی کی بات ہے اور اس کے لیے شری کپل سبل اور مرکزی حکومت بجا طور پر شکریے کے مستحق ہیں کہ انہوں نے ان کو ان شرائط سے مستثنیٰ کر دیا ہے اور اب وہ تمام بچے جو ان اداروں میں تعلیم حاصل کریں گے وہ بھی انہی بچوں کے برابر مانے جائیں گے جو سرکاری، پبلک اور امداد پانے والے تعلیمی اداروں میں داخلہ لیں گے۔



سیکولر جمہوری ہندوستان کے دستور کو نافذ کرتے وقت ہمارے قومی رہنماؤں نے ہندوستانی قوم سے یہ وعدہ کیا تھا کہ چھ سال سے چودہ سال کے بچوں کو تعلیم کی مفت فراہمی سرکار وں کی ذمہ داری ہوگی لیکن تاریخ کی یہ عجیب ستم ظریفی ہے کہ اس وعدے کے ایفا میں ایک دو نہیں پاسٹھ سال لگ گئے۔ اسے خوش بختی ہی کہئے کہ یہ شرف و سعادت ترقی پسند محاذ کے دوسرے پنج سالہ دور حکومت میں مرکزی وزیر برائے فروغ انسانی وسائل جناب کپل سبل جو ایک ماہر ٹکنون کا دماغ لیکن شاعر کا دل رکھتے ہیں کے حصے میں آئی

اس عمومی جائزہ کے بعد یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت ملک کی سب سے بڑی اقلیت مسلمانوں کے حوالہ سے بھی آر ٹی ای ایکٹ پر کچھ گفتگو کر لی جائے۔ مسلمان ایک مذہبی اور لسانی اقلیت کے طور پر، تعلیم اور اقتصادیات دونوں میدانوں میں تکلیف دہ حد تک پسماندگی کے شکار ہیں اور یہ وہ حقیقت ہے جس کا اعتراف واعادہ ڈاکٹر گوپال سنگھ پینل سے لے کر سچر کمیٹی رپورٹ تک ہر جگہ کیا گیا ہے اور یہ وہ ناقابل تردید سچائی ہے جس پر ہندوستان کی پارلیمنٹ نے بھی سچر کمیٹی رپورٹ کی توثیق کر کے اپنی مہر لگا دی ہے۔ آر ٹی ای ایکٹ ایک ایسی طاقت ہے جسے تعلیمی اعتبار سے کمزور طبقات سرکاروں کی اپنی تعلیمی ضرورتوں کے تئیں تساہلی، ان دیکھی اور غفلت کے خلاف ایک ہتھیار کے طور پر استعمال کر سکتے ہیں۔ اس لیے کہ یہ ایکٹ ہر ہندوستانی شہری کو بلا اختصاص مذہب و ملت یہ اختیار تفویض کرتا ہے کہ اگر سرکاریں، سرکاری تنظیمیں (جیسے لوکل باڈیز) اور سرکاری امداد اور رعایتیں پانے والے تعلیمی ادارے، ان کے ساتھ تفریق و امتیاز برتتے ہوئے ان کی تعلیمی ضرورتوں کی کفالت نہیں کرتے تو وہ ان کو عدالت کے کٹہرے میں لے جا کر کھڑا کر سکتے ہیں۔ یہ ایک سنہری اور نایاب موقع ہے کہ جب مسلمانوں اور دیگر کمزور طبقات کی قیادتوں کو گاؤں گاؤں، قصبہ قصبہ، قریہ قریہ، شہروں اور صوبوں اور قومی سطح تک آر ٹی ای ایکٹ کے تحت اپنے ہم مذہبوں اور ہم وطنوں کو جہالت کی تاریکیوں سے نکال کر ان کی زندگی میں علم کی روشنی پھیلانے کا کوئی بھی موقع اب نہیں گنوانا چاہیے کیوں کہ علم ہی وہ شاہ کلید ہے جو غریب و نادار انسانوں پر تمول و ثروت کے دروازے کھولتا ہے۔ اس لئے اس کے حصول کے لئے کسی بھی کوشش میں، ہماری انفرادی و اجتماعی سطح پر ذرا سی بھی کمی کوتاہی وہ مجرمانہ فعل ہوگی جسے وقت اور ہماری آئندہ آنے والی نسلیں بھی معاف نہیں کرے گی۔

پیشہ ورانہ تعلیمی لیاقت کا قومی خاکہ

(National Vocational Education Qualification Framework)





میلی شکلیں ڈھلا فن: مرادآباد کے یہ کاریگر NVEQF کے تحت اپنی پیشہ ورانہ لیاقت کو نکھار کر اپنے فن کی طرح خود کو بھی چمکا سکیں گے

روزگار کے مزید مواقع فراہم کرنے کے لیے حکومت نے ایسے اقدامات تجویز کیے ہیں جن سے ملک میں موجود پیشہ ورانہ صلاحیتوں میں مزید نکھار پیدا کر کے پیشہ ور ہنرمندوں اور دست کاروں کو قومی آمدنی کا ایک مضبوط ذریعہ بنایا جاسکے۔ اس سلسلے میں وزارت فروغ انسانی وسائل نے قومی پیشہ ورانہ تعلیمی لیاقتی خاکہ (NVEQF) کے نام سے ایسا تعلیمی خاکہ تیار کیا ہے جو مختلف تعلیمی لیاقتوں کو آپس میں جوڑ دے گا۔ یہ مشترکہ اصولوں اور مقررہ ہدایتوں پر مبنی ایک قومی سطح پر تسلیم شدہ پیشہ ورانہ تعلیم کا نظام قائم کرے گا جس میں اسکول پیشہ ورانہ تعلیمی ادارے اور اعلیٰ تعلیمی ادارے بھی شامل ہوں گے۔ یہ خاکہ موجودہ لیاقت کو تسلیم کرتے ہوئے ایک ایسے نظام کی بنیاد رکھے گا جس کے پروگرام ٹریننگ ڈیزائن، ڈلیوری موڈ سے لے کر مختلف قسم کے کورسز اور ان کی تربیت کے لیے مواقع فراہم کریں گے۔ اس خاکے کی خاص بات یہ ہوگی کہ یہ موجودہ جاب مارکٹ کو دھیان میں رکھتے ہوئے Competency Based Education اور ٹریننگ کا اہتمام کرے گا جس میں صنعتوں اور نوکریاں فراہم کرنے والوں کے درمیان قریبی شرکت داری اور باہمی تعاون رہے گا جس سے کورسز کی نشاندہی، تعلیمی مواد کی فراہمی، تربیت اور اساتذہ کی فراہمی سے لے کر تعین قدر (Assessment)، منظوری (Accreditation)، تصدیق (Certification)، روزگار (Placement) کے تمام تر مراحل شامل ہوں گے۔

NVEQF کے نافذ ہونے پر نہ صرف طالب علموں کو روایتی تعلیم سے پیشہ ورانہ تعلیم میں اور پیشہ ورانہ تعلیم سے روایتی تعلیم میں داخلے یا اندراج کا موقع ملے گا بلکہ طالب علموں کو یہ بھی سہولت فراہم ہوگی کہ وہ خاکے میں طے کیے گئے 10 لیولس میں سے کسی بھی لیول میں اپنی اہلیت اور قابلیت کے مطابق داخلہ لے سکیں گے وہیں اپنی سہولت کے مطابق کسی بھی لیول سے اخراج پا سکیں گے۔ یہ فریم ورک جہاں تعلیمی نظام میں شفافیت پیدا کرے گا وہیں طالب علموں کو افقی (Vertical) اور عمودی (Horizontal) تعمیر پذیری (Mobility) کا بھی موقع فراہم کرے گا۔

اس سلسلے میں ریاستوں اور (Central Advisory Board of Education-CABE) کے مشورے سے موجودہ اسکولی تعلیم میں تبدیلی لائی جارہی ہے اور اب گیارہویں، کے بجائے نویں جماعت سے ہی پیشہ ورانہ تعلیم کا نظام شروع کیا جائے گا۔ اس سلسلے میں ہریانہ اور مغربی بنگال میں 'پیشہ ورانہ ثانوی تعلیم' (Vocationalization of Secondary Education) کے تحت پائلٹ اسٹڈی (Pilot Study) چل رہی ہے جن کے کامیاب تجربے کے بعد اسے پورے ملک میں نافذ کیا جائے گا۔

ویسے بھی اس سچائی کو کبھی نہیں بھولنا چاہیے کہ سرکاریں تو کیا قرآن کے لفظوں میں خدا بھی ان لوگوں کی حالت نہیں بدلتا جن کو آپ اپنی حالت کے بدلنے کا خیال نہیں ہوتا۔

اسی طرح پرائمری تعلیم کے بارے میں مسلمہ اصول ہے کہ بچے کی ذہنی صلاحیت اور اس کے نشوونما کے لیے تعلیم مادری زبان میں ہونی چاہیے۔ دستور میں دفعہ 350 (A) میں اپنے بچے کی مادری زبان میں تعلیم کے حق کو والدین کے حقوق میں شامل کیا گیا ہے۔ اب آر ٹی ای ایکٹ کے تحت اردو بولنے والی لسانی اقلیت اپنی معتدبہ آبادی والے علاقوں میں اس طرح اردو کی تعلیم کو یقینی بنا سکتی ہے۔ اسی طرح خاص طور پر ان صوبوں میں جہاں تعلیمی منظرنامے سے اردو بالکل غائب کر دی گئی ہے۔ ہم اس کی بازیافت کر سکتے ہیں اور چوں کہ ہر 45 بچوں کی جماعت کو تعلیم دینے کے لیے ایک استاد کی تقرری لازمی ہوگی، اس طرح اردو اساتذہ کی بھرتی کو بھی ممکن بنایا جاسکتا ہے اور اردو کے لیے خوش گوار صورت حال پیدا ہو سکتی ہے۔ لیکن یہ کام گھر بیٹھے بیٹھے اخباروں میں بیان دے کر نہیں ہوجائے گا بلکہ اس کے لیے بڑے منظم اور منصوبہ بند طریقے سے اجتماعی سطح پر کوششیں کرنی ہوں گی۔

بہرحال آر ٹی ای ایکٹ اس ملک میں جہالت و ناخواندگی کے خلاف ایک نیا جہاد ہے۔ ضروری ہے کہ اس میں ہر ہندوستانی بڑھ چڑھ کر حصہ لے اور ہمارے قومی رہنماؤں اور جدوجہد آزادی کے سالاروں نے جو ایک ترقی پسند، متمدن، روشن خیال، علم دوست ہندوستان کا خواب دیکھا تھا، وہ شرمندۂ تعبیر ہو سکے۔

Prof. Akhtarul Wasey, Jamia Millia Islamia, New Delhi:110025
E-mail:wasey27@gmail.com



ہندوستان عالمی طاقت بننے کی راہ پر

ملک کے اولین وزیر اعظم اور جدید ہندوستان کے بانی جواہر لال نہرو نے اپنی زندگی میں ہندوستان کے مستقبل کو سائنسی و خلائی تحقیق سے جوڑنے کی جو کوششیں کی تھیں، وہ تمام تر نکتہ چینیوں کے باوجود آج، ان کی وفات کو نصف صدی بیت جانے کے بعد، نہ صرف بار آور ثابت ہو رہی ہیں بلکہ اکیسویں میں یہ عظیم الشان ملک اپنا واجب مقام حاصل کرنے کے جس سفر پر تیزی سے گامزن ہے اسے راستہ بھی دکھا رہی ہیں۔ تقریباً چالیس برس پہلے 19اپریل1973کو پہلے ہندوستانی مصنوعی سیارے 'آریہ بھٹ' کامیابی کے ساتھ خلا میں بھیجنے اور اسے زمینی مدار میں قائم کرنے سے شروع ہونے والا یہ سفر چار سال پہلے ہندوستانی راکٹ کی مدد سے چاند کی سر زمین پر قومی ترنگا لہرانے کی تاریخی منزل تک پہونچا اور اب اس لگاتار جاری سفر نے ہمارے دفاعی نظام کو اس مقام تک پہنچا دیا ہے جہاں ہم دنیا کی سب سے بڑی عسکری اور اقتصادی طاقت بننے کی منزل پر اپنی نگاہیں جما سکتے ہیں۔ 19اپریل اور26اپریل، رواں سال کی وہ دو تاریخیں ہیں، بلکہ یہ وہ تاریخی ہفتہ ہے جس نے ہمیں پانچ بڑی عالمی طاقتوں کے شانہ بشانہ لاکر کھڑا کر دیا ہے۔ جوہری قوت تو ہم بن ہی چکے تھے، لیکن اس بار ہمارے سائنس دانوں نے ہمیں اس قوت کے استعمال کی استطاعت بھی بخش دی ہے۔19اپریل کو ایک براعظم سے دوسرے براعظم تک وار کرنے والے ہندوستانی میزائل 'اگنی-5' کا کامیاب تجربہ اور 26اپریل کو پی ایس ایل وی پروگرام کے تحت اب تک کے سب سے بڑے مصنوعی سیارے RISAT-1 کو زمینی مدار میں قائم کیا جانا وہ اہم واقعے ہیں جنہیں سائنسی و خلائی تحقیق کی ہماری تاریخ ہمیشہ یاد رکھے گی۔ زیر نظر صفحات پر ملاحظہ کیجیے 'اگنی-5' کے تجربے اور پی ایس ایل وی کی تازہ کامیابی کی داستان!

ادارہ

وقت کبھی نہیں رکتا۔ گھڑی ہمیشہ چلتی رہتی ہے لیکن اس گزرتے وقت میں کوئی لمحہ ایسا ہوتا ہے جو ہمیشہ کے لیے جاوداں ہو جاتا ہے۔ تاریخ رقم کر جاتا ہے اور انتہا اس کے بعد میں ہمیشہ کے لیے امر ہو جاتا ہے۔

19/اپریل 2012 صبح 8 بج کر 7 منٹ ایک ایسا وقت ہے جس نے ہندوستان کو میزائل کی دنیا کی ان بلندیوں تک پہنچا دیا جہاں تک صرف چار سپر طاقتیں ہی پہنچ پائی ہیں۔ اڑیسہ کے ساحل پر وہیلرز جزیرہ سے لمبی دوری تک مار کرنے والے بین براعظمی بلاسٹک میزائل اگنی-V کا کامیاب تجربہ کیا گیا۔ پانچ ہزار کلومیٹر کا اس کا سفر پروگرام کے عین مطابق اختتام پذیر ہوا۔ اس دوران داغے جانے، اوپر سے نیچے آنے اور ٹھیک بنگال میں گرنے تک تینوں مراحل اس نے مناسب وقت پر طے کیے۔

اب تک لمبی دوری تک مار کرنے والے میزائل کی صلاحیت صرف امریکہ، فرانس، روس اور چین کے پاس تھی۔ 5000 کلومیٹر تک نشانہ لگانے والے اس میزائل میں ایک ٹن سے زائد انٹی مادہ لے جانے کی صلاحیت ہے۔ پچاس ٹن وزنی یہ میزائل 17 میٹر لمبا اور دو میٹر چوڑا ہے۔ سطح سے سطح پر مار کرنے والے اگنی V کا کل وزن 50 ٹن ہے۔ گولی سے زیادہ تیز رفتار سے چلنے والا یہ میزائل 5000 کلومیٹر کا فاصلہ محض 20 منٹ میں طے کر سکتا

ہے۔ اس میزائل کی نشانہ لگانے کی صلاحیت غضب کی ہے۔ 5000 کلومیٹر دور ڈیڑھ میٹر کے ہدف یعنی ایک کار پر یہ میزائل بے چوک نشانہ لگا سکتا ہے۔ اب تک جو میزائل تیار کیے گئے تھے وہ 3500 کلومیٹر فاصلے تک محدود تھے۔ جس کی حد میں صرف پاکستان یا دیگر قریبی ممالک آتے تھے لیکن اس طویل فاصلے والے میزائل سے امریکہ کو چھوڑ کر چین، اشتراکی یوروپ، مشرقی افریقہ اور آسٹریلیا تک نشانہ لگایا جا سکتا ہے۔ اگنی V کا تجربہ چین سے ملنے والے خطرے کے سدباب کے پیش نظر کیا گیا ہے۔

1962 میں چین سے جنگ میں شکست کے بعد ملک میں دفاع پر خصوصی دھیان دیا گیا۔ اسی کے پیش نظر اور وقت کے تقاضوں کے مطابق خلائی ٹکنالوجی کو فروغ دیا گیا۔ منصوبہ بند طریقے پر ملک میں خلائی پروگرام 1967 میں شروع ہوا اور 1972 میں پہلا خلائی راکٹ روہنی خلا میں داغا گیا۔ ٹھوس ایندھن والے روہنی کے کامیاب تجربے کے بعد 1979 میں ہندوستان نے 17 ٹن وزنی SLV-3 (ایس ایل وی-3) مدار میں داغا۔ یہ سیارچہ 100 کلوگرام وزن کے ساتھ کامیابی کے ساتھ 334 کلومیٹر اوپر خلا میں داخل ہوا۔ 1980 میں روہنی II کرۂ عرض کے مدار میں بھیجا گیا۔ بعد میں ان خلائی پروگراموں میں ترقی کے ساتھ ساتھ سیارچوں کی صلاحیتوں میں اضافہ ہوتا گیا۔

ملک کے دفاعی ادارے دفاعی تحقیق و ترقی تنظیم DRDO نے وقت کے تقاضوں کو بھانپا اور فوج کے لیے میزائل پروگرام شروع کرنے کا فیصلہ کیا۔ دراصل ہندوستان کا میزائل پروگرام اس کے خلائی پروگرام کی ہی ایک ترقی یافتہ شکل ہے جس میں ضروری ردوبدل کر کے اس کو دفاعی ضروریات کے مطابق ڈھالا گیا ہے۔ 1983 میں اینٹگریٹیڈ گائڈڈ میزائل بنانے کا فیصلہ کیا گیا۔ اس تنظیم کا مقصد فوج کے تینوں دھڑوں یعنی بحری، بری اور ہوائی افواج کے لیے اینٹگریٹیڈ میزائلوں کی ایسی کھیپ تیار کرنا تھا جسے ملک میں ہی ڈیزائن کیا جا سکے اس پروگرام کو شروع کرنے میں ہمارے سائنسدانوں نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ ان سائنسدانوں میں دفاعی تحقیق و ترقی تنظیم (DRDO) کا کلیدی رول ہے۔ اس ادارے کے سربراہ جناب وی کے سرسوت (VK Saraswat) کے مطابق اگنی-V کے کامیاب تجربے سے ہمارا ملک بھی جدید اسلحہ والے ممالک مثلاً برطانیہ، چین، امریکہ، فرانس اور روس کے برابر آ گیا ہے جن کے پاس بھی بین براعظمی میزائل موجود ہیں۔ جناب سرسوت کا دعویٰ ہے کہ اگنی-V



ڈی آر ڈی او اور دفاعی تحقیقی مرکز کے سائنس دانوں کو اگنی 5 کے کامیاب تجربے کے لیے میں مبارکباد دیتی ہوں۔

صدر جمہوریہ: پرتبھا دیوی سنگھ پاٹل



اگنی 5 میزائل کے کامیاب تجربے سے مجھے بے حد خوشی ہوئی۔ سائنس دانوں نے ملک کا سر فخر سے بلند کر دیا۔

نائب صدر جمہوریہ: حامد انصاری



پورے ملک کی جانب سے مبارک باد۔ دفاعی تیاریوں کی جانب یہ بڑی حصولیابی ہے۔

وزیر اعظم: ڈاکٹر منموہن سنگھ



آئی سی بی ایم کی صدلاحیت والے ممالک میں شامل ہونے سے ملک کا وقار بلند ہوا ہے۔

وزیر دفاع: اے کے انٹونی

تکنیک کے لحاظ سے امریکہ کو چھوڑ کر دیگر ممالک کے مماثل میزائلوں سے بہتر ہے۔ اس میں استعمال ٹکنالوجی اور وہ اہم پرزے ہیں جو اس جیسے دیگر میزائلوں میں نہیں ہیں۔ اگنی-V میں کمپوزٹ راکٹ موٹر، رنگ لیوٹر گائڈنس اور ہدف تک پہنچنے کے لیے نیوٹلیشن نظام، میزائل کی رفتار معلوم کرنے کے لیے ایکسیلو میٹر جو رفتار میں تغیر کی نشاندہی بھی کر سکتا ہے اس میزائل کی خصوصیات ہیں۔ اس کے علاوہ میزائل کے وزن کو کم سے کم رکھنے کے لیے خصوصی کمپوزٹ کا استعمال کیا گیا ہے۔ دراصل اگنی-III میں منی ایچر اسٹیج کا اضافہ کر کے اس کے نشانہ لگانے کی صلاحیت کو 3500 کلومیٹر سے بڑھا کر 5000 کلومیٹر کیا گیا ہے۔ اگنی-V درحقیقت اگنی-III کی ہی ایک بہتر شکل ہے۔ دفاعی تحقیق و ترقی تنظیم کے ماتحت کام کرنے والے ایک دیگر ادارے یعنی ایڈوانسڈ سسٹم لیباریٹری کے ڈائریکٹر اویناش چندر جو اگنی میزائل کی تیاری میں شامل ہیں کے مطابق اگنی-V کا تیسرا مرحلہ ایک بہت بڑا چیلنج تھا۔ اس مرحلے میں سلنڈریکل موٹر کی بجائے کونیکل موٹر کا استعمال کیا گیا ہے جو اس کی کامیابی کی ایک اہم وجہ ہے۔ اس کے علاوہ اگنی-V کی خصوصیات میں ٹھوس ایندھن کا استعمال بھی ہے جس کی وجہ سے اسے بہت کم وقت میں لانچ کیا جا سکتا ہے۔ مزید یہ کہ اس کے لانچر سڑک کے راستے سے ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کیے جا سکتے ہیں اور جنگ کی صورت میں ان کو تلاش کر کے تباہ کرنا آسان نہیں ہے۔

اگنی-V بین براعظمی بلاسٹک میزائل ہے جو 5000 کلومیٹر تک نشانہ لگا سکتا ہے۔ یعنی اس کے حد میں چین تک کے علاقے آ سکتے ہیں جس کی وجہ سے اس میزائل کو چین کے لیے مخصوص سمجھا جا رہا ہے۔ اگرچہ اس میزائل پر اسلحہ کا وزن اگر کم کر دیا جائے تو وہ فاصلہ 5000 کلومیٹر سے بھی زیادہ ہو سکتا ہے۔ اس سے پہلے جو میزائل تیار کیا گیا تھا وہ اگنی III تھا اور جو ایک درمیانہ فاصلے تک مار کرنے والا میزائل ہے جس کی صلاحیت 3500 کلومیٹر تک کے ہدف کو نشانہ بنانے کی ہے۔ اس دو مرحلے والے میزائل کو چین کی طرف سے پیدا ہونے والے خطرے کے پیش نظر تیار کیا گیا تھا لیکن اس فاصلے سے یہ تبت یا چین کے دیگر قریبی علاقوں کو بھی نشانہ بنا سکتا ہے۔ اس میزائل میں تقریباً 2500 کلو وزن لے جانے کی صلاحیت ہے۔ لیکن اس کو آسانی سے ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کیا جا سکتا ہے اور زمین یا زمین پر مختلف سطحوں سے داغا جا سکتا ہے۔

ملک میں میزائل پروگرام کا آغاز 80 کی دہائی میں ہوا۔ پہلے قلیل فاصلے تک درمیانہ فاصلہ طے کرنے والے میزائل تیار ہوئے اس کے بعد طویل فاصلہ اور پھر بین براعظمی میزائل تیار ہوئے۔ تقریباً چار دہائیوں کے اس سفر میں ہم اگنی-V تک پہنچے ہیں۔ اس میں مزید بہتری کی ضرورت ہے۔ امید ہے کہ ہمارا اگلا میزائل دس ہزار اور اس سے زیادہ فاصلے والے بین براعظمی میزائل ہوگا جس کی حد میں دنیا کے بیشتر ممالک آ جائیں گے۔ فاصلے کے علاوہ جس خطے میں بہتری کی ضرورت ہے وہ ہے اس کی نشانہ لگانے کی صلاحیت اور وزن لے جانے کی قوت۔ اگنی-V کو ابھی سطح زمین یا کسی اسٹیشن سے داغا جا سکتا ہے جبکہ ضرورت اس بات کی ہے کہ میزائل کو سڑک، ریل، پن ڈبی، جہاز یا طیارے سے کہیں سے بھی داغا جا سکے۔ امید ہے ہمارا اگلا میزائل دشمن کے خلا میں موجود سیارچوں کو بھی نشانہ بنا سکے گا اور اس میں ایک سے زیادہ اہداف کو نشانہ بنانے اور ایک سے زیادہ اسلحہ لے جانے کی صلاحیت ہوگی۔

اگنی-V کے کامیاب تجربے پر مختلف ممالک نے اپنے اپنے انداز میں ردعمل ظاہر کیا ہے۔ پڑوسی چین اگنی-V کی نشانہ لگانے اور دیگر صلاحیتوں پر خدشہ کا اظہار کیا ہے۔ چین کے سرکاری ٹیلی ویژن نے کہا ہے کہ جتنا وزن اس میزائل کا بتایا گیا ہے اس سے یہ صرف ایک

اسٹیشن سے ہی داغا جاسکتا ہے۔ اور اسی وجہ سے یہ نشانے کی زد میں آسانی سے آسکتا ہے۔ اس کے علاوہ چینی حکومت نے کہا ہے کہ یہ تجربہ حال ہی میں نئی دہلی میں منعقد ہوئی ہرکس جوتی کانفرنس کے دوران پیدا ہوئے باہمی تعاون کی فضا کو مکدر کرسکتا ہے۔ اگر چہ چینی ماہرین نے کہا ہے کہ ہندوستان نے اگنی-V کی صلاحیت کم کرکے بتائی ہے اس کی صلاحیت 5000 کلومیٹر نہیں بلکہ 8000 کلومیٹر فاصلہ کی ہے۔ اس کے برعکس امریکہ نے اپنے ردعمل کے اظہار میں احتیاط سے کام لیا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ وہ ہندوستان کا جوہری عدم پھیلاؤ کا ریکارڈ شاندار رہا ہے۔ یہ بات اس کے 1974 میں 1998 میں ہندوستان کی طرف سے کیے گئے جوہری تجربوں پر کیے گئے ردعمل کے بالکل برعکس ہے جس میں اس نے ہندوستان کے خلاف اقتصادی پابندیاں عائد کردی تھیں۔ بین الاقوامی مبصرین کے مطابق اگنی-V کا تجربہ چین کے ساتھ توازن پیدا کرنے کے واحد مقصد سے ہی نہیں کیا گیا۔ بلکہ اس کا اثر دونوں ممالک کے دفاعی تعلقات پر بھی پڑ سکتا ہے جس سے باہمی تعلقات میں ترشی اور اسلحہ کی دوڑ شروع ہونے کا بھی خدشہ پیدا ہوسکتا ہے۔

پڑوسی ملک پاکستان کے ردعمل کا فطری اظہار ایک دن بعد طویل دوری تک مار کرنے والے بیلسٹک میزائل ہتف -4 (شاہین ایک الفا) کے کامیاب تجربے سے ہوا۔ 750 سے 1000 کلومیٹر کی دوری تک حملہ کرنے کی صلاحیت رکھنے والے اس میزائل کا تجربہ بحر ہند میں 25 اپریل کو کیا گیا۔ ہتف -4 اپنے ساتھ 700 کلوگرام نیوکلیائی اسلحہ لے جانے کا اہل ہے اور یہ ہندوستان کے کافی اندر تک نشانہ لگاسکتا ہے۔

میزائل اور بم میں فرق:

میزائل اور بم میں بہت زیادہ فرق نہیں ہے۔ میزائل کو بم کی ترقی یافتہ شکل قرار دیا جاسکتا ہے۔ ایک مرتبہ داغے جانے کے بعد بم پر سوائے کشش ثقل کے اور کوئی قوت کارگر نہیں ہوتی۔ اگر بم کو ہوا میں اڑانے کے لیے اس میں ایک ہوائی نظام فٹ کردیا جائے تو وہ ایک راکٹ کا کام کرتا ہے۔ اور اگر راکٹ کنٹرول کرنے یا اس کو گائیڈ کرنے کا طریقہ استعمال کیا جائے تو وہ میزائل کی شکل اختیار کرلیتا ہے۔ میزائلوں کو مختلف زمروں میں بانٹا جاسکتا ہے۔ مثلاً سطح سے سطح پر مار کرنے والے میزائل۔ سطح سے فضا میں مار کرنے والے میزائل، فضا سے سطح پر مار کرنے والے میزائل وغیرہ۔

بیلسٹک اور کروز میزائل

بیلسٹک میزائل سے طے شدہ ہدف کو بھی نشانہ بنایا جاسکتا ہے۔ اس کو اس طرح داغا جاتا ہے کہ وہ پہلے مرحلے میں مطلوبہ رفتار حاصل کرنے کے لیے اپنے ایندھن کا بیشتر حصہ استعمال کرلیتا ہے۔ کسی بھی بیلسٹک میزائل کو آسانی سے تلاش تو کیا جاسکتا ہے لیکن اس کو دوران اڑان روکا یا ضائع نہیں کیا جاسکتا۔

بیلسٹک میزائل کے برعکس کروز میزائل ایک طرح کا



اگنی-5 میزائل، داغے جانے سے پہلے تجربہ گاہ میں

بنا پائلٹ والا چھوٹا سا طیارہ ہے جس میں اسلحہ لے جانے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ اس میزائل میں انجن بھی ہوتا ہے اور پرواز کے لیے بازو بھی۔ کروز میزائل کو چلانے کے لیے طیاروں میں زیر استعمال آنے والے انٹرٹیشل نیویگیشن نظام کا استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کا نشانہ اچوک ہوتا ہے اور چھوٹے چھوٹے اہداف مثلاً کھڑکی، دروازے وغیرہ کو با آسانی نشانہ بنا سکتا ہے۔ ہندوستان میں اگنی اور پرہوی بیلسٹک میزائل ہیں جبکہ برہموس کروز میزائل ہے۔

کیا میزائل دوران عمل ضائع کیے جاسکتے ہیں

کوئی بھی ایسا طریقہ جس سے میزائل دریافت اور ضائع کیا جاسکے۔ میزائل دفاعی نظام (MDS) کہلاتا ہے۔ اس میزائل شکن نظام سے نیوکلیسائی حملے کو روکا جا سکتا ہے اور اس لیے اس میزائل دفاعی نظام کا استعمال بیلسٹک میزائلوں کے خلاف کیا جاسکتا ہے۔ اب تک دنیا کے صرف دو ممالک یعنی امریکہ اور روس ہی ایسے ممالک ہیں جنھوں نے نیوکلیائی اسلحہ بردار کروز میزائل تیار کرکے ہیں۔

اگر چہ بیلسٹک میزائل کو دوران پرواز کسی بھی مرحلے یعنی، میزائل داغے جانے کے درمیان اور آخری وقت تک روکا جاسکتا ہے لیکن یہ سب تکنیکی طور پر ہی معلوم ہوا ہے۔ اس بات کا صحیح اندازہ تجربہ کے بعد ہی لگایا جاسکتا ہے جو خدا کا شکر ہے، اب تک نہیں ہوا ہے۔

ہندوستان کے چند میزائل

اگنی -V : سطح سے سطح تک مار کرنے والا 5000 کلو میٹر تک نشانہ لگانے کی صلاحیت۔ ڈیڑھ ٹن وزن کے جوہری اسلحے لے جانے کی صلاحیت۔ اس کے مختلف ماڈل مختلف صلاحیتوں کے حامل ہیں۔

ترشول: سطح سے فضا میں قلیل فاصلہ تک نشانہ لگانے والا میزائل 300 سے 500 میٹر کی اونچائی پر اڑنے والے طیاروں کے خلاف کاروائی کی صلاحیت۔

آکاش: سطح سے فضا میں نشانہ لگانے والا درمیانہ فاصلے کا میزائل جس میں 55 کلوگرام وزن لے جانے کی صلاحیت ہے۔ جس سے ایک ہی وقت میں 25 کلومیٹر فاصلہ تک 5 نشانے لگائے جاسکتے ہیں۔

ناگ: توپ شکن میزائل ملک میں تیار یہ میزائل 4 سے 8 کلومیٹر تک نشانہ لگاسکتا ہے۔

پرتھوی: سطح سے سطح پر مار کرنے والا جنگی میزائل۔ دو انجن والے اس میزائل میں رقیق ایندھن استعمال ہوتا ہے۔ یہ دنیا بھر کے مماثل میزائلوں میں سب سے زیادہ خطرناک ہے۔ اس میں مختلف قسم کا اسلحہ لے جایا جاسکتا ہے۔

برہموس: روس کی شراکت سے تیار کیا گیا یہ میزائل آواز کی رفتار سے تین گنا سے بھی زیادہ تیز رفتار سے چلنے والا امریکہ کے ٹام ہاک سے بھی زیادہ تیز رفتار سے چلنے والا یہ توپ شکن میزائل ہے۔

دھنش: سطح آب سے داغا جانے والا قلیل فاصلے تک نشانہ لگانے والے اس میزائل کی کئی تجرباتی پروازیں ہوچکی ہیں۔ یہ پرتھوی کی ایک تبدیل شدہ شکل ہے۔ یہ 300 کلومیٹر تک مار کرسکتا ہے۔

Naseem Ahmad, Principal Publication Officer, NCPUL, New Delhi

3/21/2018 P21.jpg (3524×4728)

ہادی رہبر

ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں!



ہندستانی خلائی تحقیقاتی تنظیم اسرو (ISRO) ہندوستان کی قومی سطح کا خلائی تحقیقاتی ادارہ ہے جس کا مرکز بنگلور میں ہے۔ اس تحقیقاتی ادارے میں لگ بھگ 17000 ہزار ملازمین اور سائنس داں اپنی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ خلائی ادارے کا اہم کام ملک کے لیے خلائی تنصیبات مہیا کرانا ہے۔ اس کے اہم مقاصد میں سیاروں تک پہنچنے اور زمینی مدار کو وسعت دینا شامل ہے۔

بھارت کا خلائی تجربہ بہت پرانا ہے۔ جب راکٹ آتش بازی کی شکل میں پہلی بار استعمال ہوا جو کہ پڑوسی ملک چین کی ایجاد ہے تب سے دونوں ممالک میں تجارتی تعلقات کی وجہ سے صنعتوں اور دیگر ضروری اشیا کی خرید وفروخت کے ساتھ ساتھ سائنسی اور علمی مباحث کا سلسلہ بھی چلتا رہا ہے۔

ہندوستان میں سب سے پہلے ٹیپو سلطان نے میسور کی جنگ میں انگریزوں کو شکست دینے کے لیے راکٹ کا استعمال کیا۔ اسے دیکھ کر ولیم کانگریو بہت متاثر ہوا، اس نے 1804 میں کانگریو راکٹ کا ایجاد کیا جو آج کے جدید توپ خانوں کی بنیاد مانا جاتا ہے، 1947 میں انگریزوں کی غلامی سے آزاد ہونے کے بعد ہندوستانی سائنسدانوں اور سیاست دانوں نے ہندوستان کی راکٹ تکنیک کے حفاظتی استعمال، تحقیق، توسیع کے لیے کام کرنا شروع کردیا۔ ہندوستان کی کثیر آبادی کو مدنظر رکھتے ہوئے مواصلات کے میدان میں مصنوعی سیاروں کی اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے ملک میں خلائی تحقیقاتی تنظیم کی بنیاد 1960 میں رکھی گئی۔

ہندوستانی خلائی پروگرام ڈاکٹر وکرم سارا بھائی کے خوابوں کی تعبیر ہے جن کو ہندوستانی خلائی پروگرام کا بنیاد گزار تسلیم کیا جاتا ہے۔ 1957 میں روس کے اسپتنک Sputnic تجربے کے بعد انھوں نے مصنوعی سیاروں کی اہمیت کو سمجھ لیا تھا۔ ملک کے پہلے وزیراعظم جواہر لال نہرو نے ہندوستان کے مستقبل کو سائنسی ترقی کے ساتھ جوڑ کر دیکھنا شروع کر دیا تھا۔ 1961 میں خلائی تحقیقات کو جوہری توانائی کے شعبے کی نگرانی میں رکھا گیا۔ شعبہ جوہری توانائی کے سربراہ ہومی بھابھا نے جو کہ ہندوستانی جوہری توانائی پروگرام کے بنیاد گزار بھی ہیں 1962 میں خلائی تحقیقات کے لیے ہندوستانی قومی سوسائٹی انکوسپار (Incospar) کی بنیاد رکھی، جس میں ڈاکٹر سارا بھائی کی بطور چیئرمین تقرری عمل میں آئی۔

جاپان اور یوروپ کے برعکس ہر اہم خلائی پروگرام کو ہندوستان نے اپنی طاقت بڑھانے کی بجائے مصنوعی سیارے خلا میں بھیجنے اور خود اپنے راکٹ لانچ کرنے کی صلاحیت پیدا کرنے کے مقصد سے کیا۔ 1962 میں ہندوستان نے اپنا خلائی پروگرام پہلے دن سے ہی تحقیقی راکٹ کو لانچ کرنے سے شروع کیا۔ اس کام میں خط استوا Mediterraneanline سے ہندوستان کی نزدیکی کرشماتی ثابت ہوئی۔ یہ سبھی خطِ استوائی راکٹ تحقیقاتی مرکز سے لانچ کیے گئے جو کہ جنوبی کیرل میں ترونت پورم کے نزدیک واقع ہے۔ ابتدا میں امریکہ اور فرانس کے تحقیقی راکٹ نائک اپاچے اور کیٹلور کی طرح باہری دباؤ کا مطالعہ کرنے کے لیے لانچ کیے گئے۔ جب تک بحرالکاہل میں جہاز سے متعلق تحقیقی راکٹ بھیجنے کا سلسلہ جاری رہا، یہ برطانیہ اور روس کے راکٹوں کی طرز پر بنائے گئے۔ پھر بھی پہلے دن سے ہی خلائی پروگرام کی ترقی پذیر دیسی تکنیک بہت ہی بہتر اور اہمیت کی حامل تھی۔ اس کے پیش نظر ہندوستان نے ٹھوس ایندھن کا استعمال کرکے اپنے تحقیقی راکٹ سلسلے کی تعمیر و توسیع شروع کردی جسے روہنی Rohni کا نام دیا گیا۔

ہندستانی تحقیقی پروگرام نے دیسی تکنیک کی اہمیت اور خام مواد اور تکنیکی سپلائی کی مستقبل میں ہونے والی کمی کو محسوس کیا، نتیجے کے طور پر ہر خام مواد اور سپلائی، راستوں اور تکنیک پر قابو کی کوششیں شروع ہوئیں۔ جیسے جیسے ہندستانی روہنی پروگرام کے زیادہ بہتر اور وسعت پذیر راکٹ لانچ کیے، خلائی پروگرام ترقی کرتا چلا گیا، اور اسے شعبہ جوہری توانائی کی ماتحتی سے ہٹا کر ایک الگ خود مختار سرکاری شعبہ بنا دیا گیا۔ شعبہ جوہری توانائی کے زیر اہتمام انکوسپار پروگرام کو جو کہ 1961 میں شروع ہوا تھا ہندستانی خلائی تحقیقاتی تنظیم انڈین اسپیس ریسرچ آرگنائزیشن ISRO کا نام دے کر جون 1972 میں علاحدہ خلائی شعبے کی بنیاد رکھی گئی۔

1960 کی دہائی میں ڈاکٹر سارا بھائی نے ٹیلی ویژن کے براہِ راست نشریہ کے لیے تجربوں میں لائے جانے والے مصنوعی سیاروں کی اہمیت کے سیاق میں امریکی خلائی ادارے ناسا NASA کے ساتھ ابتدائی مطالعے میں حصہ لیا، مطالعے کے دوران یہ انکشاف ہوا کہ نشریہ کے لیے یہ سب سے سستا اور آسان ذریعہ ہے۔ ابتدا سے ہی سیاروں کو ہندوستان میں لانے کے فائدے کو ذہن میں رکھ کر سارا بھائی اور اسرو نے مل کر ایک آزاد راکٹ موٹر کی تعمیر کی، جو کہ مصنوعی سیاروں کو مدار میں نصب کرنے اور مستقبل میں بڑے راکٹ موٹروں کی تعمیر کے لیے ضروری

http://urducouncil.nic.in/Urdu-Duniya/Urdu-Duniya-June-2012/P21.jpg 1/1

آریہ بھٹ

خلائی سائنس میں ہندوستانی سفر کے اہم سنگ میل





- 1962 شعبہ جوہری توانائی کے ذریعے خلائی تحقیق کے لیے ایک قومی سوسائٹی کا انعقاد، اور تروویدرم کے نزدیک تھمبا میں راکٹ لانچ گاہ کی ترقی کے راستے میں پہلی کوشش کا آغاز۔
- 1963 تھمبا سے (21 نومبر 1963) کو پہلا راکٹ لانچ۔
- 1964 تھمبا میں خلائی سائنس اور تکنیکی مرکز کا قیام۔
- 1967 احمد آباد میں مرکز برائے مواصلاتی سیارہ نظام کا قیام۔
- 1972 خلائی کمیشن اور شعبہ خلا کا قیام
- 1974 پہلے ہندوستانی سیارہ آریہ بھٹ کے 19 اپریل 1973 کو لانچنگ۔
- 1976 سیاروں کے ذریعے پہلی بار تعلیم دینے کا تجرباتی قدم۔
- 1979 ایک تجرباتی سیارہ بھاسکر کی لانچنگ۔ سیارہ روہنی کا پہلا تجرباتی جائزہ موڈ ایس ایل وی 3 کی مدد سے لانچ ناکام۔
- 1980 ایس ایل وی 3 کی مدد سے روہنی سیارہ کامیابی کے سات مدار میں نصب۔
- 1981 اپنل نام کا زمین سائنسی ترسیلی سیارے کا کامیاب ترین لانچ۔ نومبر میں بھاسکر 2 کی لانچنگ۔
- 1982 انسیٹ-اے 1 کی اپریل میں لانچنگ اور ستمبر میں غیر فعال بنانا۔
- 1983 ایس ایل وی-3 کی دوسری لانچنگ اور مشق کے کام آ سکے۔ روسی طرز کے ساتھ ٹھوس ایندھن والے موٹر بنانے میں ہندوستان کی اہلیت کو پرکھتے ہوئے دوسرے ممالک نے بھی مساوی پروگرام کے لیے ٹھوس ایندھن راکٹ کے استعمال کو بہتر سمجھا اور اسرو نے مصنوعی سیارہ خلا میں بھیجنے والی گاڑی یا سٹیلائٹ لانچ وہیکل (ایس ایل وی) کی تیاری شروع کی۔

اس دوران ہندوستان نے مستقبل میں ترسیل کی ضرورت اور مواصلات کے مستقبل پر نگاہ رکھتے ہوئے آر ایس۔ ڈی-2 کو مدار میں نصب انسیٹ-1 بی کی کامیاب لانچنگ۔

- 1984 بھارت اور سوویت روس کے ذریعے مشترکہ خلائی سفر میں راکیش شرما کا پہلا ہندوستانی خلائی سفر۔
- 1987 ایس ایل وی کا ایس آر او ایس ایس 1 سیارے کی لانچنگ۔
- 1988 بھارت کا پہلا آئی آر ایس 1 اے کی لانچنگ۔ انسیٹ 1 سی کی جولائی میں لانچنگ۔ نومبر میں ترک۔
- 1990 انسیٹ-1 ڈی کی کامیاب لانچنگ۔
- 1991 اگست میں دوسرا سیارہ آئی آر ایس ایس 1 بی کی لانچنگ۔



راکیش شرما

- 1992 ایس آر او سی۔ سی کے ساتھ ایس ایل وی کے ذریعے تیسری لانچنگ مئی میں۔ پوری طرح سے دیسی تکنیکی سے بنا سیارہ۔ انسیٹ 2 کا کامیاب لانچنگ۔
- 1993 انسیٹ-2 بی کی جولائی میں کامیابی لانچنگ۔ پی ایس ایل وی کے ذریعے سیارہ آئی آر ایس سیارے کے لیے تکنیکی ترقی کی شروعات کی۔ بھارت نے اپنا پہلا خلائی سفر 1974 میں روس کی مدد سے تب شروع کیا جب اس نے اپنا تیار کیا ہوا پہلا مصنوعی سیارہ آریہ بھٹ روسی راکٹ لانچر کے ذریعے خلا میں بھیجا۔ 1979-80 تک تھصیب نو کے سلسلے میں دوسرے مرحلے کا راکٹ لانچر ایس ایل وی تو تیش دھون خلائی مرکز سے لانچ ہونے کے لیے تیار ہو چکا تھا۔ مگر دوسری سطح کی ناکامی کی وجہ سے اس کا یہ پہلا تجربہ کامیاب نہیں ہو پایا۔ تاہم 1980 تک اس مسئلے کا حل تلاش کر لیا گیا۔

سوویت روس کے ساتھ ہندوستان کے پوسٹر تکنیک کے میدان میں اشتراک و تعاون کو امریکہ نے جوہری توانائی توسیع کا مدعا بنا کر زبردست مخالفت کی۔ 1992 میں ہندوستانی تنظیم اسرو اور سوویت یونین روس کی تنظیم گلاوکاس موس پر پابندی کی دھمکی دی گئی۔ ان دھمکیوں کی وجہ سے سوویت یونین پیچھے ہٹ گیا۔ سوویت یونین کرایوجینک لیکوڈ راکٹ انجن تو ہندوستان کو دینے کے لیے تیار تھا لیکن

- 1994 مئی میں ایس ایس ایل وی کا چوتھا کامیاب تجربہ۔
- 1995 دسمبر میں انسیٹ -2 سی کی لانچنگ، تیسرے آئی آر ایس ایس سیارے کا کامیاب تجربہ۔
- 1996 تیسرے ہندوستانی آئی آر ایس ایس-پی 3 کا پی ایس ایل وی کی مدد سے مارچ میں کامیاب تجربہ۔
- 1997 جون میں راکٹ انسیٹ-2 کا اکتوبر میں خراب ہونا۔ ستمبر میں پی ایس ایل وی کی مدد سے ہندوستانی سیارہ آئی آر ایس ایس-1 ڈی کا کامیاب تجربہ۔
- 1999 انسیٹ-2 ای، انسیٹ-2 سلسلے کی آخری سیارے کا فرانس سے کامیاب تجربہ۔ ہندوستانی سیارہ آئی آر ایس ایس-پی 4 کا شری ہری کوٹہ تجربہ گاہ سے کامیاب تجربہ۔ پہلی بار بھارت سے غیر ملکی سیاروں کا تجربہ۔ جنوبی کوریا کے کے ایٹ-3 اور جرمنی کے ڈی سی آر-ٹوب میٹ کا کامیاب تجربہ۔
- 2000 انسیٹ-3 بی کا 22 مارچ 2000 کو کامیاب تجربہ۔
- 2001 جی ایس ایل وی۔ ڈی 1 کا تجربہ جزوی کامیابی 2002 جنوری میں انسیٹ-3 سی کا کامیاب تجربہ، پی ایس ایل وی-سی 4 کے ذریعے کلپنا-1 کا ستمبر میں تجربہ۔
- 2004 جی ایس ایل وی ایڈیوسیٹ کا کامیاب تجربہ
- 2008 اکتوبر 22 کو چندریان کا کامیاب تجربہ۔

اس کی قیمت سے تو ٹی ٹیکنالوجی ہے جو کہ امریکہ، روس اور چین کے پاس ہے۔ ہندوستان سوویت یونین سے خریدنا چاہتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان امریکی مخالفت کا سامنا کرتے ہوئے بھی سوویت یونین سے بہت کچھ تکنیکی کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ مالیکیولر امریکی بھی ہندی انجن کا استعمال جاری ہے۔ لیکن یہ سب محدود طریقے سے کیونکہ ٹیکنالوجی میں بڑا فرق ہے۔

پی ایس ایل وی یا پولر سیٹلائٹ لانچ وہیکل ہندوستانی خلائی تحقیقی تنظیم کے ذریعے چلائے جانے والا انکی ایک پیچیدہ سلسلہ ہے جس کی شروعات 1993 میں ناکامی سے ہوئی لیکن اسی سلسلے سے ہم ہندوستانی پرچم کو چاند کی سرزمین پر لہرانے میں کامیاب ہوئے اور 26 اپریل 2012 کو اسی راکٹ گاڑی نے ہمارا سب سے بڑا جاسوسی سیارہ خلائی مدار میں بھیج کر کھارے ہوا کی نظام کو ایک نیا استحکام بخشا ہے۔ ہمارا یہ پہلا ریموٹ سینسنگ سیٹلائٹ RISAT-1 زمینی مدار میں نصب ہو چکا ہے۔ اس کے طاقت ور کیمرے میں زمین پر ہونے والی چھوٹی سے چھوٹی نقل و حرکت کا بھی مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ پی ایس ایل وی کی کو سنتے سے قبل یہ بھارت صرف روس کے پاس تھی۔ پی ایس ایل وی چھوٹی نقل کے زمینی مدار میں بھی بھیجنے کی اہلیت رکھتا ہے۔ اب تک پی ایس ایل وی کی مدد سے 30 خلائی معمولی سیارے (14 ہندوستانی و 16 بیرونی اقوام) مختلف مداروں میں نصب کیے جا چکے ہیں۔ اس سے اس کی مختلف قسم کی صحت یابی ثابت ہوتی ہے۔

عام طور پر پی ایس ایل وی 2 کے مختلف ٹن سے مشہور قطبی سیارہ اسٹرکا اور بیرونی خلائی تجربے والا پیلوڈ ہے۔ پی ایس ایل وی 1600 کلوگرام وزن کے سیارے کو قطبی مدار میں 620 کلومیٹر پر اور 1050 کلوگرام وزن کے سیارے کو زمینی مدار میں نصب کرنے کی اہلیت رکھتا ہے۔ اپنی پرواز میں 295 ٹن وزن کے ساتھ اس کی لمبائی 44.4 میٹر ہے۔ پی ایس ایل وی میں ہارڈ ہارڈ ٹھوس اور سیال ایندھن کے استعمال والا حرکی نظام اسے زمین سے اٹھا کر خلا میں لے جاتا ہے۔ اس کے کل چار مرحلے ہیں۔ پہلے مرحلے میں 2 بوسٹر سے دنیا کے سب سے بڑے ٹھوس حرکت کار مٹروں میں سے ایک ہے اور 139 ٹن وزن کو حرکت کرتا ہے۔ پہلے مرحلے کے ٹوٹنے کے ساتھ ہی تقریباً 130 سیکنڈ بعد یہ زمین سے 61 کلومیٹر کی بلندی پر علیحدہ ہو جاتے ہیں اور 100 کلومیٹر کی بلندی پر زمین پر گر جاتے ہیں۔

پی ایس ایل وی کی متعدد کامیابیوں نے اسے دنیا کا ایک بھروسہ مند راکٹ ثابت کیا ہے۔ 23 اپریل 2012 تک اس کی 20 مسلسل پروازیں ہو چکی ہیں۔ اس کے ذریعے ہم اپنے خلائی تحقیقی کی منزلیں طے کر چکے

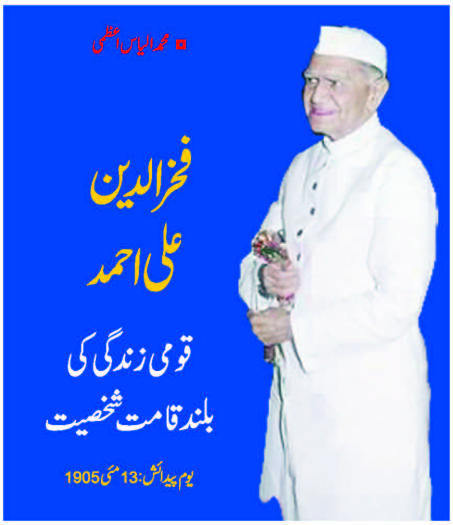

سابق صدر جمہوریہ ہند فخرالدین علی احمد کا شمار ان سیاسی قائدین اور رہنماؤں میں ہوتا ہے جنھوں نے ملک کی آزادی، سالمیت اور اس کی اعلیٰ قدروں کے تحفظ و بقا کے لیے اپنا سب کچھ نچھاور کردیا۔ وہ ایک بڑے پرجوش مجاہد آزادی، قابل فخر محب وطن، جمہوری قدروں کے پاسدار، قومی یکجہتی کے نشان زریں اور ہندوستانی تہذیب وتمدن کا دلکش نمونہ تھے۔ قانون اور سیاست کے ساتھ شعر وادب بالخصوص اردو شاعری کے دلدادہ، غالب وشبلی اور خسرو کے بڑے مداح وقدرداں تھے۔ ان کی شخصیت میں بلا کی سنجیدگی وشائستگی، متانت و وقار، وضع داری اور دلنوازی تھی۔ وہ صوبائی اور مرکزی حکومت میں بڑے بڑے عہدوں پر فائز رہے اور آخر میں سربراہ مملکت منتخب ہوئے مگر ان کی شخصیت کی دلآویزی میں ذرا بھی فرق واقع نہیں ہوا۔ دراصل وہ یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتح عالم کی ایک عمدہ مثال تھے۔

مرحوم فخرالدین علی احمد کا وطن صوبہ آسام کے ضلع سب ساگر میں واقع موضع کچاری ہاٹ تھا ان کے والد ڈاکٹر ذوالنورین علی احمد اٹرین میڈیکل سروس میں کامیابی کا اعزاز حاصل کرنے والے پہلے ہندوستانی تھے۔ وہ معالج کی حیثیت سے ہندوستان کے مختلف شہروں میں تعینات رہے اور طبی خدمات انجام دیں۔

13 مئی 1905 میں فخرالدین علی احمد اپنے ننھیال ضلع قاضی دہلی میں پیدا ہوئے، ان کی تعلیم کا آغاز گورنمنٹ ہائی اسکول گوٹھہ (یوپی) میں ہوا۔ 1921 میں پنجاب یونیورسٹی سے میٹریکولیشن کا امتحان پاس کیا۔ کچھ دنوں تک سنٹ اسٹیفن کالج دہلی میں زیر تعلیم رہے اس کے بعد 1923 میں اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلینڈ گئے، 1927 میں کیتھرائن کالج آف کیمبرج یونیورسٹی سے گریجویشن اور 1928 میں انٹرٹیمپل لندن سے بیرسٹری کی سند لی۔ وہیں 1925 میں پنڈت جواہر لال نہرو سے ملاقات ہوئی جن کے خیالات سے فخرالدین علی احمد بے حد متاثر ہوئے۔ 1928 میں تعلیم مکمل کرکے وطن واپس آئے پہلے لاہور ہائی کورٹ میں اور پھر گوہاٹی میں وکالت کی اور ایک ماہر قانون کی حیثیت سے ممتاز ہوئے۔

فخرالدین علی احمد مرحوم کا گھرانہ قوم پرور جذبات سے سرشار تھا انگریزوں کے ظلم وستم اور ان کی حکومت کو سخت ناپسند کرتا تھا۔ ان کے والد ڈاکٹر ذوالنورین علی احمد اور دادا قاضی جمیل احمد اور خانوادے کے دیگر افراد سب محب وطن اور قوم پرست تھے۔ اس ماحول میں ان کے اندر جذبہ آزادی و حریت پروان چڑھا چنانچہ 1931 میں انھوں نے انڈین نیشنل کانگریس میں شمولیت اختیار کی اور جنگ آزادی میں سرگرم حصہ لینے لگے۔ مہاتما گاندھی کے ستیہ گرہ اور ہندوستان چھوڑو تحریک میں پرجوش اور سرگرم حصہ لیا۔ 9 اگست 1942 کو آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے بمبئی اجلاس کے بعد انگریزوں نے انھیں گرفتار کرلیا اور ساڑھے تین سال تک پس دیوار زنداں رکھا اور اذیتیں پہنچائیں۔ لیکن فخرالدین علی احمد کے جذبہ حب الوطنی میں ذرا بھی کمی نہیں آئی بلکہ اس سے ان کا جذبہ حریت وآزادی اور مضبوط و مستحکم ہوگیا۔

وہ ایک عرصے تک آسام کی سیاست میں سرگرم رہے۔ 1935 میں آسام اسمبلی کی رکنیت کے لیے وہاں کی مخصوص مسلم سیٹ سے کانگریس کے امیدوار ہوئے اور سرتورالدکی تمام مخالفتوں کے باوجود نمایاں طور پر کامیابی حاصل کی، آزادی سے پہلے 1938 میں آسام میں گوپی ناتھ بارودولی کی قیادت میں جو حکومت قائم ہوئی تھی اس میں انھیں وزیر مالیات بنایا گیا۔ 1946 میں انھیں آسام کے ایڈوکیٹ جنرل کی ذمے داری سونپی گئی۔ آزادی کے بعد آسام اسمبلی کے 1957 اور 1964 کے انتخابات میں بھی وہ کامیاب ہوئے اور دونوں بار وزیر بنائے گئے، وزیر کی حیثیت سے مالیات، پنچایت، زراعت، صنعت اور کمیونٹی ترقی کے محکمے انھیں سپرد کیے گئے جنھیں حسن وخوبی کے ساتھ نہ صرف ترقی دی بلکہ امانت ودیانت کا نقش قائم کیا اور بڑی نیک نامی حاصل کی۔

ان کی شخصی وجاہت، سوجھ بوجھ اور فہم وفراست کے سبب حکومت کی طرف سے مختلف وفود میں نمائندگی اور سربراہی سونپی گئی۔ 1955 میں روس جانے والے سرکاری وفد کی قیادت انھیں کے ذمہ تھی۔ 1957 میں اقوام متحدہ کے ہندوستانی وفد کے بھی وہ رکن رہے۔ 1962 میں سرکاری دعوت پر امریکہ، جاپان اور ہانگ کانگ کے تجارتی دورے پر گئے۔ 1965 میں ملیشیا کی جشن آزادی تقریبات میں سرکاری نمائندہ کے طور پر شرکت کی۔ 1975 میں شاہ فیصل مرحوم کی تدفین میں حصہ لینے سعودی عرب گئے تو وہاں کچھ دن قیام کرکے عمرہ کی بھی سعادت حاصل کی۔

آسام کے بعد انھیں مرکز میں جگہ دی گئی۔ 1952 میں راجیہ سبھا کے لیے منتخب ہوئے۔ 29 جنوری 1966 میں وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو کی حکومت میں توانائی

وآبپاشی کے وزیر بنائے گئے۔ 1967 میں آسام کی برنیا پارلیمانی سیٹ سے پارلیامنٹ کے رکن منتخب ہوئے۔ تعلیم، صنعت، کمپنی معاملات اور وقف کی وزارتیں ان کے ذمے رہیں۔ 27 جنوری 1974 میں غذا اور زراعت کا قلم دان انھیں سونپا گیا۔ 3 جون 1974 کو وزارت کے عہدے سے مستعفی ہوکر عہدہ صدارت کے لیے کانگریس کے امیدوار ہوئے اور کامیابی حاصل کی۔ 24 اگست 1974 کو حلف برداری کے بعد سربراہ مملکت کے اعلیٰ ترین اور معزز ترین عہدے پر فائز ہوئے اور تقریباً ڈھائی سال تک ہندوستان کے صدر جمہوریہ رہے۔ 11 فروری 1977 کو بروز جمعہ راشٹرپتی بھون میں انتقال کیا اور جس مسجد میں وہ نماز جمعہ ادا کرتے تھے اسی کے قریب سپرد خاک کیے گئے۔

یہ مرحوم فخرالدین علی احمد کی زندگی کا ایک خاکہ ہے جس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ انھوں نے کس قدر معروف زندگی گزاری، ملک وقوم کے لیے کس قدر جدوجہد کی۔ آزادی کے لیے کس قدر قربانیاں دیں اور پھر آزادی کے بعد ملک کی سالمیت، ترقی اور جمہوریت کی بقا کے لیے کیسے کیسے کارہائے نمایاں انجام دیے۔ سچ ہے ایسے افراد مدتوں میں پیدا ہوتے ہیں۔

فخرالدین علی احمد کی شخصیت بڑی طرح دار تھی۔ وہ ایک ایسے مجاہد آزادی اور سیاسی رہنما تھے جنھیں پاک طینت اور پاک باز کہا جاسکتا ہے۔ وہ 45 سال سے زائد قومی زندگی کا حصہ رہے، مگر ان سے کبھی کسی کو شکایت نہیں ہوئی، ان کا کوئی بیان کسی کے لیے دل آزاری کا باعث نہیں ہوا۔ ان کی شخصیت میں بڑی دل ربائی اور دلنوازی تھی۔ جمہوریت اور سیکولرزم ان کے نظریہ سیاست کے دو بنیادی عناصر تھے، اس پر ان کا عقیدہ اس قدر پختہ تھا کہ وہ کبھی متزلزل نہیں ہوا۔ اتحاد و یک جہتی پر انھوں نے بڑا زور دیا اس کو وہ جمہوریت کا جزو لاینفک تصور کرتے تھے۔ صدارت کے زمانے میں ان کی تقریروں میں ان کا خاص طور پر ذکر ہوتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ آنجہانی اندرا گاندھی وغیرہ کو ان پر بڑا اعتماد تھا۔

فخرالدین علی احمد کو شعر و ادب اور تصوف سے بڑا گہرا لگاؤ تھا۔ ان کی پرورش و پرداخت ننھیال دہلی میں ہوئی ان کی والدہ رقیہ بیگم نواب زین العابدین عارف کی پوتی اور باقر علی خاں کامل کی صاحبزادی تھیں جن کا نسبی تعلق نوابین لوہارو اور مرزا غالب سے تھا۔ 9 نومبر 1945 کو فخرالدین علی احمد کا نکاح مشہور ادبی شخصیت سلطان حیدر جوش کی صاحبزادی عابدہ بیگم سے ہوا گویا انھیں ہمیشہ ادبی ماحول میسر رہا غالباً یہی وجہ ہے کہ انھیں اردو زبان سے بڑا جذباتی تعلق تھا اس کی بقا و ترقی کے لیے انھوں نے بڑی تگ و دو کی۔ سابق وزیر اعلیٰ اتر پردیش سوچیتا کرپلانی کو طویل مراسلات اردو ہی کی بقا و تحفظ کے لیے لکھے اور اس کے چارٹر حقوق کی بحالی کے لیے کوششیں کیں۔ اردو کی حمایت میں انھوں نے جو مدلل تقریریں کیں اس کو سب نے سراہا اس سے اردو کی مخالفت میں بھی کمی آئی اور اردو کی ہمدردی میں بھی اضافہ ہوا۔ اردو شاعری اور مشاعروں سے بھی انھیں بڑی دلچسپی تھی، وہ اکثر مشاعروں میں شریک ہوتے، خود اپنے گھر پر شعری نشستیں منعقد کرتے، ان کی اسی طرح کی ایک نشست کا ذکر مسز ایف اے رحمانی نے اپنی انگریزی کتاب My Eleveh years with Fakhruddin Ali Ahmad میں صفحہ 19 پر کیا ہے جس میں علی سردار جعفری اور گلزار دہلوی وغیرہ کو مدعو کیا۔ اس کی صدارت آنجہانی



فخرالدین علی احمد کا نکاح مشہور ادبی شخصیت سلطان حیدر جوش کی صاحبزادی عابدہ بیگم سے ہوا گویا انھیں ہمیشہ ادبی ماحول میسر رہا غالباً یہی وجہ ہے کہ انھیں اردو زبان سے بڑا جذباتی تعلق تھا

جگ جیون رام نے اور نظامت گلزار دہلوی نے کرائی۔ اس میں دیگر معززین کے علاوہ سردار سورن سنگھ اور وائی پی چوان وغیرہ نے شرکت کی تھی۔

اقلیتوں کے مسائل، سرکاری ملازمتوں میں ان کی مناسب حصے داری، پولس پی اے سی میں صحیح نمائندگی، مسلم یونیورسٹی اور دیگر اقلیتی اداروں کے اقلیتی کردار جیسے اہم مسائل سے بھی انھوں نے دلچسپی لی اور ان کی فلاح و بہبود کے لیے کوششیں کیں۔

کھیل کود سے بھی انھیں بڑا لگاؤ تھا وہ خود گولف اور ٹینس کھیلتے تھے۔ اسی دلچسپی کے باعث آسام فٹ بال ایسوسی ایشن اور آل انڈیا کرکٹ ایسوسی ایشن کے صدر، اور آسام اسپورٹس کونسل کے نائب صدر کے عہدے کے لیے منتخب ہوئے، ان کی ذات سے کھیل کود کو بھی بڑا بڑھاوا ملا۔

مرزا غالب ان کے محبوب شاعر تھے، 1960 میں غالب کی صد سالہ برسی انھیں کی خواہش پر پورے ملک میں تزک و احتشام کے ساتھ منائی گئی اور سو سال سے جو تربت چادر کو ترس رہی تھی اس پر عقیدت کے پھولوں کی بارش کی گئی۔ ایوان غالب، غالب آڈیٹوریم، میوزیم، لائبریری، غالب انسٹی ٹیوٹ اور ان کی عمارتیں دراصل انھیں کی ذاتی دلچسپیوں کی یادگاریں ہیں۔ 1975 میں امیر خسرو کا سات سو سالہ بین الاقوامی جشن انھیں کی سرپرستی میں کامیابی سے ہمکنار ہوا۔ آج ملک میں اردو اکادیموں کا جو جال بچھا ہوا ہے اور جن کی بدولت اردو زبان و ادب کے گوناگوں کام انجام پا رہے ہیں، ان کے قیام میں بھی ان کی ذاتی کوششوں کا بڑا دخل ہے۔ اتر پردیش میں اردو کے لیے انھوں نے ایک ادارے کی بنیاد رکھی گو اسے پورے طور پر وہ عملی جامہ نہیں پہنا سکے تاہم ان کے بعد اسی ادارے کو فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی کا نام دیا گیا جو برسوں سے اردو کی بڑی خدمات انجام دے رہا ہے، اس کی بدولت اردو کی سیکڑوں کتابیں زیور طبع سے آراستہ ہوکر اردو کے ذخیرے میں اضافے کا باعث ہوئیں اور یہ سلسلہ اب تک قائم ہے۔

انھیں اردو کے علمی اداروں سے بھی بڑا گہرا لگاؤ تھا، وہ ملک کے مایہ ناز علمی و تصنیفی ادارے دارالمصنفین شبلی اکادمی اعظم گڑھ کے معزز رکن تھے، اس کی تعمیر و ترقی میں انھوں نے بڑی دلچسپی لی۔ ڈاکٹر ذاکر حسین کے بعد فخرالدین علی احمد دوسرے صدر جمہوریہ ہند تھے جنھوں نے دارالمصنفین کے علمی و تحقیقی منصوبوں کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کوشش کی، علامہ شبلی، دارالمصنفین اور سیرۃ النبیؐ کے وہ بڑے قدرداں تھے، اپنے ایک خط میں مولانا شبلی کو ہندوستان کا نامور فرزند قرار دیا ہے۔ غرض غالب انسٹی ٹیوٹ ہو یا دارالمصنفین، فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی ہو یا صوبائی اردو اکادمیاں اگر ان کے قیام و استحکام اور مقاصد و ضروریات کا بنظر غائر جائزہ لیا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ فخرالدین علی احمد کی شخصیت عہد ساز اور قابل رشک تھی۔ ان کی کاوشیں ہندوستان کی تاریخ کا حصہ ہیں جنھیں کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

Dr. Mohammad Ilyas Azmi, Honorary Fellow, Darulmusannefin Shibli Academy, Azamgarh- 276001 (UP)

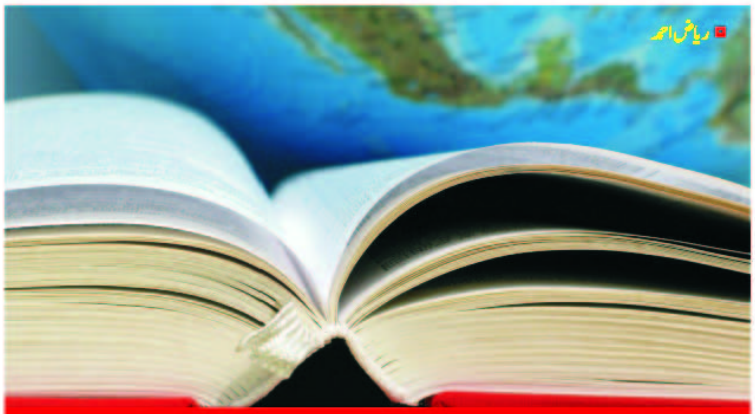

ریاض احمد

اردو میں فاصلاتی تعلیم کا درسی مواد : ایک جائزہ

ہمارے ملک میں گزشتہ چار پانچ دہائیوں سے رسمی طریقہ تعلیم کا ایک متبادل طریقہ تعلیم ان افراد کے لیے سودمند ثابت ہورہا ہے جن کا ساتھ رسمی طریقہ تعلیم نہیں دے سکتا یا یوں کہہ دیا جائے کہ وہ رسمی طریقہ سے تعلیم حاصل کرنے کے متحمل نہیں ہیں۔ آبادی کے لحاظ سے ہمارا ملک دنیا کا دوسرا بڑا ملک ہے اور معاشی، معاشرتی ترقی کے لیے تعلیم ایک کنجی ہے مگر وہ کنجی اب تک ہم کسی نوجوانوں کو نہیں دے سکے ہیں جس سے ہمارے پیچیدہ تیزناک مسئلہ کے متعدد سے کا تالا کھول سکیں لیکن کیونکہ آبادی زیادہ ہونے اور ذرائع محدود ہونے کی وجہ سے طلبا کی اتنی بڑی آبادی کے لیے رسمی تعلیم کا انتظام کرنے میں دشواریاں ہو رہی ہے یہی وجہ ہے کہ دنیا کی دیگر ترقی یافتہ اور ترقی پذیر ممالک کی طرح ہم نے بھی اس متبادل طریقہ تعلیم یعنی 'فاصلاتی تعلیم' کی طرف توجہ کی ہے 1982 میں اس متبادل طریقہ تعلیم کا باضابطہ آغاز ہوا تھا اور اب ایسے اداروں کی تعداد سو سے زیادہ ہے۔ اس طرز کی تعلیم کے ادارے کے دو زمرے ہیں ایک تو مکمل فاصلاتی تعلیم کے ادارے اور دوسرے Dual Mode ادارے۔ ان سبھی اداروں کی رہنمائی فاصلاتی تعلیم کی مرکزی یونیورسٹی انجام دے رہی ہے جس کے لیے باضابطہ ایک کونسل Distance Education Council بنائی گئی۔ ملک کی مذکورہ 513 یونیورسٹیوں میں 18 کا تعلق لسانی یونیورسٹیوں سے ہے۔ ظاہر ہے ان کے تدریسی مواد بھی ان ہی زبانوں میں تیار ہونے چاہیے جس زبان کی نمائندگی وہ کرتی ہیں جو ایک بہت بڑا مسئلہ ہے کیونکہ علاقائی یا چھوٹی زبانوں میں فاصلاتی تدریسی مواد تیار کرنا ایک چیلنج سے کم نہیں ان ہی چیلنجوں کا سامنا اردو زبان میں تدریسی مواد کا بھی ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ بہتر انتظام اور سودوں درسی مواد فاصلاتی تعلیم میں کلیدی کردار ادا کرتی ہیں۔ چنانچہ دیگر زبان میں بالعموم بھر اردو زبان میں بالخصوص درسی مواد تیار کرنا ایک اہم طلب مسئلہ ہے۔

جہاں تک اردو میں درسی مواد کی تیاری اور فراہمی کا مسئلہ ہے وہ دیگر ہندوستانی زبانوں کی طرح ہی ہے اس کے علاوہ اردو ذریعہ تعلیم اور درسی مواد مزید مسائل سے دوچار ہیں۔ لہٰذا اس ضمن میں بہت کچھ کرنا باقی ہے اور اگر اس پر سنجیدگی سے دھیان نہیں دیا گیا تو یہ ذریعہ تعلیم اور اس میں تیار کیا جانے والا درسی مواد اور اس کا معیار بہت پیچھے رہ جائے گا۔ اردو میں درسی مواد اس کی تیاری، طباعت اور فراہمی کے ضمن میں آنے والی جن دشواریوں اور ان کے حل کا مجموعہ اس مقالے میں پیش کیا جائے گا ان میں:

- درسی مواد کتنے سال کے لیے تیار کیا جائے۔
- درسی مواد کی تیاری کے کون کون سے مراحل ہیں؟ کیا مواد تیار کرتے وقت ان کا خیال رکھا جاتا ہے اگر نہیں تو ان سے کیا مسائل پیدا ہوتے ہیں؟ اور ان کا اثر مواد کے استعمال کرنے والوں (Learners) پر کتنا ہوتا ہے؟
- مواد تیار کرتے وقت ٹارگٹ گروپ کی سہولتوں کا کس حد تک خیال رکھا جاتا ہے۔
- درسی مواد تیار کرنے والی ٹیم اور دیگر انتظامی اسٹاف کا کیا کردار ہونا چاہیے۔

دنیا کے تعلیمی گھنٹے پر ایک صدی سے زائد اور ہندوستان کے گھنٹے پر تقریباً نصف صدی سے رسمی تعلیم کے علاوہ دیگر طریقے سے تعلیم فراہم کرنے والے تعلیمی اداروں کا پتہ چلتا ہے۔ کوکر اس طریقہ تعلیم کو متعدد ناموں سے پکارا گیا۔ کبھی اسے Shorttime courses کا نام دیا گیا تو کبھی غیر رسمی، مراسلاتی، Life Long Education' اور فاصلاتی تعلیم کا نام دیا گیا۔ لیکن خواہ نام کوئی بھی دیا گیا ہو مقصد صرف ایک ہی تھا وہ یہ کہ ان افراد کو زیور تعلیم سے آراستہ کیا جائے یا ان کی تعلیمی استعداد میں اضافہ کیا جائے یا پھر ان کی تعلیمی و تجرباتی

زندگی کو مستحکم کیا جائے جو کسی وجہ سے عمر کی ایک معین حد میں تعلیم حاصل نہیں کر پائے، اپنی تعلیمی سرگرمیوں کو بیچ میں چھوڑ دیا جن کی تعلیمی راہ میں رکاوٹیں حائل ہوگئیں یا پھر جن کی اعلیٰ تعلیم کا سلسلہ منقطع کا شکار ہوگیا۔ ہمارے ملک میں ہی نہیں دنیا کے متعدد ترقی یافتہ اور ترقی پذیر ممالک میں تعلیم حاصل کرنے والوں کی ایک بہت بڑی تعداد فاصلاتی نظام تعلیم سے جڑی ہوئی ہے۔ اب تک لاکھوں لوگوں نے اس نظام تعلیم کے ذریعے اپنے تعلیمی معیار کو بہتر بنانے اور معیار زندگی کو مستحکم کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے۔ پوری دنیا میں رائج سماجی، سائنسی، تکنیکی اور لسانی علوم کے بیشتر حصّوں کو اس نظام تعلیم کے ذریعے تدریسی سہولت فراہم کی جارہی ہے۔ گویا ہماری موجودہ انفرادی، معاشرتی، معاشی حتیٰ کہ ملکی اور بین الاقوامی ضرورتوں کی تکمیل کسی نہ کسی طرح اس ذریعۂ تعلیم سے بھی ہورہی ہے۔ دنیا کی بیشتر بڑی زبانوں کو اس نظام تعلیم کا ذریعہ بنایا گیا ہے۔ ہمارے ملک کو زبان کے معاملے میں انفرادی حیثیت حاصل ہے۔ چنانچہ ہماری بیشتر جدید زبانیں فاصلاتی طریقۂ تعلیم میں مجموعی یا مقامی طور پر بحیثیت زبان کی تعلیم اور میڈیم آف انسٹرکشن کے شامل ہیں۔

آیئے اب یہ دیکھیں کہ درسی مواد یا انسٹرکشنل میٹریل کیا ہے، یہ کیوں تیار کیا جاتا ہے اس کے تیار کرنے کے کون کون سے مراحل ہیں اور یہ کسی نصاب تعلیم کی کس حد تک تکمیل کرتا ہے، درسی مواد سے کن لوگوں کو فائدہ پہنچتا ہے اس کے استعمال کا طریقہ کیا ہے۔ کیا عام درسیات، درسی کتابیں یا نصابی کتب، تدریسی مواد کی جگہ استعمال کی جاسکتی ہیں؟ اور فاصلاتی نظام تعلیم میں کس زبان میں درسی مواد تیار کیا جائے جو سب کے لیے قابل قبول ہو۔ کیا ترجمے کے ذریعے ایک زبان کے درسی مواد کو دوسری زبان کے ذریعۂ تعلیم کے لیے مواد کے طور پر استعمال کیا جاسکتا ہے اور اردو زبان میں درسی مواد کی تیاری کہاں تک ممکن ہے اور کس حد تک اسے استعمال کے لائق بنایا جاچکا ہے، مزید اس میں سدھار کی کتنی گنجائش ہے۔

درسی مواد کسی نہ کسی نصاب یا نصاب تعلیم کے تحت ہی تیار کیے جاتے ہیں اور اس کا خاص مقصد ان نصابی مقاصد کو پورا کرنا ہے جو کسی ہدف گروپ کے لیے طے کیا گیا ہے۔ کسی درسی مواد کے تدریسی مقاصد کے ساتھ ساتھ اس کا اس نصابی ڈھانچے اور وقتی خاکے (Time Frame) کے حدود میں رہ کر اس ہدف گروپ کے تدریسی مقاصد کو پورا کرنا ہے۔ اس طرح کے کسی نصاب کا تعین کرتے وقت اس کے جن بنیادی عناصر کا خیال رکھا جاتا ہے، ان



پوری دنیا میں رائج سماجی، سائنسی، تکنیکی اور لسانی علوم کے بیشتر حصّوں کو اس نظام تعلیم کے ذریعے تدریسی سہولت فراہم کی جارہی ہے۔ گویا ہماری موجودہ انفرادی، معاشرتی، معاشی حتیٰ کہ ملکی اور بین الاقوامی ضرورتوں کی تکمیل کسی نہ کسی طرح اس ذریعہ تعلیم سے بھی ہورہی ہے

میں انسانی ارتقا سماجی توقعات، تعلیم کی نوعیت اور علم وادراک کی فطرت شامل ہے۔ ظاہر ہے فاصلاتی تعلیم کے درسی مواد کا خاکہ تیار کرتے وقت اور اس کی تکمیل میں مذکورہ نکات کا خیال رکھنا ضروری تو ہے ہی اس کے علاوہ اس ہدف گروپ کی ضرورتوں، ان کی نفسیات اور انھیں حاصل اوقات کا بھی خیال رکھنا نہایت ضروری ہے۔ مختلف علوم وفنون کے درسی مواد کو ایک معیّنہ مدت میں مقررہ اوقات اور اغراض ومقاصد کے تحت تیار کیا جاتا ہے۔ درسی مواد کی تیاری میں کم از کم پانچ مراحل ایسے ہیں جن پر بتدریج کار بند ہونا نہایت ضروری ہے:

(1) اہداف یعنی اغراض ومقاصد کا تعین
(2) اکتسابی تجربات کا انتخاب
(3) مواد مضمون کا انتخاب
(4) علمی تجربات اور مواد مضمون کی تنظیم وباہمی ارتباط
(5) تعیین قدر

ان نکات کے علاوہ درسی مواد تیار کرنے والے ادارے/ماہرین/افراد کو چاہیے کہ وہ مواد جن کے لیے تیار کیا جارہا ہے ان کے متعلق دوسری بنیادی معلومات مثلاً عمر، جنس، دیہی شہری فرق، تعلیمی سطح، تعلیمی ضروریات/مختلف تدریسی آلات (Aids) کی بنیادی معلومات، ان کے گھریلو حالات، کام کی نوعیت، کام کے اوقات، مالی حالت، خواہشات، عادات، رویّے، ذرائع ابلاغ اور گھریلو سہولیات کا اندازہ بھی کرلینا چاہیے۔ مذکورہ باتوں کے لیے بہتر ہے کہ طلبا یا مواد کے استعمال کرنے والے افراد (Learners) کی پروفائل تیار کرلی جائے اور ان پروفائل کو بنیاد بنا کر درسی مواد کے ساتھ ساتھ مضامین اور ٹارگٹ گروپ کا لحاظ رکھتے ہوئے ہدایات بھی لکھ دی جائیں۔

مذکورہ باتوں کو ذہن میں رکھتے ہوئے تدریسی مواد کی تدوین کے لیے کورس ٹیم کی تشکیل کی جاتی ہے عام طور پر یہ ٹیم تین سطحی ہوتی ہے۔ پہلی سطح ان ماہرین کی ہوتی ہے جو فاصلاتی طرز تعلیم کے درسی مواد کے مضامین اور تدوین نصاب کی مہارت رکھتے ہوں۔ دوسری سطح پر ان ماہرین مضامین کو رکھتے ہیں جو درسی مواد کے اسباق/اکائیوں کو اس طرز تعلیم اور ٹارگٹ گروپ کو ذہن میں رکھ کر لکھتے ہیں۔ تیسری سطح پر مضامین کی ایڈیٹنگ ٹیم رہتی ہے۔ کورس ٹیم کی ذمے داریوں میں جن امور کو شامل کیا جاسکتا ہے ان میں:

(1) پورے نصاب کو مناسب اکائیوں میں تقسیم کرنا
(2) ان اکائیوں کو مختلف ذیلی اکائیوں میں بانٹنا
(3) اسباق کے مصنفین کو مختلف موضوعات کے ضمن میں ہدایات فراہم کرنا
(4) اس بات کو یقینی بنانا کہ مواد درست ہے، کورس سے متعلق ہے اور تازہ ترین تحقیقی اطلاعات پر مبنی ہے
(5) تدریسی مواد وقت پر پورا کرلیا جائے
(6) اس بات کو یقینی بنایا جائے کہ تدریسی مواد فاصلاتی تعلیم کے منشور اور یونیورسٹی کی ہدایات کے عین مطابق ہو
(7) مواد پرنٹ میٹریل (Print Material) اور سمعی وبصری ذرائع (Audio Visual Aids) دونوں میں یہ ایک وقت تیار کیا جائے (دونوں کے ذریعے استعمال کے لائق ہو)
(8) یونٹ کے مصنفین کے اسباق کو ایڈٹ کرکے نفس مضمون کے مطابق بنایا جانا چاہیے لیکن اسباق میں نہ مزید طوالت ہو نہ زیادہ اختصار
(9) اسباق کی زبان درجات اور ٹارگٹ گروپ کے موافق ہو
(10) مختلف یونیورسٹیوں کے درمیان واضح ربط وتسلسل ہو
(11) درسی مواد (ماڈیول) کے اخیر میں وضاحتی نوٹس اور مشکل الفاظ کی فرہنگ ضرور ہونی چاہیے۔
(12) درسی مواد کے ماڈیول پر مختلف اکائیوں کے مصنفین، ماہرین کی کمیٹی اور ایڈیٹرس کے نام کے علاوہ کاپی رائٹ ادارے کا نام اور سال اشاعت ضرور لکھا جانا چاہیے۔

جیسا کہ بتایا جاچکا ہے کہ درسی تعلیم کے طلبا کی نفسیات،

3/21/2018 P28.jpg (967×1297)

عمر، عادات اور ذہنی صلاحیتیں فاصلاتی تعلیم کے طلبا سے منفرد ہوتی ہیں۔ فاصلاتی تعلیم کے طلبا معاشرتی طور پر ایک ذمے دار شہری ہوتے ہیں۔ وہ اپنا داخلہ کسی مخصوص وجہ، ارادہ یا ہدف کو سامنے رکھ کر کراتے ہیں۔ ان کے اندر عام طور سے مطالعے کا شوق اور جذبہ پایا جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ وہ اچھے تدریسی مواد اور دیگر فاصلاتی تعلیم کے پروگراموں کی تعریف کرتے ہیں اور اگر خامیاں ہوں تو اس پر ناراضگی کا اظہار بھی کرتے ہیں۔ فاصلاتی تعلیم کے طلبا پیشہ ورانہ زندگی کا تجربہ رکھتے ہیں اور مستقبل کے لیے کوئی نہ کوئی ٹارگیٹ ان کے ذہن میں ہوتا ہے، ان کے پاس تعلیم، تدریس اور مواد سب کے لیے کچھ نہ کچھ انفرادی یا اجتماعی تجربہ ہوتا ہے، کورس رائٹرس، مشاورتی ٹیم ان کے ان تجربات سے خاطر خواہ فائدہ اٹھا کر تدریسی مواد کو مزید بہتر بنا سکتے ہیں۔ وہ عام طلبا کے مقابلے اپنے ساتھ بڑوں جیسے سلوک چاہتے ہیں، وہ ٹیوٹر کے ساتھ ضروری ہدایات، اہداف اور فیصلے میں امداد باہمی چاہتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ وہ تعلیمی و تعلمی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا چاہتے ہیں ان میں رسمی تعلیم کے طلبا کی بہ نسبت زیادہ پختگی، ہم آہنگی، تنوع اور ویرائٹی (Variety) پائی جاتی ہے۔ لہٰذا وہ اپنے وقت کو بہت قیمتی سمجھتے ہیں اور اپنی دوسری سماجی ذمے داریوں کی وجہ سے ضیاع وجود سے بچنا چاہتے ہیں۔ اس لیے مذکورہ حقائق کو ذہن میں رکھتے ہوئے تدریسی مواد تیار کیا جانا چاہیے۔ مذکورہ بالا نکات کا خیال رکھتے ہوئے تدریسی مواد تیار کرتے وقت اس کی ڈیزائننگ، سائز، مختلف نکات، عنوانات (ہیڈلائنس) کو جلی حرفوں میں لکھنا، تصاویر، اشکال (ڈائی گرام)، جدول اور Illustration وغیرہ کا صحیح استعمال اور اس کے رنگ و روغن کا صحیح انتخاب، تدریسی مواد کو مزید کارآمد اور دلچسپ بناتے ہیں۔

درسی مواد میں Feed Back کے لیے اور اعادہ کے طور پر اکائی کے اخیر میں کچھ سرگرمیاں اس طرح ترتیب دی جانی چاہیے جس سے استعمال کنندہ (Leamer) کو پوری اکائی کا خلاصہ ذہن میں آجائے۔ درسی مواد کی ترتیب ایسی ہونی چاہیے کہ اس میں طلبا کے رٹنے کا کم اور سمجھنے کا زیادہ موقع فراہم ہو، کیونکہ درسی مواد یا تدریسی ہدایات بہت حد تک نصابی کتاب اور اساتذہ کا متبادل ہے، حالانکہ فاصلاتی نظام تعلیم میں اساتذہ کی کمی کا ازالہ تدریسی مواد سے ہو جانا چاہیے۔ یہ مواد طلبا میں علمی اور عملی تحریک پیدا کرنے اور انھیں مصروف رکھنے کا باعث ہونا چاہیے۔ فاصلاتی نظام میں درسی مواد کو ہر سال Up Date کرنے کی گنجائش ہے تاہم یہ کہ خرچیلا اور پیچیدہ مرحلہ ہے، اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ایک بار درسی مواد تیار ہو جائے تو اسے بدلا نہ جائے بلکہ زیادہ سے زیادہ ہر پانچ سال میں اسے تجدید و ترمیم کے ساتھ شائع کرنا چاہیے۔ مواد کی کاپیاں تیار کرتے وقت موجودہ طلبا کی تعداد اور آئندہ ہونے والے اضافے کا خیال رکھا جانا چاہیے تاکہ پیش آنے والی Shortage کی پریشانی سے بچا جا سکے۔ درسی مواد کی ڈیزائننگ، صفحات کی تعداد و سائز، جلد سازی، وضاحتوں کا استعمال اور ٹائٹل پیج، Cover Page کی ڈیزائننگ یکساں ہونی چاہیے۔ اس ضمن میں بہت سے فاصلاتی تعلیم کے اداروں نے درسی مواد کی تیاری کے لیے الگ سے تکنیکی اسٹاف کا مستقل انتظام کیا ہے۔



درسی مواد کی ترتیب ایسی ہونی چاہیے کہ اس میں طلبا کے رٹنے کا کم اور سمجھنے کا زیادہ موقع فراہم ہو، کیونکہ درسی مواد بہت حد تک نصابی کتاب اور اساتذہ کا متبادل ہے، حالانکہ فاصلاتی نظام تعلیم میں اساتذہ کی کمی کا ازالہ تدریسی مواد سے ہو جانا چاہیے۔ یہ مواد طلبا میں علمی اور عملی تحریک پیدا کرنے اور انھیں مصروف رکھنے کا باعث ہونا چاہیے

ہمارے ملک میں انگریزی کے علاوہ دیگر ہندوستانی زبانوں میں درسی مواد کی تیاری کے سلسلے میں بہت ساری دشواریوں کا سامنا ہے، عام طور سے زبان کی تدریسی مواد کے علاوہ تقریباً سبھی مضامین کا متن پہلے انگریزی میں تیار کیا جاتا ہے، پھر بعد میں مختلف مشکلات اور مراحل سے گزرتا ہوا یہ دوسری ہندوستانی زبانوں میں شائع ہوتا ہے، جن مشکلات کا سامنا دیگر زبانوں میں درسی مواد کی تیاری کو لے کر ہے ان ہی مشکلات و پریشانیوں سے اُردو بھی دوچار ہے۔

جہاں تک انگریزی زبان میں تیار کیے گئے تدریسی مواد کا اُردو میں ترجمہ کے ذریعے تیار کیے گئے درسی مواد کا سوال ہے تو اس سے متعلق کئی مسائل اُبھر کر سامنے آتے ہیں، سب سے پہلا مسئلہ مختلف مضامین/سبجکٹ سے متعلق اصطلاحات کا ہے۔ اوّلاً تو بہت سی انگریزی اصطلاحات کا اُردو میں صحیح بدل نہیں ہے اگر ہے بھی تو عربی کے اصطلاحات ہیں جو اُردو کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں۔ عربی کی بعض اصطلاحیں انگریزی سے بھی زیادہ مشکل ہوتی ہیں۔ بعض انگریزی اصطلاحات کا ہم موزوں ترجمہ نہیں کرتے۔ کئی بار ایسا ہوتا ہے کہ موضوع کے لحاظ سے استعمال نہیں کرتے، جس سے معنی بدل جاتا ہے عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ ہم درسی مواد کے متن کا ترجمہ کرتے وقت عام لغات (ڈکشنری) سے انگریزی اصطلاحات کے اُردو معنی دیکھ کر لکھ لیتے ہیں جو اس لفظ کا لفظی معنی ہوتا ہے لیکن اکثر وہ لفظ نفس مضمون یا سبجکٹ کے لحاظ سے اپنا مطلب ادا نہیں کرتا۔ ہمیں چاہیے کہ ایسی اصطلاحات کا ترجمہ کرتے وقت ان مضامین کے لیے وضع کیے گئے مخصوص لغات مانسائکلوپیڈیا یا گلوسری (Glossaries) کو سامنے رکھیں اس ضمن میں قومی مقتدرہ، پاکستان اور NCPUL نئی دہلی کے ذریعے تیار کیے گئے مخصوص لغات بالخصوص کلیم الدین احمد والی انگریزی اُردو لغات کا استعمال مفید ہوگا۔

Dr.Reyaz Ahmad, Assistant Professor, Dept. Education & Training, MANUU, Hyderabad - 32
Email:reyazahmed045@gmail.com

http://urducouncil.nic.in/Urdu-Duniya/Urdu-Duniya-June-2012/P28.jpg 1/1

عبدالحمید کاراشیری

بچوں کی تعلیم جدید نفسیات کی روشنی میں



روایتی طرزِ نظر کے مطابق بچّے کو تہی مغز سمجھا جاتا تھا۔ استاد ہی سب کچھ بتاتے، اور پڑھاتے تھے بچّے محض سننے والے یا ہدایت کے مطابق خاموشی کے ساتھ کام کرنے والے ہوتے۔ اس طریقے میں بچوں کی فطرت اور ذہانت کو بالکل نظرانداز کردیا جاتا تھا۔ یہاں پڑھائی یا تعلیمی عمل (Learning Process) ایک طرفہ ہوتا ہے۔

1920 سے 1960 تک تعلیمی علم النفس، طرزِ عمل Behaviourism پر مبنی نظریہ تھا۔ اس نظریے کا آغاز روس میں ہوا۔ نظریہ پیش کرنے والے ماہرِ نفسیات کہتے ہیں کہ بچوں کو شعوری طور پر پڑھانے کی ضرورت ہے۔ پڑھائی میں تربیت اور تکرار کی بڑی اہمیت ہے۔ ان کے خیال میں بچہ خالی برتن کی مانند ہوتا ہے۔ اس میں علم کا خزانہ بھرنا استاد کا کام ہے۔ Behaviourism کی ساری تحقیقیں چانوروں اور پرندوں پر ہوتی تھیں۔ جدید ماہرِ نفسیات اس نظریے کو بالکل نظرانداز کرتے ہیں۔ آج کل تعلیم میں Social Constructivism کے نظریے کو مقبولیت ملی ہے۔

دونوں تعلیمی نظریوں کا تقابلی مطالعہ

Constructivism	Behaviorism
طفل مرکوز تعلیم	معلم مرکوز تعلیم
Child Centered Education	Teacher Centered Education
• بچہ معمارِ علم ہے	بچہ خالی برتن ہے
Constructor of Knowledge	
• سرگرمی پر مبنی تعلیم	مواد پر مبنی تعلیم
Activity Based Learning	
• تعلیم فطری، سرگرم، معنی خیز اور زندگی بھر رہنے کا عمل ہے	تعلیم میکانکی عمل ہے
• اندرونی محرک Intrinsic Motivation کی وجہ سے تعلیم کی طرف متوجہ ہوتا ہے	بیرونی محرک Extrinsic Motivation
• دماغی سرگرمیوں کی اہمیت دیتا ہے	قوتِ حافظہ پر مبنی ہے
• بحث ومباحثے کے لیے موقع ملتا ہے	تقلید، تکرار کے ذریعے پڑھتا ہے
• استاد ایک Mediator ہے	استاد علم کا ترسیل کرنے والا ہے
• جمہوری طرزِ نظر	غیر جمہوری طرزِ نظر
• فطری ماحول	میکانکی ماحول

دورانِ درس ہر ایک بچہ قدر دانی چاہتا ہے۔ روایتی کمرۂ جماعت میں بچے کی عزتِ نفس کا خیال نہیں رکھا جاتا تھا۔ استاد کا فیصلہ ایک طرفہ ہوتا تھا۔ خود اعتمادی کے ساتھ تعلیمی سرگرمیوں میں حصہ لینے کے لیے بچوں کے شوق و ذوق کا لحاظ رکھنا چاہیے لیکن افسوس کی بات ہے کہ اکثر کمرۂ جماعت میں بچوں کو نظرانداز کیا جاتا تھا۔ بچوں کے حقوق اور فطرت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے درس و تدریس کے بدلنے کی ضرورت ہے۔ سوامی ویویکانند نے کہا کہ ایک استاد کو چاہیے کہ وہ بچوں کی آنکھوں سے دیکھے اور ان کے دل و دماغ سے باتیں سنے۔"

ہر ایک بچے کا ماحول اور اس کی ذہانت مختلف ہے۔ بچہ ہمہ جہت ذہانت کا مالک ہوتا ہے۔ عظیم ماہرِ نفسیات Haward Gardner (1983) نے ہمہ جہت ذہانت (Multiple Intelligence) پر اپنا نظریہ پیش کیا ہے۔ ان کے پیش کردہ خیالات یہ ہیں:

- بچہ ہمہ جہت ذہانت کا مالک ہوتا ہے۔ بچہ ذہانت اور صلاحیت کے روایتی امتحان سے جائز نہیں لے سکتا۔
- پیدائشی طور پر بچوں میں مختلف صلاحیتیں موجود ہوتی ہیں۔
- صلاحیت اور ذہانت میں بچے مختلف ہیں۔
- ہر قسم کی ذہانت بچوں میں موجود ہیں۔
- Linguistic Intelligence
- Logical/ Mathematical Intelligence
- Visual-Spacial Intelligence
- Musical Intelligence
- Intrapersonal Intelligence
- Inter Personal Intelligence
- Naturalistic Intelligence
- Existential Intelligence
- ہمہ جہت ذہانت کو مدنظر رکھتے ہوئے طریقہ درس و تدریس کو بدلنا چاہیے۔
- بچوں کو دلی اور دماغی ترقی کے لیے موقع ملتا ہے۔ پڑھائی میں پیچھے رہنے والے خود اعتمادی کے ساتھ پڑھتے ہیں۔



پہلے پہل استاد کو چاہیے کہ بچے کی ذہانت اور صلاحیت صحیح طور پر سمجھنے کی کوشش کرے اور درس و تدریس میں نئی حکمتِ عملی اختیار کرے۔

ہر ایک بچے کی خود اپنی شخصیت ہے لیکن اکثر کمرۂ جماعت میں ان کی شخصیت کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہوتی۔ بچے مختلف وجوہات سے پڑھائی میں پیچھے ہوتے ہیں، لیکن استاد اور والدین ان کی توہین کرتے ہیں یا بری نظروں سے دیکھتے ہیں۔ یہ بچوں کے لیے ناقابل برداشت ہے۔ کبھی کبھی پڑھائی کے معاملے میں سزائیں بھی دی جاتی ہیں۔

کہتے ہیں کہ تعلیم کا مقصد بچے کو اچھا شہری بنانا ہے۔ لیکن غور کرنے کی بات ہے کہ کیا بچے کو سارے وسائل تعلیم اور حقوق دستیاب ہیں؟ ایک شہری کے حقوق ان کو بھی ملنے چاہیے۔

کھیل کود بچے کی فطرت کی سب سے بڑی علامت ہے۔ بچے اپنے دوستوں کے ساتھ کھیلنے کے شوقین ہوتے ہیں۔ کھیل کے ذریعے بہت ساری صلاحیتیں اور اقدار و رویے غیر شعوری طور پر حاصل کرتے ہیں۔ بھائی چارگی، جمہوری شعور، رواداری، باہمی تعاون، سماجی شعور، ہمدردی، مسائل کشائی کی صلاحیت وغیرہ حاصل ہوتی ہیں۔ بچہ سماج کا حصہ ہے۔ سماجی میل جول سے بہت ساری باتیں وہ پڑھتے ہیں۔



بچہ آزادانہ اور فرار ماحول میں جینا چاہتا ہے۔ کسی طرح کا ذہنی دباؤ ان کے لیے ناقابل برداشت ہے۔ ذہنی دباؤ میں پڑھائی نہیں ہوتی۔ 'Learner Autonamy' بچے کی مرکزیت، ان کا ذوق و شوق کا خیال رکھنا بہت ضروری ہے۔

ہر ایک بچے کی اپنی تخلیقی قوت ہے۔ ان کی تخلیقی قوت کو ابھارنے کے لیے مواقع فراہم کرنے چاہئیں۔ تخلیقی قوت (Creativity) پیدائشی طور پر بچوں میں موجود ہوتی ہے۔ ان میں نئے علوم و فنون حاصل کرنے کا شوق ہوتا ہے۔ وہ تلاش و جستجو کر کے کچھ نہ کچھ ڈھونڈ نکالنے کا شوق رکھتے ہیں۔ وہ تلاش کرنے اور ایجاد کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

بچے گیت، کہانیاں، لطیفے وغیرہ شوق سے سنتے ہیں۔ تعلیمی عمل کو کارآمد اور موثر بنانے کے لیے ان کو برمحل استعمال کرنا چاہیے۔ بچوں کی فطرت میں توجہ دینے کی چند اور باتیں بھی ہیں:

• بچہ قدر دانی چاہتا ہے • بچہ والدین اور اساتذہ سے متاثر ہوتا ہے • جذبات و احساسات پر قابو نہیں رکھتا • مسائل کا حل خود تلاش کرتا ہے • مقابلاتی جوش رہتا ہے • تقلید کرنے کا شوقین ہوتا ہے • خود پرستی سوچ ہوتی ہے

طفل مرکوز کمرۂ جماعت میں غور کرنے کی چند اہم باتیں حسب ذیل ہیں:

- کمرۂ جماعت میں سرگرمی پر مبنی پُر مسرت تعلیم (Activity Based Joyfull Learning) کے لیے موقع ملے۔
- درس و تدریس کے ہر مرحلے میں بچوں کی رائے اور ان کی پسندیدگی کا خیال رہے۔
- کلاس کا ماحول، وسائلِ تعلیم، طریقہ تدریس وغیرہ مسرت خیز ہو۔



3/21/2018 P31.jpg (1064×1733)

ایک غیر ملکی رضاکار ہندوستانی بچوں کو پڑھاتے ہوئے



- بچوں کو نڈر اور آزادانہ طور پر تعلیمی سرگرمیوں میں حصہ لینے، سوالات پوچھنے اور اپنے خیالات پیش کرنے کا موقع فراہم کرنا۔
- سماجی مسائل کو تنقیدی نقطۂ نظر سے دیکھنے کا موقع ملے۔
- بچے کو اپنی ترقی کی راہ پر گامزن ہونے کا موقع ملے۔

معلم مرکوز میں تعلیم کی بہت ساری کمزوریاں ہیں:

- استاد کی ہدایات سوچ سمجھ کے تسلیم کرنا پڑتا ہے۔
- قوتِ حافظہ پر مبنی جانچ و جائزے کا ہونا۔
- آزادانہ طور پر سوچنے کا اپنا رویہ اور خیالات پیش کرنے کی آزادی نہیں ملتی۔
- بچوں کی معلومات اور تجربات کو نظر انداز کرتے ہیں۔
- کمرۂ جماعت کے باہر تعلیمی ماحول سے فائدہ نہ اٹھانا۔ ساری باتیں اڑے پڑے بیٹھ کر پڑھنے پر مجبور ہونا۔
- بچے کو اپنی صلاحیت اور مہارت کو ابھارنے کا موقع نہ ملنا۔

تعلیم کا مقصد معلومات (Information) کا تبادلہ نہیں بلکہ علم پر عمل آوری اور علم میں بچوں کی مدد کرنا ہے۔ ہر ایک تعلیمی سرگرمی میں بچوں کو خود سوچنے، بحث کرنے، معلومات فراہم کرنے کے لیے موقع ملے۔

بچے اپنی ضرورت کے مطابق پڑھنے میں مصروف ہوتے ہیں۔ بچوں کے دل و دماغ میں اشتیاق و جستجو پیدا ہونے سے پڑھنے کا شوق بڑھ جاتا ہے۔ تعلیمی سرگرمیوں کو اچھی طرح خوبی کے ساتھ انجام دینے کے لیے بچوں کے اندر حصولِ علم کے لیے بے قراری یا شوق پیدا کرنا اور ساتھ ہی ان کی ہمت افزائی کرنا۔

روایتی طریقۂ تدریس میں بچوں کو متحرک کرنے کے لیے انعام یا سزا سے فائدہ اٹھایا کرتے تھے۔ جدید تعلیمی نفسیات کی روشنی میں یہ خیال بالکل غلط ثابت ہوا ہے۔ یہ محرک (Motivation) عارضی ہے۔ آج کل کے ماہرِ نفسیات کہتے ہیں کہ بیرونی تحریک (Extrinsic Motivation) کے بجائے داخلی تحریک (Intrinsic Motivation) سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ کسی قسم کے بیرونی دباؤ سے کام نہیں چلے گا۔ لیکن آج کل والدین بچوں سے برابر کہتے رہتے ہیں کہ اگر امتحان میں پاس ہو گئے تو تحفہ ملے گا، ورنہ سخت سزا ملے گی۔

دھمکی اور سزا ملنے پر بچے پڑھنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ لیکن یہ تعلیم عارضی ہے۔ یہ بہت جلد بھول جاتی ہیں۔ پڑھی ہوئی باتیں کبھی بھولتی نہیں۔ وہ زندگی بھر کام آتی ہیں لیکن آج کل کیا حال ہے؟ امتحان کے بعد ساری باتیں بھول جاتی ہیں۔ قوتِ حافظہ کے متعلق ماہرِ نفسیات کہتے ہیں کہ شعوری طور پر پڑھنے والی باتیں بہت جلد بھول جاتی ہیں۔

• بیس منٹ کے اندر 32 فی صد باتیں بھول جاتی ہیں • ایک گھنٹے کے اندر 50% • ایک دن کے بعد 67% • دو دن کے بعد 72% • ایک مہینے کے بعد 79%

کمرۂ جماعت بچوں کے لیے ایک جیل خانہ ہو گیا ہے۔ ہمارے کمرۂ جماعت آج بھی عصری تقاضے اور جدید نفسیاتی نظریے کے مطابق تبدیل نہیں ہوئے ہے۔ استاد کو بچوں کے دماغ سے سوچنے اور ان کے کانوں سے سننے کے لیے آمادہ ہونا چاہیے۔

تعلیم کے دوران بچے کو مختلف جسمانی اور دماغی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ بچوں کو سزا دینے یا ذہنی دباؤ ڈالنے کے خلاف قانون ہے۔ پھر بھی اس سے نجات نہیں ملی ہے۔ اسکول کا ماحول دوستانہ اور مسرت خیز ہونا چاہیے۔ والدین خاص کر امیر والدین اپنے بچوں کو عالی شان اسکولوں میں پڑھاتے ہیں۔ بڑی بڑی عمارتیں، سہولتیں اور بیرونی خوبصورتی کو دیکھ کر بچوں کو یہاں پڑھاتے ہیں لیکن غور کرنے کی بات ہے کہ یہاں کی تعلیم کیسی ہے؟ بچوں کے ساتھ سلوک کیسا ہے؟ کیا یہاں بچوں کو آزادانہ اور بیباکی کے ساتھ پڑھنے کی سہولت دستیاب ہے؟ بشیر بدر کا شعر ہے:

اڑنے دو پرندوں کو ابھی شوخ فضا میں
پھر لوٹ کے بچپن کا زمانہ نہیں آتا

بچوں کی فطرت اور صلاحیت مانتے ہوئے علم پر عمل آوری یا حصولِ علم میں بچوں کی مدد کرنا استاد کا کام ہے۔ تعلیمی عمل میں بچے کو مصروف ہونے کے لیے تعلیم طفل مرکوز (Child Centered) سرگرمی پر مبنی (Activity Based) اور تعلیمی عمل پر مبنی (Process Oriented) ہو۔ طفل مرکوز کمرۂ جماعت میں تعلیمی عمل کے ہر مرحلے میں بچے پر دھیان دینے کی ضرورت ہے۔

Abdul Hameed Karasheery, Ghazal' P.O. Karassery Via, Mokkam Dt, Kozhikode, Kerala

http://urducouncil.nic.in/Urdu-Duniya/Urdu-Duniya-June-2012/P31.jpg 1/1

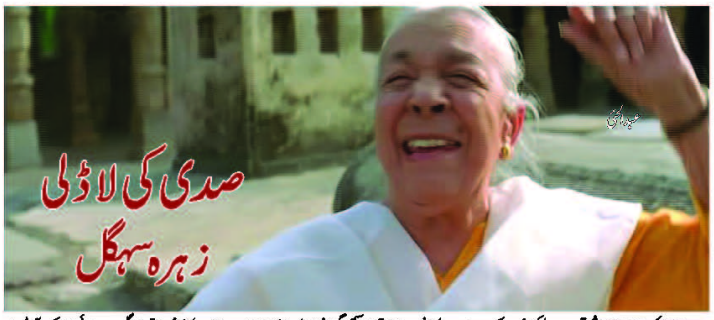

صدی کی لاڈلی
زہرہ سہگل

ہمارا ملک ہندوستان مشرق سے لے کر مغرب تک صدیوں سے ایسی کامیاب اور مقتدر شخصیات کی سرزمین رہا ہے جنھوں نے اپنے اپنے دور میں مختلف میدانوں میں کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں۔ ایسی ہی مقتدر شخصیات میں ایک معتبر نام ہے زہرہ سہگل، جن کا عزم، حوصلہ اب بھی جوان ہے۔ جوش، ولولے، جنون، امنگ اور حوصلے کا پیکر زہرہ سہگل آج بھی ایک الیژدوشیزہ ہی ہیں۔ فلم ویرزارا کے ایک سین میں فلم کی ہیروئن پر پتی زنتا سائیکل چلا رہی ہے اور ایک معمر خاتون ان سے لفٹ مانگتی ہیں اور بعد میں یہ خاتون فلم کی ہیروئن کے ساتھ آئس کریم کھانے کا مقابلہ کر رہی ہوتی ہے۔ یہ الیژ معمر دوشیزہ کوئی اور نہیں بلکہ ملک کی لاڈلی زہرہ سہگل ہیں، جنھوں نے اس سال 27 اپریل کو سنچری پوری کی ہے۔

مشہور اداکارہ و رقاصہ زہرہ سہگل ایک ایسی زندہ جاوید تاریخی شخصیت ہیں جنھوں نے اپنی اداکاری اور فنکاری سے ہندی سنیما کو گزشتہ 100 برسوں سے روشن کیا ہوا ہے۔ صاحبزادی زہرہ بیگم ممتاز اللہ خاں (زہرہ سہگل) تھیٹر اور رقص کا ایک ایسا درخشاں ستارہ ہے جس نے تاریخ کے گی ادوار کو دیکھا اور آج ملک کی معمر ترین اداکارہ کے روپ میں جانی جاتی ہیں۔ اتر پردیش میں ادبی و ثقافتی طور پر بے حد زرخیز ضلع سہارنپور میں ممتاز اللہ خاں اور ناطقہ بیگم کے یہاں 27 اپریل 1912 کو زہرہ ممتاز نے آنکھیں کھولیں۔ مشرقی گھرانے میں پیدا ہونے کے باوجود زہرہ بیگم کے رنگ ڈھنگ بچپن سے ہی نرالے تھے۔ زہرہ اپنے بچپن میں عام دوشیزاؤں کے برعکس ایک ٹام بوائے جیسی تھیں۔ پیڑوں پر چڑھنا، لڑکوں کے ساتھ کھیلنا اور لڑکوں والے سارے کام کرنا ان کی سرشت میں شامل تھا۔

بچپن میں ہی والدہ کا ساتھ چھوٹ گیا۔ سات بہن بھائیوں میں زہرہ تیسرے نمبر پر تھیں۔ ان سے بڑے ایک بھائی اور ایک بہن تھی۔ والدہ کی خواہش کے مطابق انھیں لاہور کے کوئنس میری کالج بھیجا گیا۔ اُس دور میں پردے کا سخت رواج تھا اور کبھی گھرانوں میں مذہبی رسوم اور قدیم روایات کی پاسداری کی جاتی تھی۔ زہرہ ممتاز نے بھی اپنے اسکول اور کالج کے دنوں میں ان رسوم رواجوں کو کسی حد تک اپنائے رکھا۔ اپنے ماموں صاحب زادہ سید ابا الظفر خاں کے ساتھ کار سے ایران، شام، مصر اور دمشق کی سیاحت کے لیے نکلیں اور بعد میں یورپ کی سیاحت بھی کی۔ یورپ میں ان کی ممانی انھیں میری ویلسن کے بوٹ اسکول لے کر گئیں جہاں سے انھوں نے رقص و موسیقی کی دنیا میں قدم رکھا۔ وہ پہلی ہندوستانی خاتون تھیں جس نے اس اسکول میں ڈانس سیکھا۔ یورپ میں اُودے شنکر کے رقص پروگرام شیو پاروتی کو دیکھنے کا اتفاق ہوا اور انھوں نے فیصلہ کرلیا کہ وہ ہندوستان آکر اسی فن میں مہارت حاصل کریں گے۔ میری ویلسن بوٹ اسکول میں تین سال کی مشق میں زہرہ نے ڈانس میں کافی مہارت حاصل کرلی تھی اور جب اودے شنکر نے زہرہ کا رقص دیکھا تو وہ بھی داد دیے بغیر نہ رہ سکے۔ یہ اودے شنکر وہی رقاص ہیں جنھوں نے ہندوستانی رقص کو بے انتہا اونچائیوں پر پہنچایا۔ انھیں سنگیت ناٹک اکادمی ایوارڈ، پدم وبھوشن جیسے عظیم اعزازات بھی مل چکے ہیں۔ رقص میں زہرہ ممتاز کی دلچسپی کو دیکھتے ہوئے اودے شنکر نے انھیں اپنے گروپ کے ساتھ کام کرنے کی پیش کش کی۔ زہرہ ممتاز نے ان کے ساتھ کام کرنے کی فوراً حامی بھر دی۔ سوئے اتفاق کہ کچھ دنوں بعد ہی اودے شنکر کے ڈانس گروپ نے جاپان کا دورہ کیا۔ انھوں نے زہرہ کو بھی گروپ میں شامل ہونے کی دعوت دی اور زہرہ 8 اگست 1935 سے اس بیلے گروپ کا حصہ بن گئیں اور 1940 میں ہندوستان واپس آنے سے پہلے تک انھوں نے جاپان، مصر یورپ اور امریکہ کا دورہ کیا۔ فرانسیسی رقاص سمکی نے بھی اُن کے رقص کو مزید استحکام عطا کیا۔ ہندوستان آنے کے بعد زہرہ المؤڈہ میں اودے شنکر کے ڈانس سنٹر میں کام کرنے لگیں۔ المؤڈہ میں ہی ان کی ملاقات کامیشور ناتھ سہگل سے ہوئی جو ایک آرٹسٹ، سائنس داں، رقاص اور کورگرافر بھی تھے۔ کامیشور سہگل سے مل کر زہرہ کو لگا کہ یہی وہ شخص ہے جو انھیں سب سے زیادہ خوش رکھ سکتا ہے اور ان کا ایک عظیم فنکارہ بننے کا خواب بھی شرمندہ تعبیر ہوسکتا ہے۔ 14 اگست 1942 کو زہرہ ممتاز رشتہ ازدواج میں منسلک ہوکر زہرہ سہگل بن گئیں۔ کچھ دنوں تک دونوں نے اودے شنکر کے گروپ کے ساتھ ہی کام کیا۔ اس دوران کامیشور سہگل، اور زہرہ سہگل نے اوشس ڈانس کے نام سے ایک بہت خوبصورت اور مسحور کن ڈانس ڈرامہ پیش کیا تھا۔

بعد میں دونوں نے لاہور میں زہر یلش کے نام سے رقص کا ایک ادارہ قائم کیا۔ یہ مشیر کا بٹوارے اور ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد تیز ہونے لگی تھی۔ اس وقت لاہور تہذیب و ثقافت کا ایک اہم مرکز مانا جاتا تھا اسی لیے دونوں نے المؤڈہ سے لاہور جا کر سکونت اختیار کی تھی لیکن حالات نے انھیں لاہور سے ممبئی نقل مکانی کرنے پر مجبور کردیا۔ جس وقت وہ ممبئی آئیں وہ دور پرتھوی تھیٹر کے عروج کا تھا۔ ان کی بہن عذرا بٹ پہلے سے ہی پرتھوی راج کپور کے ساتھ کام کر رہی تھیں۔ زہرہ نے بھی 1945 میں پرتھوی تھیٹر جوائن کرلیا اور 14 برسوں تک جڑی رہیں۔ اُس وقت ان کی ماہانہ تنخواہ محض 400 روپے تھی۔ پرتھوی تھیٹر سے جڑنے کے بعد ان کی اداکاری اور رقص میں مزید نکھار آیا۔ 1945 میں ہی انھوں نے مشہور تھیٹر گروپ اپٹا میں شمولیت اختیار کی۔ اپٹا ویسے تو تھیٹر کی دنیا میں ایک معروف نام رہا ہے لیکن اس گروپ نے 1942 میں اپنے قیام کے تین سال بعد 1945 میں ایک فلم دھرتی کا لال پیش کی۔ اپٹا کی جانب سے شاید یہ واحد فلم تھی۔ اس فلم کے ہدایت کار خواجہ احمد عباس اپٹا کی کارکردگی اور پیش کش سے کافی متاثر تھے۔ خواجہ احمد عباس نے اپنی پہلی فلم کو اپٹا کے ڈراموں پر ہی فلمانے کا فیصلہ کیا اور اس فلم کے تقریباً تمام کردار اپٹا کے

ممبران تھے۔ انھوں نے زہرہ سہگل کو فلم میں کام کرنے کی پیش کش کی۔ یہ فلم کرشن چندر کے افسانے ان داتا اور بیجون بھٹا چاریہ کے لکھے مختلف ڈراموں پر مبنی تھی۔ یہ پہلی ہندی فلم تھی جسے روس میں بھی ناظرین کے لیے پیش کیا گیا تھا۔ اس طرح زہرہ سہگل پہلی ہی فلم سے ملک اور بیرون ملک مشہور ہوگئیں۔ یہی وہ فلم تھی جس میں بلراج ساہنی کا اہم کردار تھا۔ اپنی اس دوسری فلم سے بلراج ساہنی کو بے حد مقبولیت حاصل ہوئی۔ زہرہ سہگل کی بہترین اداکاری کو دیکھتے ہوئے انھیں چیتن آنند کی ہدایت میں بنی اور خواجہ احمد عباس کی تحریر کردہ فلم نیچا نگر میں بھی کام دیا گیا۔ اس فلم کو 1946 کے کان فلم فیسٹول میں ایوارڈ سے بھی نوازا گیا۔ 1959 میں اُن کے شوہر کی خودکشی کے بعد وہ جیسے بکھر کر رہ گئیں۔ شوہر کو یاد کرتے ہوئے زہرہ بتاتی ہیں کہ وہ اتنے کمزور نہیں تھے کہ خودکشی کرلیں، ایک بہترین آرٹسٹ، تجربے کار کوریوگرافر، ماہر رقاص اور بہت پیار کرنے والے شوہر تھے لیکن انھیں وہ سب کچھ نصیب نہیں ہوسکا جس کے وہ حقدار تھے، ان کے خواب کبھی شرمندہ تعبیر نہیں ہوئے۔ ان میں جتنی لیاقت اور صلاحیت تھی اس کی ٹھیک طرح پزیرائی نہیں ہوئی اور اسی غم نے انھیں اس طرح موت کو گلے لگانے پر مجبور کردیا۔

شوہر کے بچھڑ جانے کے بعد زہرہ کچھ دنوں تک دہلی میں رہیں۔ اُس کے بعد ایک اسکالرشپ پر لندن گئیں۔ وہاں انھوں نے ڈراموں کے ساتھ ساتھ برٹش ٹی وی سیریز اور فلموں میں بھی کام کیا۔ اس کے علاوہ BBC کے مختلف پروگراموں کی اینکرنگ کی ذمے داریاں بھی بخوبی نبھائی۔ واپس ہندوستان آنے کے بعد زہرہ نے ملک کے مختلف مقامات پر اردو اور پنجابی نظموں کو پیش کیا۔ اسی دوران انھیں پاکستان جاکر نظم خوانی کرنے کی دعوت بھی دی گئی وہاں انھوں نے حفیظ جالندھری کی مشہور نظم 'ابھی تو میں جوان ہوں' پڑھی جو ان کی نظم خوانی کی وجہ سے کافی مقبول ہوئی۔ 1993 میں ان کا ڈراما 'ایک تھی نانی' لاہور میں پیش کیا گیا جس میں پاکستان جانبی اُن کی بہن مشہور تھیٹر آرٹسٹ عذرا اور خود زہرہ سہگل نے اداکاری کی تھی۔ اس ڈرامے کو مختلف انعامات بھی ملے اور انھیں صدی کی لاڈلی کے خطاب سے نوازا گیا۔ زہرہ سہگل نے ٹی وی سیریل، ملا نصیرالدین میں بھی لاجواب اور انوکھے انداز میں کام کیا ہے اور آج بھی ٹی وی ناظرین انھیں اس سیریل کے لیے یاد کرتے ہیں۔ زہرہ سہگل آج ایسی واحد باحیات اداکارہ ہیں جس نے فلمی دنیا کی 4 نسلوں پر تھوی راج کپور سے لے کر رنبیر کپور کے ساتھ کام کیا ہے۔

ابتا بھ بچن جب خود والد اور دادا کا رول ادا کررہے تھے۔ اُس وقت ان کی والدہ کا کردار زہرہ سہگل نے ادا کیا۔ 'چینی کم' نامی اس فلم میں زہرہ سہگل اپنے خوبصورت اور برجستہ جملوں کے لیے آج بھی جانی جاتی ہیں۔ سائیکل چلانے کی بات ہو، گوندا کے ساتھ لڑنے کا سین ہو یا موٹر یا بائک چلانا ہو، یا پھر اس عمر میں عامر خان کی مدد سے اپنے لیے لڑکا تلاش کرنا ہو، زہرہ سہگل نے ہر کردار میں جان ڈال دی ہے۔ آج بھی ان کی شخصیت اور ان کا کردار ہم سبھی کو ایک نئے جذبے اور جنون کی ترغیب دیتا ہے۔ آج اس عمر میں بھی وہ ایک الھڑ دوشیزہ کی طرح کھلکھلاتی ہیں۔ مذاق کرتی ہیں اور نظمیں سناتی ہیں۔ اُن کا یہ بلند حوصلہ ان ہی کی پڑھی نظم 'ابھی تو میں جوان ہوں' کو سچ ثابت کرتا ہے۔

ان کی بیٹی کرن سہگل نے اپنی والدہ کی شخصیت اور فن پر ایک کتاب لکھی ہے جس کا ان کی سوویں سالگرہ پر دلی میں عزت مآب گرشرن کور کے ذریعے اجرا کیا گیا اس موقع پر گرشرن کور صاحبہ نے کہا کہ یہ ان کے لیے بڑے فخر کی بات ہے کہ آج امی (زہرہ سہگل) نے سو برس پورے کرلیے ہیں۔ اس اجرا کی تقریب میں جب زہرہ سہگل نے اپنے انداز میں یہ گنگنایا کہ ''ابھی نہ جانا چھوڑ کر کہ کیا ابھی کٹا نہیں کہ پیٹ ابھی بھرا نہیں...'' تو وہاں موجود سبھی لوگ بے تحاشہ ہنس پڑے اور اس معرکہ گرما کو خوب خوب داد دی۔

کرن سہگل نے اِس کتاب میں ایک جگہ لکھا ہے۔

''اُن کے اندر کی اداکارہ اسکول کے پہلے سال میں ہی نظر آگئی تھی۔ سات سال کی عمر میں ان کو ایک پلے ''دی روز اینڈ دی رنگ'' میں شیر کا کردار ادا کرنا تھا۔ شیر بننے کے لیے انھوں نے بھورا چوڑی دار پاجامہ پہنا اور اسی رنگ کے پائیدان کو پیٹھ پر باندھ لیا۔ اِسی وقت اسٹیج سے ان کا نام پکارا گیا۔ انھوں نے اردو کے ایک کوئز میں جیت حاصل کی تھی۔ کسی نے دوڑ کر انھیں خبر دے دی۔ جوش میں آکر وہ ننھا شیر فوراً اسٹیج کی جانب دوڑ پڑا۔ ان کی اس معصومیت پر سب لوگ بے ساختہ ہنس پڑے''۔

کرن سہگل ایک دوسرا دلچسپ واقعہ یاد کرتے ہوئے لکھتی ہیں کہ:

''خالہ عذرا پرتھوی راج (پاپا جی) کے زیادہ تر ڈراموں کے لیڈ رول میں نظر آئیں۔ اپنی پوزیشن اور دبدبے کے باوجود امی کو لگتا تھا کہ عذرا خالہ کو ان کی خوبصورتی کی وجہ سے زیادہ یاد کیا جاتا ہے۔ اس سے امی نے خود میں



زہرہ سہگل اپنی بیٹی کرن سہگل کے ساتھ

کامپلیکس ڈیولپ کرلیا اور خوبصورت دکھائی دینے کے جتن شروع کردیے۔ ذاتی طور پر کہوں یہ میرے اور آپ کے بیچ کی بات ہے۔ میری آنٹی خوش مزاج اور اچھی خاتون تھیں۔ میری ماں کو آج تک وہ کمپلیٹ یاد ہے جب امریکہ میں ایک پرفارمنس کے بعد کوئی اُن سے بیک اسٹیج ملنے آیا اور مس ممتاز کے بارے میں پوچھا۔ ڈریسنگ روم کے پاس کھڑے چوکیدار نے پوچھا کون سی والی، جس کے ہونٹ بڑے ہیں یا جس کے کولھے بڑے ہیں''۔

زہرہ سہگل نے اپنی صد سالہ زندگی میں ڈھیروں نشیب و فراز دیکھے۔ انگریزی، اردو، ہندی اور پنجابی کی مختلف فلموں اور ٹی وی سیریلوں میں کام کیا۔ زہرہ بیگم نہ صرف اچھی اداکارہ ہیں بلکہ ایک بہترین رقاصہ، کوریوگرافر اور ہدایت کار بھی ہیں۔ انھوں نے 25 سے زائد ہندی فلموں میں کام کیا ہے۔ اُن کی کچھ اہم فلمیں ہینڈ اٹ لائک بیکھم، دل سے، ہم دل دے چکے صنم، چلو عشق لڑائیں، کبھی خوشی کبھی غم، چینی کم، مائی ہیوٹی فل لاؤنڈریٹے، تندوری نائٹس، جیول ان دا کراؤن، ویرزارا اور سانوریا ہیں۔ ان کی بیٹی کرن سہگل مشہور اوڈیسی ڈانسر ہیں۔ ان کے لائق فرزند پون ورلڈ ہیلتھ آرگنائزیشن کے لیے کام کرتے ہیں۔ زہرہ سہگل کو اب تک سنگیت ناٹک اکادمی ایوارڈ، پدم شری، کالی داس سمان، پدم بھوشن، سنگیت ناٹک اکادمی فیلوشپ، پدم وبھوشن جیسے اعزازات سے نوازا گیا ہے۔ زہرہ سہگل کروڑوں افراد کی لاڈلی ہیں اور صدی کی اس سب سے معمر اداکارہ کو آج بھی اپنے دلوں میں بسائے ہوئے ہیں۔ دعا ہے کہ زہرہ سہگل اسی طرح ہمیشہ ہنستی مسکراتی اور کھلکھلاتی رہیں۔

(**ماخذ**: وکی پیڈیا اور کتاب زہرا سہگل فینی، کرن سہگل، نیوگی بکس، نئی دہلی)

Dr. Abdul Hai,152, Periyar Hostel, JNU, New Delhi 110067

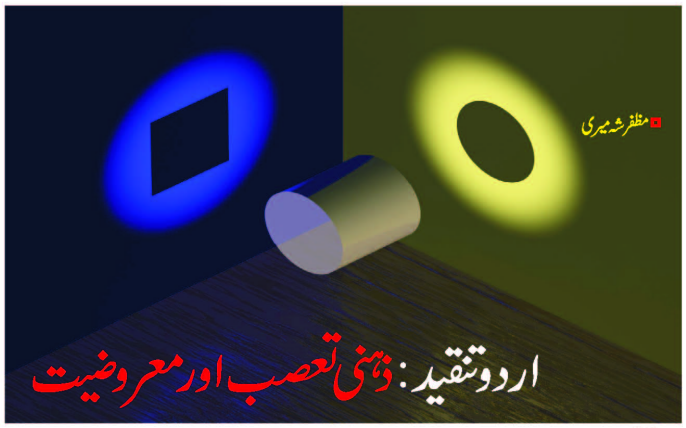

اردو تنقید: ذہنی تعصب اور معروضیت

مظفر شہ میری

تنقید اگر ہمدردانہ رویے سے محروم ہوجائے تو وہ ذہنی تعصبات اور ذاتی تحفظات کی شکار ہوجاتی ہے۔ ہمدردانہ رویے سے مراد وہی رویہ ہے جس کے تحت یہ خیال اُبھرے کہ ناقد اپنے آپ کو فن کار کی جگہ رکھ کر دیکھے کہ اگر وہ اس کی جگہ ہوتا تو وہ اپنے اظہار کے کن پیمانوں کا انتخاب کرتا اور وہ ان کے مابین پر کتنا کامیاب ہو پاتا۔ اسکاٹ جیمس کا خیال صحیح معلوم ہوتا ہے کہ 'ناقد کو تخلیق کرنے والے کا درجہ حاصل کرلینا چاہیے' (بحوالہ فن تنقید اور تنقیدی مضامین، پروفیسر فہم الہدیٰ، ص 196،29) ہمدردانہ رویے سے وہ رویہ بھی مراد ہے جس کے تحت ایک ناقد اپنے آپ کو شفافیت کی کسوٹی پر کسے اثبات کرے۔ اس سے یہ بھی مراد ہے کہ ناقد اپنے قلم کو اپنی ذاتیات سے آلودہ نہ کرے۔ شومیکر Schumaker کے قول کے مطابق 'ذاتی پسند یا ناپسندیدگی کی ظلی اندازی کے بغیر غیر جانب داری کے ساتھ اشیا کو ان کی صحیح شکل وصورت میں دیکھنے کی کوشش کا نام تنقید ہے' (کتاب مذکور ص 7) لہٰذا ناقد کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ اپنی ذاتیات سے اُوپر اٹھ کر عملی تنقید کے میدان میں قدم رکھے۔ ناقد کا ہمدردانہ رویہ تقدیرِ قلم کا ترجمان ہوتا ہے۔ اس کی تنقید میں جہاں استحکام وصلابت ہوتی ہے وہیں اس کے اندر اپنے بحر فہم وادراک کو قبول کرنے کا حوصلہ بھی ہوتا ہے۔ یہی رویہ اسے آفاقی معیارِ تنقید تک پہنچاتا ہے۔ جو تنقید متعصب ذہنی رویے کی شکار ہوتی ہے وہ ہمدردی، شفافیت، آفاقی معیار اور صلابت رائے سے محروم ہوجاتی ہے۔

اردو تنقید کی تاریخ متعصب رویوں سے بھری پڑی ہے۔ یہاں ان کا ذکر کرنا مناسب ہے نہ ضروری۔ البتہ مجموعی طور پر ان پر ایک نظر ڈال لینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ ہمارے یہاں ایک شاعر کو دوسرے شاعر پر تعصب کی بنا پر فوقیت دینے کی روایت کافی قدیم ہے۔ شاگردوں کا اپنے اپنے اساتذہ اور اساتذہ کا اپنے اپنے شاگردوں کے نام روشن کرنے کے لیے ان کے ہم عصر و ہم مرتبہ فنکاروں کا مرتبہ گھٹانا اور ان کی خوبیوں سے چشم پوشی کرنے کو ایک فریضہ سمجھا گیا ہے۔ ایک تحریک کا دوسری تحریک سے وابستہ فن کاروں کو سرِ عام رسوا کرنا یہ منزلہ ادبی فریضہ ٹھہرایا گیا ہے۔ نظریاتی تنازعات اس پر مستزاد ہیں۔ علاقائی تعصبات کی مثالیں پچاسوں اور اہلِ زبان وغیر اہلِ زبان کے قصیے بیسیوں، دو پڑوسیوں کی طرح دو پڑوسی ملکوں کے ادیبوں اور فن کاروں سے مرعوب ہوجانا یا انھیں سرے سے قابلِ اعتنا نہ سمجھنا وغیرہ ہمارے متعصب ذہن کی ادنیٰ کرشمہ سازیاں ہیں۔ پروفیسر ابوالکلام قاسمی کے ان الفاظ کو میں یہاں ضرور یاد کرنا چاہوں گا۔ وہ بہ حیثیت مدیر الفاظ رقم طراز ہیں:

''اس وقت ہمارے یہاں اچھی اور معروضی تنقید برائے نام لکھی جارہی ہے، جس میں ادبی خلوص اور دیانت داری بنیادی حیثیت رکھتی ہو۔ ورنہ زیادہ تر مضامین گروہ بندی کے مزاج کو تقویت بخشنے والے ہوتے ہیں۔'' (بحوالہ کان اور ذہن، ص 10، 2008)

سوال یہ ہے کہ ہم ایسے کیوں ہیں؟ کیا ہمارا معاشرہ ہی ایسا ہے؟ کیا ہماری نفسیات ہی ایسی الجھی ہوئی ہے کہ ہم ہیرو پرستی سے اوپر اٹھ نہیں سکتے؟ کیا ہمارے آدابِ معاشرت کی بنیاد اس خام خیالی پر رکھی گئی ہے کہ ادب کا تقاضا یہ ہے کہ ہم اپنی وضع داری نبھانے کے لیے ہیرے کو ٹکڑا اور ٹکڑا کو ہیرا کہتے رہیں؟ کیا ہمارے اندر یہ بے اعتمادی جڑ پکڑ چکی ہے کہ ہم کسی گروہ میں رہ کر ہی اپنی شناخت بنا سکتے ہیں ورنہ گروہ کی نظر ہو جائیں گے؟ کیا ہم سمجھتے ہیں کہ کسی کی قصیدہ خوانی کے گھنے درخت کے نیچے ہی ہم کری نشین ہوسکتے ہیں؟ کیا ہم اپنی مخصوص قابلیت اور محدود علمیت کے بل بوتے پر دنیا کو چلانے کی کوشش کرتے ہیں؟ کیا ہم میں سے ہر کوئی خود کو نابغہ روزگار سمجھنے کی خود فریبی میں مبتلا ہے؟ اگر ان سوالوں کے جواب 'ہاں' میں ہیں تو میں یہی کہوں گا کہ enough is enough بہت ہو چکا۔ اب وہ وقت آگیا ہے کہ ہم اپنا جائزہ لیں اور مثبت اقدامات کرکے اردو تنقید کو بے جا تعصبات وتحفظات سے پاک کریں۔

ذہنی تعصب کی ایک صورت مجھے ناقد کی تن آسانی میں نظر آتی ہے۔ فن پارے کو غور سے نہ پڑھنا، اُس کے مضمرات کو صفائی کے ساتھ نہ سمجھنا اور اُس کا صحیح تجزیہ نہ کرنا وغیرہ تن آسانی کی غمازی کرتے ہیں۔ بایں وجہ تنقیدی ڈسکورس میں کھلبلیے در آتے ہیں۔ اس کی وجہ سے تنقید کا وہی روپ جلوہ گر ہوتا ہے جس کے بارے میں اجمالاً یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ یہ وہ سہرا ہے جس میں نام بدل دیا جائے تو کسی بھی نوشہ پہ فٹ بیٹھ سکتا ہے۔ یہ کام تعصبِ ذہنی کا مظہر اس لیے بھی ہے کہ ناقد کا یہی رویہ نامور فن کاروں کے ساتھ نہیں ہوتا یا ان فنکاروں کے ساتھ نہیں ہوتا جن پر لکھنے کی صورت میں گرفت کا خدشہ لاحق رہتا ہے۔ ناقد یہ کام صرف اُن فن کاروں کے ساتھ کرتا ہے جنھیں وہ بنائے تعصب قابلِ اعتنا نہیں سمجھتا۔

ذہنی تعصب کی ایک وجہ صحیح تحقیق نہ کرنا یا تحقیق کرنے میں لاپرواہی کا مظاہرہ کرنا بھی۔ اردو دنیا ایک

وسیع وعریض دنیا ہے۔ جب ہم کسی ادب پارے پر تنقید کرتے ہیں تو ہمارا فرض بنتا ہے کہ اُس ادب پارے کے حوالے سے جتنے نمونے ملیں اُن سب کا مطالعہ کریں اور کسی نتیجے پر پہنچیں لیکن ایسا کم ہی ہوتا ہے۔ تنقید کرتے ہوئے ہم کسی نہ کسی علاقے کو فراموش کر جاتے ہیں یا عمداً اُسے پسِ پشت ڈال دیتے ہیں۔

ذہنی تعصب یہ بھی ہے کہ کسی پر بے حساب لکھا جائے اور کسی کو زینتِ طاقِ نسیاں بنا دیا جائے۔ بے حساب لکھنے سے میری مراد ہے لکھی ہوئی چیزوں کو عناوین اور اسلوب بدل کر بار بار دہرانا یا ڈھونڈ ڈھونڈ کر محاسن و معائب نکالنا وغیرہ۔ طاقِ نسیاں پر رکھنے سے مراد یہ ہے کہ کسی فن کار میں دو ایک محاسن کے سوا کچھ اور نہ دیکھ پانا اور پھر اُنھیں مضیٔ بستی سے مٹا دینا وغیرہ۔ ان سب رویوں کا تعلق کسی نہ کسی طرح ناقد کے ذہنی تعصب سے ثابت ہوتا ہے۔

ذہنی تعصب اور ذاتی تحفظات کا ایک نمونہ یہ بھی ہے کہ اگر ہمارے کسی ناقد کو کوئی مغربی یا مشرقی ناقد یا شاعر پسند آجائے تو وہ اُسے اپنا خدا بنا لیتا ہے۔ اب وہ جو دیکھتا ہے اُسی کی نظر سے دیکھتا ہے۔ جو سوچتا ہے اُسی کے ذہن سے سوچتا ہے۔ اُس کی اس راہِ طلب میں ہماری ادبی روایات، ہماری تہذیب اور ہمارے زبان و ادب کا مزاج سب کچھ قربان ہو جاتا ہے۔ ستم بالائے ستم یہ ہے کہ جب اس ناقد کے سر سے اپنے پسندیدہ دانش ور کا سودا ختم ہو کر کسی دوسری عبقری شخصیت کا جادو بولنے لگتا ہے تو وہ ایک نئے سفر پر لطف کا آغاز کرتا ہے جو نئے ادبی مراحل و مسائل کا نقیب ہوتا ہے۔

کم علمی اور ناآگہی تعصب کو جنم دیتی ہیں۔ تنقید کو متعصب بنانے میں بھی ان کے کردار سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ تعصب کے علاوہ ان سے ضد اور ہٹ دھرمی بھی پیدا ہوتی ہے۔ اسی سطح کے ناقد سے چیخوف نے اپنی بیزاری کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا کہ ''ناقد وہ بھی ہے جو گھوڑے کو ہل چلانے سے روکتا ہے۔'' بحوالہ فن تنقید اور دوسرے مضامین، ص 11

یہ چند مشاہدات ہیں تنقید اور اردو تنقید کے بارے میں ظاہر ہے یہ حرفِ آخر نہیں ہیں۔ سرِ دست یہ دیکھتے ہیں کہ اردو تنقید کو ذہنی تعصبات اور بے جا تحفظات سے کیسے نجات دلائی جاسکتی ہے؟

تعصب اصطلاحاً اُس جذبے کو کہا جاتا ہے جس کی پٹی آنکھ پر باندھ دی جائے تو وہ دوسرے افراد اور دوسری قوموں میں موجود محاسن کو دیکھنے سے قاصر ہوتا ہے۔ اس کی وجہ سے دوہرا نقصان ہوتا ہے؛ ذاتی طور پر اُس کا بھی اور مجموعی طور پر اُس کی قوم یا اُس کے زبان و ادب کا بھی۔ چناں چہ ہم میں پہلی صفت یہ پیدا ہونی چاہیے کہ ہم محاسنِ شعر و ادب سے چشم پوشی نہ کریں خواہ وہ ہمارے بدترین مخالف ہی میں کیوں نہ موجود ہوں۔

ہم میں اتنی سچائی ہونی چاہیے کہ ہم رات کو رات اور دن کو دن کہہ سکیں۔ تاکہ ہم ایک دوسرے کی قصیدہ خوانی کے اتہام سے بچ سکیں۔ بے محل نہ ہوگا اگر یہاں ایک قطعہ آپ کے گوش گزار کروں:

زاغ و زغن نے ٹوٹے مکانوں پہ بیٹھ کر
اک دوسرے کو دیکھ کے دل شاد کرلیا
پھر ایک دوسرے کے قصیدوں کے شور سے
اجڑے ہوئے دیار کو آباد کرلیا

یہ بڑا خطرناک رجحان ہے کہ ہم اپنے دوستوں کے صرف محاسن دیکھیں اور اُن کے معائب سے چشم پوشی کرلیں۔ اس طرح تو قصرِ ادب سارے کا سارا ڈھ کر رہ جائے گا۔



پھول کو پھول اور خار کو خار کہنے کی بے تعصب عادت تربیت سے پڑتی ہے۔ یہ تربیت ماں باپ کے علاوہ اساتذہ سے ملتی ہے۔ اساتذہ کو یہ کوشش کرنی چاہیے کہ وہ اپنے طلبا کو سچی تنقید کرنے کی تربیت دیں۔ یہ اس سے بہتر ہے کہ ہم اپنے عمر رسیدہ ناقدوں کو اُن کے راستوں سے موڑنے کی کوشش کریں۔ اس ضمن میں ہمارے تجربہ کار ناقدین نئی نسل کے لکھنے والوں کی رہ نمائی فرمائیں۔

جس طرح ادب کو خانوں میں تقسیم کرنے سے تخلیقِ شعر و ادب میں رکاوٹیں پیدا ہو سکتی ہیں، اسی طرح تنقید کو بھی خانوں میں تقسیم کرنے سے تنقیدِ عالیہ کے پیدا ہونے میں اڑچنیں پیدا ہو سکتی ہیں۔ خاص طور پر تنقید کے وہ خانے جو بہ بنائے تعصبات و تحفظات بنائے گئے ہوں۔ چنانچہ جس طرح ادب کو ادب ہونا چاہیے اُسی طرح تنقید کو بھی تنقید ہونا چاہیے۔ اُس کا کام یہ ہو کہ وہ فن پاروں کو صفر خامی (zero error) کے ساتھ جانچے۔ اُس کے محاسن کی تحسین کرے اور اُس کی خامیوں کو دور کرنے کے مشورے دے اور اس عمل میں ناقد ہر طرح کے تعصبات و تحفظات سے اوپر اٹھے۔

تنقید کے کئی دبستان ہیں۔ کسی فن پارے کو پرکھنے کے لیے ضرورتاً ہر دبستانِ فکر سے مدد لی جاسکتی ہے۔ کسی ایک دبستان کی عینک سے دیکھنے سے فن پارے کا ایک ہی رخ سامنے آئے گا، دوسرا رہ جائے گا۔ اس خصوص میں بھی ہمیں تعصب سے اوپر اٹھنے کی ضرورت ہے۔

خیر و حسن کی تلاش میں نکلیں گے تو ہمیں بدی اور بدصورتی بھی راہ میں ملے گی۔ مگر چوں کہ ہماری آنکھیں خیر و حسن کی متلاشی ہیں ہم اسے دیکھ کر جھنجھلا نہیں جائیں گے اور شاید اُس کے ساتھ ہمدردی کا معاملہ کریں گے لیکن اس کے برخلاف اگر ہم بدی اور بدصورتی کی تلاش میں نکلیں گے تو خیر و حسن کی برکتوں سے یکسر محروم ہو جائیں گے کیونکہ اس طرح ہماری آنکھوں میں بدی اور بدصورتی کے سوا حسن کی کوئی تصویر نہیں ہوگی۔ چناں چہ اگر تلاشِ خیر و حسن منصبِ تنقید بن جائے تو حسن کی پذیرائی ہوگی اور بدصورتی کے ساتھ ہمدردی کا جذبہ پیدا ہوگا۔ مجھے یہاں یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ ذہنی تعصب بھی بدصورتی کا ایک نمونہ ہے۔

تنقید میں آفاقیت کا عنصر اُسی وقت جگہ پا سکتا ہے جب وہ ہر طرح کے تعصبات اور تحفظات سے اپنے دامن کو پاک رکھے۔ یہ اسی وقت ممکن ہو سکتا ہے جب ہم بنا تعصب کے خوبیوں کی پذیرائی کریں اور بنا کسی تحفظات کے خامیوں کی حوصلہ شکنی کریں۔

اختر الایمان نے تخلیقی عمل کے اخلاص و انہماک کے لیے 'مذہب' کا لفظ استعمال کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''شاعری میرے نزدیک کیا ہے؟ اگر میں اس بات کو ایک لفظ میں واضح کرنا چاہوں تو 'مذہب' کا لفظ استعمال کروں گا۔ کوئی بھی کام جسے انسان دیانت داری سے کرنا چاہے، اس میں جب تک وہ لگن اور تقدس نہ ہو جو صرف مذہب سے وابستہ ہے اس کام کے اچھا ہونے میں شبہ کی گنجائش رہے گی۔''

میں یہی لفظ تنقید کے لیے استعمال کرنا چاہوں گا۔ تنقید میں بھی اسی دیانت داری کی ضرورت ہے۔ وہ ہر طرح کے تعصبات اور تحفظات سے پاک ہو۔ ورنہ وہ اپنے فرضِ منصبی کے ادا کرنے میں ناکام ہو جائے گی۔

Dr. Muzaffer Ali Shahmiri, Professor Dept of Urdu, University of Hyderabad, Gachi Bowli, Hyderabad 46

3/21/2018 P36.jpg (2470×3313)

قاضی عبیدالرحمٰن ہاشمی

عبدالمغنی کی اقبال شناسی

اقبال کی پذیرائی اور قدرشناسی کرنے والے صاحبانِ نظر میں پروفیسر عبدالمغنی کا نام خاص طور پر لیا جاتا ہے۔ پیشے کے لحاظ سے پٹنہ یونیورسٹی میں انگریزی ادبیات کی تدریس سے وابستہ ہونے کے باوجود اقبال کی اردو فارسی شاعری سے ایسا والہانہ عشق اور ذہنی وجذباتی شغف کم ہی دیکھنے میں آتا ہے۔ یہ کہنا تو شاید درست نہ ہوگا کہ پروفیسر مغنی نے خود کو صرف اقبالیات کے لیے وقف کردیا، اس لیے کہ انھوں نے اردو شاعری اور فکشن سے بھی خصوصی رغبت کا مظاہرہ کیا۔ چنانچہ قرۃ العین حیدر کی فنکارانہ عظمت سے اپنی ذہنی وابستگی کے نتیجے میں انھوں نے 'قرۃ العین حیدر کا فن' لکھ کر کافی شہرت اور مقبولیت حاصل کی۔ تاہم انھوں نے اقبال کی شاعری میں ایک خاص رغبت اور کشش محسوس کی، اقبال کی شاعرانہ عظمت اور فکری عبقریت سے اس درجہ متاثر ہوئے کہ اپنی زندگی بیشتر اسی محور کے گرد طواف کرنے اور اقبال کی تعبیر وتشریح اور تفہیم کی نذر کردی۔ البتہ اقبال کے مطالعات میں ان کے گہرے انہماک اور اس قلزمِ فکر کی شناوری میں کچھ حصہ کلیم الدین احمد کا بھی کہا جاسکتا ہے جنھوں نے اقبال پر اپنی کتاب۔ 'اقبال ایک مطالعہ' لکھ کر جسے ان کی اقبال شکنی سے ہی تعبیر کیا جائے گا، مغنی صاب کو اس قدر اکسایا کہ انھوں نے کلیم الدین احمد جو ان کے استاد بھی تھے ان کی زندگی ہی میں ان کی کافی خبر لی، تاہم اس بہانے اقبال مطالعات میں ان کی سچی علمی خدمات کے عوض گراں قدر اضافے بھی ہوئے۔ خصوصاً ان کی دو اہم تصانیف 'اقبال اور عالمی ادب' 1982 اور 'اقبال کا نظام فن' 1985 اقبال اکیڈمی پاکستان سے شائع ہوئیں اور اردو دنیا میں بے حد مقبول ہوئیں۔

اقبال کی شاعرانہ عظمت اور تخلیقی قدر وقیمت کے تناظر میں مغنی صاحب کا یہ بیان نہ صرف نہایت دلچسپ ہے بلکہ بیک وقت ان کی مشرقی ومغربی ادبیات کی تاریخ سے حیرت انگیز باخبری کا بھی ثبوت ہے۔ فرماتے ہیں:

''کیا اردو تنقید کو خبر ہے کہ جس غزل کے نام سے ہمارے مغرب پرست نقاد جھینکتے ہیں اس پر ہی مشتمل مغرب کے دورِ جدید کے سب سے بڑے شاعر گیٹے کا مشہور ومعروف مجموعہ کلام 'مغربی دیوان' ہے جو اس نے فارسی غزلوں کے زیر اثر اور ان کی تقلید میں ترتیب دیا تھا۔ کیا اردو تنقید کو علم ہے کہ گیٹے کی ہی متغزلانہ شاعری تھی جس نے انگریزی میں رومانیت کی تحریک کو پروان چڑھایا اور پھر اس رومانیت کے نتیجے میں فرانس کی اشاریت Symbolism پیدا ہوئی اور اسی اشاریت کا عکس انگریزی شاعری کی پیکریت میں نمودار ہوا جس کے تحت TS Eliot کے فن نے تربیت پائی۔ ان سوالوں کے جوابات بدقسمتی سے نفی میں ہیں یہی وجہ ہے کہ اردو غزلوں کی آفاقی قدروں اور اس کے کائناتی



عناصر نیز جمالیاتی اثرات اور اخلاقی مضمرات کی تشریح اردو میں ابھی تک نہیں ہوسکی ہے۔''

اردو تنقید کی نارسائی کا شکوہ اس قدر بے جا بھی نہیں ہے کہ اس پر یقیناً مغرب پرستی کا بھوت کچھ زیادہ ہی سوار رہا ہے جس کے نتیجے میں آج ہمارے احساس کمتری کا یہ عالم ہے کہ ہم نے اپنی مشرقی تہذیب، باقیات اور اقدار جن میں حسن، خیر اور صداقت کا سب سے بڑا سرچشمہ مذہب اور روحانیت کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر شامل ہے، ان تمام چیزوں کو حقیر اور کم مایہ سمجھ کر ان سے خود کو منقطع کرلیا اور تمام وکمال فنافی المغرب ہوگئے، جس کے نتائج جس قدر اندوہ ناک ہیں اس کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ عبدالمغنی صاحب کا یہ کہنا بھی درست ہے کہ یہی وہ مغربی میزانِ قدر ہے جو عیسائی عقائد وتوہمات پر مبنیٹی ایس ایلیٹ اور Yeats W B وغیرہ کی شاعری کو قدر اوّل کا شعری تجربہ بناتی ہے لیکن اسلامی افکار ونظریات کی حامل اقبال کی شاعری بے اوقات ٹھہرتی اور صرف ایک خاص گروہ تک محدود ہوکر رہ جاتی ہے، ظاہر ہے کہ اس تعصبِ ذہنی کا علاج ممکن نہیں ہے۔

اقبال بے شک ہمارے ان نابغہ روزگار شاعروں میں ہیں جن سے بیسویں صدی کی شاعری نہ صرف پہچانی جاتی ہے بلکہ ان کی بدولت ہماری شاعری فن اور فکر کی اس رفعت تک پہنچتی ہے کہ وہ دنیا کی کسی زبان کی بڑی سے بڑی شاعری کے بالمقابل رکھی جاسکتی ہے، خصوصاً نظم کی حد تک یہ امتیاز اور اعتبار ہماری شاعری کو اقبال سے پہلے کبھی نصیب نہیں ہوا۔ تاہم ہمیں یہ ضرور دیکھنا ہوگا کہ اقبال کو اس سربلندی اور کمال سے ہمکنار کرنے میں کیا صرف ان کے مذہبی فکر وفلسفے اور اسلامی موضوعات کا ہی حصہ ہے یا ان کی تخلیقی ہنرمندی اور فنی وجمالیاتی تدابیر کا بھی کوئی کردار ہے۔ مغنی صاحب اس رمز سے بخوبی واقف ہیں اور انھیں معلوم ہے کہ شاعری صرف اور صرف اعلیٰ خیالات اور زریں افکار کے بل بوتے پر وجود میں نہیں آتی، اس کی نمود میں شاعر کی تخلیقی فطانت ایک اہم اور کلیدی کردار ادا کرتی ہے۔ مغنی صاحب خود فرماتے ہیں:

''اقبال کی شاعرانہ عظمت یہ ہے کہ انھوں نے جدید تمدن وتہذیب کے پیدا کیے ہوئے مسائل زندگی وسائل فن میں ڈھال دیا۔ انھوں نے برق حیات سے ہی اپنی شمع فن روشن کی انھوں نے زندگی کے وسیع ترین اور پیچیدہ ترین مواد کو بہترین ہیئت فن میں پیش کیا، دقیق ترین موضوع حسین ترین اسلوب میں ظاہر کیا۔''

مغنی صاب کے ان خیالات کی تائید میں ان کی معروف کتاب 'اقبال کا نظام فن' پیش کی جاسکتی ہے جس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ وہ سخنوری کے ضمن ہیئتی لوازم کو کس قدر اہمیت دیتے ہیں اور ان جمالیاتی اقدار سے بے بہرہ ہونے کی صورت میں شاعری کی جس طرح درگت بنتی ہے، اس سے بھی وہ بخوبی آگاہ ہیں۔

البتہ مذکورہ تصنیف میں انھوں نے کسی نوع کی تخصیص کیے بغیر جس طرح اردو کلام اقبال کے چاروں مجموعوں کے تقریباً تمام مشمولات پر دھواں دھار بحث کی ہے اور نظموں غزلوں کے فنی وفکری ابعاد وجہات اور امتیازات کی نشاندہی کرنے کی کوشش کی ہے اس سے اقبال فہمی میں ان کی شیفتگی اور عقیدت اس درجہ حاوی ہوگئی ہے کہ قاری ورطۂ حیرت میں پڑجاتا ہے، اور یہ سمجھنے سے قاصر

http://urducouncil.nic.in/Urdu-Duniya/Urdu-Duniya-June-2012/P36.jpg 1/1

رہتا ہے کہ ایک فن پکیت Monad ہونے کی حیثیت سے شاعری کا اعلا نمونہ اور علوئے فن کے لحاظ سے اقبال کی شاعری کی مقدار کتنی ہے اور وہ کہاں کہاں شعری اظہار کے دوران خطابت اور شعریت کے خارزار میں الجھ گئے ہیں۔

لیکن مفتی صاحب ان سوالات سے نبرد آزما ہونے کے بجائے اندھا دھند اقبال کی ترجمانی اور شرح نویسی میں مصروف نظر آتے ہیں۔ غضب تو یہ ہے کہ اُن کا زور بیشتر تفہیم زدگی پر ہے کسی نظم کے اقتباس یا غزل کے شعر کا تجزیہ کر کے اُس کے فنی، جمالیاتی نقوش اور شعری امکانات کا سُراغ لگانے اور اُن کے حُسن و قبح کو معروضی ڈھنگ سے سامنے لانے کے بجائے وہ ہوائی فائرنگ شروع کر دیتے ہیں، لہٰذا نشانہ اکثر خطا ہو جاتا ہے۔

تاہم اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ مفتی صاحب نے اب سے 35-30 برس قبل جب اقبال نہمی کی مہم شروع کی تھی خصوصاً کلیم الدین احمد کی جارحانہ اقبال شکنی سے برگشتہ ہونے کے سبب، اس وقت اقبال کی شاعری کا فنی مطالعہ چند مضامین سے آگے نہیں بڑھ سکا تھا۔ مفتی صاحب نے جس قدر مبسوط اور ہمہ جہت مطالعہ کیا ہے وہ اس لحاظ سے بھی اہم ہے کہ بالعموم اقبال کے فکر و فلسفے کو ان کی شاعری سے علاحدہ کر کے جتنے بڑے پیمانے پر نقد و نظر کا موضوع بنایا گیا ہے، ان کی شعریات اور فنی دروبست سے وابستہ مسائل پر روشنی کم ہی ڈالی گئی ہے۔ مفتی صاحب نے جس قدر خلوص، انہماک، گرمیِ جذبات اور عقیدت و محبت کے ساتھ اقبال فہمی کے سلسلے کو آگے بڑھانے میں غیر معمولی پیش قدمی کی ہے، اس سے انکار نہیں ہو سکتا لیکن وہ جب بڑے جذباتی انداز میں اقبال کی حمایت میں مدافعت پر کمربستہ نظر آتے ہیں تو ان پر ترس آتا ہے، ایسا لگتا ہے جسے وہ کسی کمزور انسان کو جو کہ بیساکھیوں پر چل رہا ہے سہارا دینے کی کوشش کر رہے ہیں، حالانکہ اقبال ہمارے اُن شاعروں میں ہیں جن کا بڑا سے بڑا مخالف بھی حتیٰ کہ کٹر ترقی پسندوں میں سجاد ظہیر، علی سردار جعفری اور فیض احمد فیض تک نے ان کی شاعرانہ عظمت اور تخلیقی زرخیزی کا نہ صرف اعتراف کیا ہے بلکہ ان کی پیروی اور تقلید بھی کرنے کی کوشش کی ہے۔

پھر بھی اس حقیقت سے کسی کو انکار کی جرات نہیں ہو سکتی کہ عظیم اور آفاقی شعری تجربات کا مصدر و مرجع ہر دور میں اعلا مذہبی و روحانی بصیرتیں اور مدرکات ہی رہے ہیں، چنانچہ اقبال کی حمایت میں عالمی شعری منظر نامہ پیش کرتے ہوئے، مفتی صاحب کا یہ خیال بالکل درست ہے کہ:

''جس چیز کو ادب عالی Classic کہا جاتا ہے وہ اکثر و بیشتر کسی نہ کسی فلسفے، پیغام اور خیالات پر مبنی ہے، بلکہ بیشتر شاہکار تخلیقات ہے تو ہیں جو مذہبیت سے جذبہ حاصل کر کے تصنیف کی گئی ہیں اور ان کا ماحصل کچھ اعلا اخلاقیات ہیں، یعنی اس میں اپنی اور دوسروں کی نجات کی فکر بہت نمایاں ہے۔ دانتے کا طربیہ خداوندی Divine Comedy سراسر مسیحی دینیات و اخلاقیات پر مشتمل ہے۔ جنت اور دوزخ، ثواب و عذاب، جزا اور سزا کے تصور پر اس شعری ڈرامے کا پلاٹ مرتب ہوا ہے۔ گیٹے کا فاؤسٹ۔ روحانی طاقت کا حصول اور استعمال کے موقع پر ایک ایسی ہی ابدی کوشش ہے جس کا انجام بھی روحانی اذیت پر ہوتا ہے۔ جو عالم انسانیت کو ایک پیغام دیتا ہے اور یہ پیغام بعض نہایت پیچیدہ خیالات پر ہی نہیں اخلاقیات پر مشتمل ہے۔ اس ڈرامے کا محرک و مقصود بھی نجات ہے۔ ملٹن کی جنت گم شدہ Paradise Lost کیا ہے! اس کا عنوان ہی اشارہ کرتا ہے کہ اس میں الٰہیات، دینیات، اخلاقیات اور نجات کے سارے سبق موجود ہیں۔''



علامہ اقبال کا ایک نایاب فوٹو

انگریزی کے نوبل انعام یافتہ معروف شاعر ٹی ایس ایلیٹ کی طویل نظم مرثیہ Waste Land میں اس کے مسیحی عقائد اور اخلاقی نقطۂ نظر کے ماسوا، ہندو فکر و فلسفہ اور مہاتما بدھ کے افکار و خیالات سے ماخوذ بہت سی علامتوں کی گونج صاف سنائی دیتی ہے۔

مفتی صاحب یقیناً اُن جری اور بے باک نقادوں میں ہیں جو کسی سے مرعوب ہونا نہیں جانتے اور اقبال کی شاعری کو محض اس لیے ساقط المعیار قرار دینے کے لیے تیار نہیں ہیں کہ اس کا سرچشمہ و فیضان واضح طور پر اسلام اور اس کی برگزیدہ روح اور پاکیزہ اخلاقی تعلیمات ہیں۔ عالمی شعری منظر نامہ میں اقبال کے مقام و مرتبے اور امتیاز و انفرادیت کا تعین کرتے ہوئے مفتی صاحب نہایت واضح، حتمی، قطعی اور پرزور انداز میں فرماتے ہیں کہ:

''اقبال کی شاعری میں فکر و فن کی عظمتوں کا جو امتزاج کامل ہے وہ دنیائے شاعری میں اپنی مثال آپ ہے، واقعہ یہ ہے کہ مشرق و مغرب میں کہیں بھی نہ تو کسی شاعر نے آج تک اتنے زبردست فکر سے کام لیا ہے اور نہ ہی کسی مفکر نے اتنی عظیم شاعری کی ہے پھر فکر بھی ایک منظم فکر اور اسپیڈ فلسفہ کی شکل میں اور شاعری صنائع بدائع اور فصاحت و بلاغت کے جملہ فن کے ساتھ، پھر فکر و فن دونوں کے سالمات ایک انتہائی طاقت ور جذبے اور اس سے پیدا ہونے والے سوز و گداز سے پگھل کر ایک ہم آہنگ مرکب میں ڈھلے ہوئے جس کے نتیجے میں حسن و صداقت کی ایسی کامل یکجہتی کا اس سے زیادہ کا تصور نہیں کیا جا سکتا، اور اس یکجہتی میں ایسی آفاقیت کہ جدید و قدیم اور مشرق و مغرب کے تمام صالح افکار اور حسین و جمیل استعارات کا عطر مجموعہ۔ اقبال کی شاعری کالی داس، دانتے، رومی، حافظ، شیکسپیئر، گیٹے اور غالب کی بہترین اقدار فکر اور روایات فن کی امانت دار اور ان میں توسیع و اضافہ کرنے والی ہے۔''

ہر چند کہ مفتی صاحب کے مذکورہ خیالات سے کلی طور پر اتفاق نہیں کیا جا سکتا اس لیے کہ اسلام جس نوع کا نظام اقدار اور عملی ضابطۂ زندگی ہے اس کو تخلیقی مقاصد کے لیے لسانی پیرایے میں اس قدر سیال بنا پانا آسان نہیں ہے کہ وہ عملی طور پر شاعرانہ صداقت کے سانچے میں ڈھل جائے۔ جبکہ اس کے برعکس دیگر مذہبی سلسلہ اس قدر منہیات اساطیر، فلسفے، متصوفانہ روایات و حکایات اور روحانی واردات و کوائف جتنی سرعت اور سہولت کے ساتھ شاعری کی دسترس میں آ کر اور اس کے تخیل کی آگ میں پگھل کر ایک نئے قالب میں ڈھل جاتی ہیں۔ اسلامی فکر جس بے پناہ ریاضت، تجمل، بُردباری، احتیاط، ذمے داری اور اعلا درجے کی تخلیقی ہنرمندی کا تقاضا کرتی ہے، اقبال نے ان سخت آزمائشوں کے حصار اور حدود و قیود میں رہتے ہوئے یقیناً بڑی جگر کاوی کی ہے، تب کہیں جا کر اس پل صراط سے صحیح سلامت گزر پائے ہیں، ہر چند کہ ان کے ہاں بھی فنی پیچ و خم کے کئی مراحل اور مقامات آئے ہیں جہاں قدم میں لرزش بھی پیدا ہوئی ہے، تاہم ان چیزوں سے ان کی آفاقی گیر عظمت کی نہ تو تخفیف ہوئی ہے اور نہ ہی ان کے فن کی دائمی صلابت پر ہی حرف آتا ہے۔

Qazi Obaidur Rahman Hashmi, Dept of Urdu, Jamia Millia Islamia, New Delhi - 110025



عاشق حسین صدیقی سیماب اکبرآبادی



ادارہ

علامہ سیماب اکبرابادی، اردو میں سب سے زیادہ لکھنے پڑھنے والے اساتذۂ کرام میں شمار ہوتے ہیں جنھوں نے 55 سال کی عمر تک آتے آتے مختلف موضوعات پر 284 کتابیں لکھ ڈالی تھیں، جن کے شاگرد پورے برصغیر میں پھیلے ہوئے تھے، جنھوں نے تمام شعری اصناف میں سخن آزمائی کی روشن مثالیں چھوڑیں، اور جن کے شعری کارناموں میں قران مجید کا وہ مکمل منظوم ترجمہ بھی شامل ہے جو اپنی مثال آپ ہے اور جو ان کے انتقال کے برسوں بعد پاکستان سے شائع ہوا۔

سیماب کا پورا نام عاشق حسین صدیقی تھا۔ وہ 5 جون 1880 کو منڈی آگرہ کی کاکو گلی کے اہلی والے مکان میں پیدا ہوئے ان کے والد مولانا محمد حسین فاضل عصر اور عالم متبحر تھے اور اجمیر شریف میں ٹائمز آف انڈیا پریس کی شاخ کے افسر اعلیٰ تھے۔ ان کے آباؤ اجداد اورنگ زیب کے عہد میں شہر بخارہ سے ہندوستان آئے اور آگرہ میں سکونت پذیر ہوئے تھے۔ اپریل 1897 میں سیماب کے والد کا آگرہ میں انتقال ہوگیا۔ سیماب نے عربی وفارسی اور علم منطق کی تعلیم جمال الدین سرحدی اور مولانا رشید احمد گنگوہی سے حاصل کی۔ اس کے بعد اجمیر کے انگریزی مدرسے میں داخلہ لیا۔ اسکول کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد کالج پہنچے لیکن والد کے انتقال کی وجہ سے سلسلۂ تعلیم منقطع کرنا پڑا کیونکہ خاندان کے فرزند اکبر تھے۔ اس لیے گھر کا تمام بار سیماب کے سر پر آپڑا۔ بسلسلۂ معاش وہ کانپور گئے۔ کانپور میں بیماری نے آگھیرا تو آگرہ لوٹ آئے۔ پھر دوسری ملازمت کے سلسلے میں اجمیر چلے گئے۔ پانچ سال اجمیر میں رہ کر پھر آگرہ آئے اور رسالہ 'مرصع' کے مدیر مقرر ہوئے۔ کچھ عرصے بعد پھر ملازمت کے چکر میں نوٹولہ (ضلع آگرہ) جانا پڑا، نوٹولہ کی ملازمت کے ساتھ ساتھ 'آگرہ اخبار' کی ادارت کے فرائض بھی انجام دیتے رہے۔ جب انھیں احساس ہوا کہ وہ تمام عمر ذہنی غلامی میں بسر کرنے کے لیے نہیں بلکہ تخلیق خدمت ادب کے لیے پیدا ہوئے ہیں۔ اس انکشاف ضمیری کے بعد ریلوے کی ملازمت سے استعفیٰ دیا اور آگرہ میں مستقل سکونت اختیار کرلی۔ تقسیم ہند کے بعد کراچی منتقل ہوئے اور وہیں 31 جنوری 1951 وفات پائی۔

شاعری سیماب کے لیے فطری شوق اور پدری میراث تھی۔ عہد طفولیت سے انھیں تصنیف وتالیف کا شوق تھا۔ شعر گوئی کا آغاز انھوں نے 1892 میں غزل سے کیا۔ قیام کانپور کے دوران 1898 میں داغ کے شاگرد ہوئے جن سے کانپور ریلوے اسٹیشن پر منشی نذر حسین سخا دہلوی نے انھیں متعارف کرایا تھا۔ اُستاد داغ کی وفات (1905) تک انھیں سے اصلاح لیتے رہے پھر کسی سے اصلاح نہیں لی۔

اگرچہ سیماب نے سیکڑوں کتابیں تصنیف کیں لیکن ان میں سے صرف 75 ہی ان کی زندگی میں شائع ہوسکیں جن میں 23 شعری تصانیف تھیں۔ ان کا پہلا شعری مجموعہ 'نیستاں' کے عنوان سے 1923 میں چھپا تھا۔ 'لوح محفوظ' 1979 میں اور 'ساز حجاز' 1982 میں ان کے انتقال کے کافی بعد شائع ہوئیں۔ 'وحی منظوم' کے عنوان سے قران مجید کا منظوم ترجمہ 1981 میں ان کے فرزند مظہر صدیقی نے کراچی سے شائع کیا جس پر اس وقت کے صدر پاکستان جنرل ضیاالحق نے 27 ویں رمضان المبارک کو نجمہ ایوارڈ تفویض کیا۔ اس ترجمے کی خوبی یہ ہے کہ اس میں زبان سہل ہے، وزن اور بحر کے تقاضے پورے کرنے کے لیے استعمال میں لائے گئے زائد لفظ قوسین کے ذریعے الگ کردیے گئے ہیں اور مفہوم کی ترسیل میں کسی بھی طرح کی غلطی یا غلط فہمی سے بچنے کے لیے جگہ جگہ ضروری حواشی دیے گئے ہیں۔

سیماب اکبرابادی صرف شاعر نہیں بلند پایہ نقاد بھی تھے۔ شاعری کے بارے میں ان کے خیالات سے ان کی شخصیت کے فکری ونظریاتی خدوخال اچھی طرح واضح ہو جاتے ہیں۔ اپنے شاعرانہ معتقدات کے تعلق سے خود رقمطراز ہیں۔ ''اوائل عشق سخن تک مجھے قدیم تغزل سے دلچسپی تھی لیکن زمانے کے ساتھ علم ومعلومات کا دائرہ جس قدر وسیع ہوتا گیا، رنگ قدیم سے لگاؤ کم ہوتا گیا۔ اب شاعری میں بلند خیالات اور بلند انسانی جذبات کی ترجمانی کا حامی ہوں، میں شاعری میں فلسفۂ حقائق و معارف کے نکات پسند کرتا ہوں۔ میں اُس شاعری کا منکر ہوں، جس کا موضوع صرف عورت اور اس کے متعلقات ہوں جو امرد پرستی کے نفسیات پر مشتمل ہو۔ میری شاعری کا موضوع حسن شخص اور عشق شخص ہے۔ میں نظم کو غزل پر ترجیح دیتا ہوں۔''

اپنے ادبی وشعری معتقدات کی ترجمانی کے لیے انھوں نے 1930 میں ادبی جریدہ ماہنامہ 'شاعر' کا آغاز کیا جو تقسیم وطن کے دوران ان کے پاکستان منتقل ہوجانے کے باوجود جاری رہا۔ ان کے فرزند اعجاز صدیقی نے اسے ممبئی سے شائع کیا اور بہت جلد اسے عصری ادب کا ایک معتبر ترجمان بنادیا۔ اعجاز صدیقی مرحوم کے بعد ان کے فرزند افتخار امام صدیقی اپنی مسلسل علالت کے باوجود کسی نہ کسی طرح اردو کے اس قدیم ترین ادبی رسالے کو جاری رکھے ہوئے ہیں۔

سیماب اکبرابادی 1935 تک مختلف موضوعات پر دوسو چوراسی کتب تصنیف کرچکے تھے۔ ان کے شعری مجموعوں میں صہبائے سخن بادۂ دوشیں، نشید، نوادر، کار امروز خصوصی طور پر قابل ذکر ہیں۔

ماخذ: وکی پیڈیا، 'فن وشخصیت' کوائف نمبر 1994، وغیرہ

انتخاب کلام سیماب اکبرآبادی

سورۂ فاتحہ

نام سے اللہ کے کرتا ہوں آغاز (یہاں)
جو بڑا ہی رحم والا ہے نہایت مہرباں

ہیں سزاوار خدائے (پاک) ساری خوبیاں
جو ہے رب سارے جہانوں کا رحیم و مہرباں
ہے وہی انصاف کے دن کا بھی مالک بے گماں
(یا الٰہی) ہم فقط کرتے ہیں تیری بندگی
اور ہوتے ہیں ہیں تجھی سے طالب امداد بھی
(یا الٰہی) ہم کو سیدھے راستے پر تو چلا
اُن کا رستا جن پر انعام و کرم تیرا ہوا
راستہ ان کا نہیں جن پر غضب کی ہے نگاہ
اور نہ ان کا راستہ جو ہوگئے گم کردہ راہ

قرآن مجید کے منظوم ترجمہ وی منظوم سے

غزلیات

مجھ سے ملنے کے وہ کرتا ہے بہانے کتنے
اب گزارے گا میرے ساتھ زمانے کتنے
میں گرا تھا تو بہت لوگ رکے تھے لیکن
سوچتا ہوں مجھے آئے تھے اٹھانے کتنے
جس طرح میں نے تجھے اپنا بنا رکھا ہے
سوچتے ہوں گے یہی بات نہ جانے کتنے
تم نیا زخم لگاؤ تمھیں اس سے کیا ہے
بھرنے والے ہیں ابھی زخم پرانے کتنے

نامہ گیا کوئی نہ کوئی نامہ بر گیا
تیری خبر نہ آئی زمانہ گزر گیا
ہنستا ہوں یوں کہ ہجر کی راتیں گزر گئیں
روتا ہوں یوں کہ لطف دعاءِ سحر گیا
اب مجھ کو ہے قرار تو سب کو قرار ہے
دل کیا ٹھہر گیا کہ زمانہ گزر گیا
یارب نہیں میں واقفِ روداد زندگی
اتنا ہی یاد ہے کہ جیا اور مر گیا

چمک جگنو کی برقِ بے اماں معلوم ہوتی ہے
قفس میں رہ کے قدرِ آشیاں معلوم ہوتی ہے
کہانی میری روداد جہاں معلوم ہوتی ہے
جو سنتا ہے اُسی کی داستاں معلوم ہوتی ہے
ہوائے شوق کی قوت وہاں لے آئی ہے مجھ کو
جہاں منزل بھی گرد کارواں معلوم ہوتی ہے
قفس کی تیلیوں میں جانے کیا ترکیب رکھی ہے
کہ ہر بجلی قریبِ آشیاں معلوم ہوتی ہے
ترقی پر ہے روز افزوں خلش دردِ محبت کی
جہاں محسوس ہوتی تھی، وہاں معلوم ہوتی ہے
نہ کیوں سیماب مجھ کو قدر ہو ویرانیٔ دل کی
یہ بنیادِ نشاطِ دو جہاں معلوم ہوتی ہے

دل کی بساط کیا تھی نگاہ جمال میں
اک آئینہ تھا ٹوٹ گیا دیکھ بھال میں
صبر آہی جائے گر ہو بسر ایک حال میں
امکاں اک اور ظلم ہے قیدِ محال میں
آزردہ اس قدر ہوں سرابِ خیال سے
جی چاہتا ہے تم بھی نہ آؤ خیال میں
تنگ آ کے توڑتا ہوں طلسمِ خیال کو!
یا مطمئن کرو کہ تمھیں ہو خیال میں!
دنیا ہے خواب، حاصلِ دنیا خیال ہے
انسان خواب دیکھ رہا ہے خیال میں
بجلی گری اور آنچ نہ آئی کلیم پر!
شاید ہنسی بھی آگئی ان کو جلال میں

یہ کیا جانے میں جانا ہے کہ جاتے ہو خفا ہوکر
میں تب جانوں میرے دل سے چلے جاؤ جدا ہوکر
قیامت تک اڑے گی دل سے اٹھ کر خاک آنکھوں تک
اسی رستے گیا ہے حسرتوں کا قافلہ ہوکر
تمھیں اب دردِ دل کے نام سے گھبرائے جاتے ہو
تمھیں تو دل میں شاید آئے تھے دردِ آشنا ہوکر
یوں ہی ہم گھڑی بھر کو ملا کرتے تو بہتر تھا
کہ دونوں وقت جیسے روز ملتے ہیں جدا ہوکر

اب کیا بتاؤں میں تیرے ملنے سے کیا ملا
عرفانِ غم ہوا مجھے دل کا پتہ ملا
جب دور تک نہ کوئی فکر آشنا ملا
تیرا نیازمند تیرے در سے جا ملا
منزل ملی مراد ملی مدعا ملا
سب کچھ مجھے ملا جو تیرا نقشِ پا ملا
یا زخمِ دل کو چیر کے سینے سے پھینک دے
یا اعتراف کر کہ نشانِ وفا ملا
سیماب کو شگفتہ نہ دیکھا تمام عمر
کم بخت جب ملا ہمیں کم آشنا ملا

غم مجھے حسرت مجھے وحشت مجھے سودا مجھے
ایک دل دے کے خدا نے دے دیا کیا کیا مجھے
ہے حصولِ آرزو کا راز ترکِ آرزو
میں نے دنیا چھوڑ دی تو مل گئی دنیا مجھے
کہہ کے سویا ہوں یہ اپنے اضطرابِ شوق سے
جب وہ آئیں قبر پر فوراً جگا دینا مجھے
صبح تک کیا کیا تیری امید نے چھلنے دیے
آگیا تھا شام غم اک نیند کا جھونکا مجھے
یہ نمازِ عشق ہے کیسا ادب کس کا ادب
اپنے پایۂ نماز پر کرنے دو سجدہ مجھے
دیکھتے ہی دیکھتے دنیا سے میں اٹھ جاؤں گا
دیکھتی کی دیکھتی رہ جائے گی دنیا مجھے

جنت جو ملے لاکے مٹانے میں رکھ دینا
کوثر میرے چھوٹے سے پیمانے میں رکھ دینا
میت نہ مری جا کے ویرانے میں رکھ دینا
پیمانوں میں دفنا کے میخانے میں رکھ دینا
وہ جس سے سمجھ جائیں روداد میرے غم کی
ایسا بھی کوئی ٹکڑا افسانے میں رکھ دینا
سجدوں پہ نہ دیں مجھ کو ارباب حرم طعنے
کعبے کا کوئی پتھر بت خانے میں رکھ دینا
سیماب یہ قدرت کا ادنیٰ سا کرشمہ ہے
خاموش سی اک بجلی پروانے میں رکھ دینا

3/21/2018 P40.jpg (1758×2370)

بقدرِ شوق اقرارِ وفا کیا
ہمارے شوق کی ہے انتہا کیا
محبت کا یہی سب شغل ٹھہرا
تو پھر آہِ رسا کیا نا رسا کیا
دعا دل سے جو نکلے کارگر ہو
یہاں دل ہی نہیں دل سے دعا کیا
دل آفت زدہ کا مدعا کیا
شکستہ ساز کیا اس کی سزا کیا
سلامت دامنِ امیدِ سیماب
محبت میں کسی کا آسرا کیا

نہ ہو گر آشنا نہیں ہوتا
بت کسی کا خدا نہیں ہوتا
تم بھی اس وقت یاد آتے ہو
جب کوئی آسرا نہیں ہوتا
دل میں کتنا سکوں ہوتا ہے
جب کوئی مدعا نہیں ہوتا
ہو نہ جب تک شکارِ ناکامی
آدمی کام کا نہیں ہوتا
زندگی تھی شباب تک سیماب
اب کوئی سانحہ نہیں ہوتا

نسیمِ صبح گلشن میں گلوں سے کھیلتی ہوگی
کسی کی آخری ہچکی کسی کی دل لگی ہوگی
تیرے قدموں پہ سر ہوگا قضا سر پہ کھڑی ہوگی
پھر اس سجدے کا کیا کہنا انوکھی بندگی ہوگی
دکھا دوں گا سرِ محفل بتا دوں گا سرِ محشر
وہ میرے دل میں ہوں گے اور دنیا دیکھتی ہوگی
تمھیں دانستہ محفل میں جو دیکھا ہو تو مجرم ہوں
نظر آخر نظر ہے بے ارادہ اٹھ گئی ہوگی
مزہ آجائے گا محشر میں کچھ سننے سنانے کا
زباں ہوگی ہماری اور کہانی آپ کی ہوگی
سرِ محفل بتا دوں گا سرِ محشر دکھا دوں گا
ہمارے ساتھ تم ہوگے یہ دنیا دیکھتی ہوگی
یہی عالم رہا پردہ نشینوں کا تو ظاہر ہے
خدائی آپ سے ہوگی نہ ہم سے بندگی ہوگی

میں پسِ پردۂ آئینہ محفل نہ ہوا
تم جسے دیکھ رہے تھے وہ مرا دل نہ ہوا
اے خبر وسعتِ کونین کی رکھنے والے!
باخبر وہ ہے کہ جو بے خبرِ دل نہ ہوا
کیا بساط اس کی تھی اک پارۂ لرزاں کے سوا
دل پہ جب تک تری نظریں نہ پڑیں، دل نہ ہوا
سینۂ حسن کو ہلکی سی خلش مل جاتی
تھی جہاں حُسن کی تخلیق وہاں دل نہ ہوا
اے غمِ عشق ترے ظرف میں کچھ آگ بھی ہے؟
آنسوؤں سے تو علاجِ تپشِ دل نہ ہوا

مثلث

عیاں عالم کی حالت ہورہی ہے
نظر صرفِ حقیقت ہورہی ہے
مجھے دنیا سے نفرت ہورہی ہے

رہائی کی اجازت ہورہی ہے
بدن سے روح رخصت ہورہی ہے
مکمل قیدِ غربت ہورہی ہے

انھیں تو اب بھی دلجوئی ہے منظور
میں خود ترکِ تعلق پر ہوں مجبور
کچھ ایسی ہی طبیعت ہورہی ہے

نہ کیوں لذت کشِ مستی بنوں میں
سرِ محفل نہ کیوں کھُل کر پیوں میں
اُن آنکھوں سے عنایت ہورہی ہے

بتوں کی سازشیں اللہ اکبر
خدا سے مل گیا ہے حسنِ کافر
خدائی پر حکومت ہورہی ہے

الٰہی ہم کو وحدت آشنا کر
سکونِ نظم وحدت پھر عطا کر
کہ برہم بزمِ کثرت ہورہی ہے

نعت

مدینے لاکے، نہ لائے خدا مدینے سے

پیام لائی ہے بادِ صبا مدینے سے
کہ رحمتوں کی اٹھی ہے گھٹا مدینے سے
الٰہی کوئی تو مل جائے چارہ گر ایسا
ہمارے درد کی لادے دوا مدینے سے
حساب کیسا، نکیرین ہوگئے بے خود
جب آئی قبر میں ٹھنڈی ہوا مدینے سے
یہی تو خانہ خرابی کا اک ٹھکانہ ہے
چلوں کہاں دلِ درد آشنا مدینے سے؟
ہمارے سامنے یہ نازشِ بہار فضول
بہشت لے کے گئی ہے فضا مدینے سے
فرشتے سیکڑوں آتے ہیں اور جاتے ہیں
بہت قریب ہے عرشِ خدا مدینے سے
خدا کے گھر کا گدا ہوں، فقیرِ کوئے نبی
لگاؤ ہے مجھے اس سے سوا مدینے سے
وطن پر اپنے ہمیشہ اسی کو دی ترجیح
مدینے والے کو کیا عشق تھا مدینے سے
وداع ہو کے جو مکّے سے آئے بعدِ طواف
گئے نہ لوٹ کے پھر مصطفےٰ مدینے سے
نہ آئیں جا کے وہاں سے یہی تمنا ہے
مدینے لاکے، نہ لائے خدا مدینے سے
تڑپ بھی آؤ صریحِ حسینؓ پر سیماب
کچھ ایسی دور نہیں کربلا مدینے سے

سازِ حجاز ص 81,82، مطبوعہ اکتوبر 1987

بصارت قوتِ جلوہ سے معدوم
تجلی کا مذاقِ جبر معلوم
نظر مجبورِ حیرت ہورہی ہے

رباعی

بد بیں کی نگاہ دیکھ لیتا ہوں میں
قلبِ بدخواہ دیکھ لیتا ہوں میں
پڑتی نہیں اپنے عیب پر میری نظر
اوروں کے گناہ دیکھ لیتا ہوں میں

http://urducouncil.nic.in/Urdu-Duniya/Urdu-Duniya-June-2012/P40.jpg 1/1

3/21/2018 P41.jpg (1758×2358)

ادارہ



خواجہ احمد عباس

خواجہ الطاف حسین حالی کے خاندان میں جنم لینے والے خواجہ احمد عباس اردو کی وہ شخصیت ہیں جنھیں ان کے پرنانا کی طرح کسی ایک شعبہ فن وادب تک محدود نہیں کیا جاسکتا۔ بس انھوں نے شاعری نہیں کی۔ باقی سب کچھ کیا۔ وہ افسانہ نگار تھے، انھوں نے ناول لکھے، اردو اور انگریزی دونوں میں لکھنے پر قادر تھے، چنانچہ دونوں زبانوں میں متعدد کتابیں لکھیں، سفرنامے تحریر کئے، تنقیدی مضامین لکھے، صحافت میں قدم جمائے، کالم نویسی اختیار کی، ڈرامے تحریر کئے، فلمیں لکھیں، فلمیں بنائیں، راج کپور اور امیتابھ بچن جیسی ہستیوں کو بقائے دوام اور شہرت مدام سے ہم کنار کیا، ساحر لدھیانوی جیسے عظیم شاعر نے اپنے نام ان ہی کے لکھے ہوئے کھلے خط پر لبیک کہتے ہوئے پاکستان کی سکونت ترک کی اور اس زمانے میں پاکستان چھوڑ کر ہندوستان چلے آئے جب جوش ملیح آبادی جیسے وطن پرستوں کے ارادے بھی متزلزل ہونے لگے تھے۔

خواجہ احمد عباس 7 جون 1914 کو پانی پت میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام خواجہ غلام السبطین انصاری تھا۔ ابتدائی تعلیم پانی پت میں پائی۔ اس کے بعد علی گڑھ پہنچے جہاں مڈل سے لے کر بی اے اور ایل ایل بی تک تعلیم حاصل کی۔ طالب علمی کے زمانے ہی میں صحافت سے منسلک ہوگئے تھے۔ نہرو سے خط وکتابت کرنے کی پاداش میں جب انھیں علی گڑھ میگزین کا مدیر نہیں بنایا گیا تو عباس نے اپنا اخبار 'علی گڑھ اوپینین' جاری کیا۔ 1935 میں بمبئی کرانیکل میں کام کرنا شروع کیا۔ پہلے فلم کرٹیک رہے مگر جب کمرشیل فلم سازوں نے اخبار کے انتظامیہ سے اصرار کیا کہ فلم کرٹیک عباس کے بجائے کسی اور کو مقرر کیا جائے ورنہ اشتہار دینا بند کردیں گے تو یہ سنڈے ایڈیشن کے ایڈیٹر مقرر ہوئے اور اس میں اپنا ہفتہ وار کالم شروع کیا۔ پھر 1947 میں اس کالم کو بلٹز میں منتقل کیا۔

جب ہندی بلٹز نکلا تو اس میں اپنا کالم 'آزاد قلم' کے نام سے لکھنے لگے اور جب اردو بلٹز جاری ہوا تو اُس میں بھی کالم کا نام آزاد قلم ہی رکھا۔ اس طرح تقریباً پچاس سال تک عباس مسلسل اپنا کالم لکھتے رہے۔ 25 سال کی عمر کو پہنچنے تک وہ پانی کے جہاز سے سترہ ممالک کی سیر کر چکے تھے جس کی روداد 'مسافر کی ڈائری' میں بیان کردی جو حالی پبلشنگ ہاؤس کتاب گھر نے 1940 میں شائع کی تھی۔

خواجہ زود نویس تھے اور لکھنے پر انھیں وہ بلا کی قدرت حاصل تھی کہ ریل کے ڈبے میں سفر کرتے ہوئے مسافروں کی موجودگی میں بھی یک سوئی سے لکھ سکتے تھے۔



"ادیب اور نقاد کہتے ہیں، خواجہ احمد عباس ناول یا افسانہ نہیں لکھتا۔ وہ محض صحافی ہے۔ فلم والے کہتے ہیں خواجہ احمد عباس کو فلم بنانا نہیں آتا، کیمرے کی مدد سے صحافت کرتا ہے، آرٹ کی تخلیق نہیں۔ اور خواجہ احمد عباس خود کیا کہتا ہے؟ وہ کہتا ہے 'مجھے کچھ کہنا ہے ...' اور وہ میں ہر ممکن طریقے سے کہنے کی کوشش کرتا ہوں..."

عباس کمیونسٹ فن کاروں کی ڈرامہ تنظیم پیپلز تھیٹر سے وابستہ تھے اور جب 1943 میں انھیں اس تھیٹر کی طرف سے فلم ڈائرکٹر اور پروڈیوس کرنے کا موقع ملا تو انھوں نے 'دھرتی کے لال' بنائی جو فرقہ وارانہ فسادات کی وجہ سے نہ چل سکی مگر مشہور فرانسیسی فلمی نقاد پروفیسر جارج ساوول نے دنیا بھر کی سو بہترین فلموں میں اس کا شمار کیا۔ پھر عباس نے یکے بعد دیگرے تیرہ چودہ فلمیں بنائیں لیکن کوئی بھی فلم بہت کامیاب نہ ہوئی۔ ان کی ایک فلم 'شہر اور سپنا' کو گولڈ میڈل ملا اور 1963 کی بہترین فلم قرار دی گئی۔ عباس نے دوسرے فلم پروڈیوسروں کے لیے فلم اسکرپٹ لکھے جن پر بے انتہا کامیاب فلمیں بنیں ان میں راج کپور کی 'آوارہ'، 'شری چار سو بیس'، 'میرا نام جوکر' اور 'بابی' قابل ذکر ہیں۔ مزاجاً راج کپور کو راج کپور بنانے اور انھیں سماجی سروکار والی فلمیں بنانے کی طرف راغب کرنے میں خواجہ کا بڑا ہاتھ تھا۔ اپنی فلم 'سات ہندوستانی' میں انھوں نے ہی امیتابھ بچن کو پہلا بریک دیا تھا جس کے لیے امیتابھ آج بھی ان کا ذکر بڑی عقیدت سے کرتے ہیں۔

انھوں نے 73 کتابیں تصنیف کیں۔ ان کا ضخیم انگریزی ناول 'انقلاب' اردو میں 1977 میں شائع ہوا جس کی تصنیف انھوں نے 1942 میں شروع کی تھی۔ یہ شاید اردو سے وابستہ کسی شخصیت کا پہلا ناول تھا جو اپنی اصل زبان میں بعد میں شائع ہوا اور اس کے ترجمے پہلے چھپ گئے۔ سب سے پہلے یہ 1954 میں سابق سوویت یونین میں روسی زبان میں چھپا اور اس کی نوے ہزار کاپیاں شائع ہوئیں جو سب بک گئیں۔ بعد میں 1955 میں اس کا جرمنی میں ترجمہ شائع ہوا۔ تب کہیں جاکر ہندوستان کے ایک پبلشر نے اس کے صفحات کی تعداد میں 150 کی تخفیف کی شرط پر اسے صرف 850 روپے کی رائلٹی دے کر اس کا پہلا انگریزی ایڈیشن شائع کیا۔ ہندی میں اس کا ترجمہ 1976 میں چھپا اور اردو میں اسے خواجہ نے اپنے صرفے پر اردو میں شائع کیا۔ حسب توقع اردو داں حضرات نے اس کی خاطر خواہ پذیرائی نہیں کی۔ حتیٰ کہ کسی نے تبصرہ لکھنے کی زحمت بھی نہیں اٹھائی۔

مگر خواجہ نے کبھی اس کا شکوہ نہیں کیا۔ وہ غضب کی حس مزاح رکھتے تھے۔ حالی ان کی پیدائش کے کچھ ہی روز بعد انتقال کر گئے تھے۔ اس پر انھوں نے لکھا: "پرنانا کو میری شکل اتنی بری لگی کہ دنیا سے چلے جانا بہتر سمجھا۔"

ایک مرتبہ خود اپنے فن کے بارے میں لکھا:

"ادیب اور نقاد کہتے ہیں، خواجہ احمد عباس ناول یا افسانہ نہیں لکھتا۔ وہ محض صحافی ہے۔ ادب کی تخلیق اُس کے بس کی بات نہیں ہے۔ فلم والے کہتے ہیں خواجہ احمد عباس کو فلم بنانا نہیں آتا اُس کے فیچر فلم بھی محض ڈاکومنٹری ہوتے ہیں۔ وہ کیمرے کی مدد سے صحافت کرتا ہے، آرٹ کی تخلیق نہیں۔ اور خواجہ احمد عباس خود کیا کہتا ہے؟

وہ کہتا ہے 'مجھے کچھ کہنا ہے ...' اور وہ میں ہر ممکن طریقے سے کہنے کی کوشش کرتا ہوں..."

اور پھر یہی سب کہتے کہتے، یکم جون 1987 کو ممبئی میں ان کا انتقال ہوگیا۔

■

ماخذ: 'ڈان' پاکستان، وکی پیڈیا، 'فن وشخصیت' کوائف نمبر 1994

http://urducouncil.nic.in/Urdu-Duniya/Urdu-Duniya-June-2012/P41.jpg 1/1



دو ہاتھ

خواجہ احمد عباس

دور سے کتوں کے بھونکنے کی آواز آئی تو سکھارام کی آنکھ کھل گئی۔ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا کتنے کچھ ایسے انداز میں بھونک رہے تھے، جیسے رو رہے ہوں۔ اندھیرا تو اندھیرا کچھ اور گہرا ہو گیا ہے۔ اماوس کی رات تھی چاندنی کا تو سوال ہی نہیں تھا۔ لیکن تارے بھی نہ جانے کہاں غائب ہو گئے ہیں، برسات کا موسم نہیں۔ شام کو اس نے دیکھا تھا کہ آسمان پر بادل کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا بھی کہیں نہیں ہے۔ شاید جاڑے کی دھند تھی، جس نے ستاروں کو اپنی کالی چادر میں لپیٹ رکھا تھا۔ یہ دھند تھی۔ یا دھواں تھا یا دھویں کا بادل تھا اس میں سکھارام کا گلا گھٹتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔

شاید یہ اُس کا وہم ہی ہو۔ بھلا اندھیرے سے بھی کسی کا گلا گھٹتا ہے؟ شاید جیسے جیسے وقت قریب آ رہا ہے۔ مجھے گھبراہٹ ہو رہی ہے۔ اُس نے اپنی کلائی پر لگی ہوئی گھڑی دیکھی۔ اندھیرے میں چمکنے والی سوئیاں بتا رہی تھیں کہ چار بجنے میں پانچ منٹ ہیں۔ بازار کے چوکیدار ساڑھے چار بجے اپنا پہرہ ختم کر کے اپنے گھر چلے جاتے ہیں پو پھٹے گی ساڑھے پانچ بجے۔ اُس کو دکانوں کا صفایا کرنے میں بس یہی ایک گھنٹہ لگے گا۔

چوری اس کے لیے کوئی نئی بات نہیں تھی۔ پچھلے تین برس میں کئی بار اُس نے جیل کی ہوا کھائی تھی۔ دو بار بمبئی کی پولیس نے اسے تڑی پار کیا تھا۔ اس بار تو انھوں نے اس سے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ بمبئی میں اس کی شکل بھی نظر آئی تو سیدھا اس کا چالان کر دیں گے، چاہے اُس نے کوئی جرم کیا ہو یا نہ کیا ہو۔

سکھارام پوتا چلا آیا تھا، مگر یہاں کا موسم چوری کے لیے ٹھیک نہیں تھا۔ رات کو سردی کے مارے سب دروازے کھڑکیاں بند کر کے سوتے تھے۔ پولیس والے کم بخت بھی ہر وقت چکر لگاتے رہتے تھے۔ دو چار حوالدار اس کو پہچانتے بھی تھے۔ ''کیوں سکھارام! بومبے پولیس نے کر دیا نہ تجھے تڑی پار؟ یاد رکھنا کہ ہم تڑی پار نہیں کرتے۔ ذرا سا شبہ بھی ہو تو سیدھا جیل خانے میں بند کر دیتے ہیں۔'' ان حالات میں کوئی شریف آدمی یا شریف چور — کرے تو کیا کرے؟ دو چار ہی دن میں جیب میں جو جمع پونجی تھی، وہ ختم ہو گئی۔ سکھارام نے سوچا اپنے گاؤں واپس چلا جائے۔ پوتا سے سوسوا سو میل پر ہی تو تھا مگر جائے تو کیسے۔ تین برس کے بعد اپنی بیوی کو کیا منہ دکھائے گا؟ گاؤں چھوڑتے وقت اس نے ٹھوبا کے مندر میں جا کر اپنی بیوی کے سامنے قسم کھائی تھی کہ اب وہ اس وقت ہی واپس آئے گا جب اس کے ہاتھ میں چار پیسے ہوں گے تا کہ ساہوکار سے اپنی زمین چھڑا لیں، اپنے جھونپڑے کی مرمت کرا لیں اور ہل جوتنے کے لیے ایک جوڑی کو کھلا پوری بیلوں کی خرید لیں۔ بس اتنی ہی دنیا تھی۔ ان کی دو بیگھہ زمین۔ ایک جوڑی بیل۔ ایک ہل۔ جھونپڑے کی چار دیواریں اور پھوس کی چھت — اور ساوتری!

ہر بار جب اسے اپنی بیوی ساوتری کی یاد آتی تھی تو سکھارام کے دل میں درد کی ایک میٹھی سی ٹیس اٹھتی تھی۔ گاؤں بھر میں ایک چھوکری بھی تو ساوتری جیسی نہیں تھی۔ آم کی کیریوں جیسی آنکھیں۔ یہ لمبے لمبے ریشم جیسے ملائم بال جن کا جوڑا بنا کر اس میں ایک جنگلی پھول لگا لیتی تھی تو سکھارام کے من میں کنول کھل اٹھتے تھے۔ دبلی پتلی مگر سڈول جسم جو ٹوکرے کی ساڑھی اور چھنی ہوئی چولی میں اور بھی غضب ڈھاتا تھا۔ بس کچھ ایسی کہ گھر میں کھانے کو نہ ہو تو پھر بھی ہر وقت ہنستی مسکراتی رہتی تھی کوئی ہمدردی جتاتی تو کہتی ''مجھے کیا فکر ہے؟ میرے گھر والے کے محنت کرنے والے دو ہاتھ سلامت چاہئیں۔ سب دلدّر دور ہو جائیں گے۔''

ساوتری کا خیال آتے ہی سکھارام اندھیرے میں مسکرا دیا، اس نے اپنے ہاتھوں کو اپنے سامنے پھیلا دیا۔ وہ ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ کو چھو کر محسوس کر سکتا تھا مگر وہ اپنے ہاتھوں کو دیکھ نہ سکتا تھا ان دو ہاتھوں نے جو محنت سے کھردرے اور سخت ہو گئے تھے کیا کچھ نہ کیا تھا۔ ہل چلایا تھا۔ بیج بویا تھا۔ سینچائی کی تھی۔ نلائی اور کٹائی کی تھی۔ اناج کو چھاج کر بوریوں میں بھرا تھا، بوریوں کو اٹھا کر بیل گاڑی میں رکھا تھا پھر وہ سب بوریاں ساہوکار کے ہاں پہنچایا تھا اور ساہوکار نے بہی کھاتہ کھول کر حساب بتایا کہ اناج سے قرضہ پورا نہیں ہوا اس کو اپنا بیل بھی بیاج میں دینا ہوگا۔ ایک بیل تو پہلے ہی بوڑھا اور بیمار ہو کر مر چکا تھا۔ دوسرا ساہوکار کے حوالے کیا۔ اور گاڑی کو ان ہی دو ہاتھوں سے گھسیٹتا ہوا گھر واپس لے آیا۔ اُس دن سکھارام نے بمبئی آنے کا فیصلہ کیا۔

اس نے سنا تھا کہ شہر میں کام بہت ہے۔ محنت، مزدوری کرنے والے دو ہاتھ ہونے چاہئیں۔ بلوں میں تو ان دو ہاتھوں کا کوئی خریدار نہ نکلا۔ سواس نے ان ہاتھوں سے بوجھا ڈھویا تھا۔ اناج کی بوریاں مال گاڑی سے اتار کر ٹرکوں میں بھری تھیں اور ٹرکوں سے اتار کر گوداموں میں رکھی تھیں، اور ان بوریوں میں سے اس کو گیہوں کی ایسی جانی بوجھی سوندھی سوندھی خوشبو آئی کہ اس نے سوچا ممکن ہے میرے کھیت سے پیدا اناج بوریوں میں بھر کر آ گیا ہے۔ بعض گوداموں میں خفیہ طریقے سے مال رات کو اتارا جاتا تھا۔ سکھارام جانتا تھا یہ کالا بازار ہے مگر وہاں مزدوری دُگنی ملتی تھی۔ چار روپے کے بجائے آٹھ روپے روز شام کو چار آنے کی اوسل پاؤ کھا کر وہ اوپر سے ٹھنڈا پانی پی لیتا اور بس سنیما کی رنگ برنگی روشنیاں آنکھیں چکا کر اس کو بلاتیں، ان رنگین پوسٹروں پر ادھ ننگی حسینیں اس کو لبھاتیں مگر سکھارام سوچتا میری ساوتری ان سب سے خوبصورت ہے۔ میں اُن کو دیکھنے کے لیے کیوں اپنی محنت کی کمائی خرچ کر دوں؟ اس کی اٹنی میں پانچ سے دس، دس سے بیس، بیس سے پچاس، سو روپے، دو سو روپے اکٹھے ہوتے جا رہے تھے اور اُس کو ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ اس کا کھیت، اس کے بیل اُس کا گاؤں، اس کی ساوتری اس کے قریب آتے جا رہے ہیں، اور دن بھر محنت کرنے کے بعد جب وہ ان ہی ہاتھوں کا تکیہ بنا کر

فٹ پاتھ پر سوجاتا تو اس کے جواب میں ساوتری کے پیروں کی چھاگل سنائی دیتا اور وہ اپنے پچلی جیسے سڈول جسم کی نوکر کی ساڑھی میں لپیٹے اُس کے لیے بھاکری اور ساگ اور پیاز کی گٹھیاں لاتی اور محبت کی منڈیر پر ہی بیٹھ کر وہ کھانا کھاتے اور کبھی کبھی بچوں کی طرح ساوتری نوالہ بنا کر سکھارام کو دیتی اور کبھی وہ شرارت سے ساوتری کی انگلی کاٹ لیتا اور جب وہ اس پر کھل کھلا کر ہنس پڑتی تو پھر وہ نوالہ بنا کر ساوتری کے منہ میں دیتا اور اس کے نازک سفید دانت سکھارام کی مضبوط کھردُری انگلی کو نرمی سے اپنی پکڑ میں لے لیتے اور پھر دانتوں کی جگہ ہونٹ لے لیتے۔ ساوتری کے انگوروں جیسے اُودے اور رس بھرے ہونٹ اور سکھارام کو محسوس ہوتا کہ وہ نرمی اور پیار کی ایک لہر میں ڈوبتا جارہا ہے۔ ڈوبتا جارہا ہے، اور وہ نہیں چاہتا کہ کوئی اسے ڈوبنے سے بچائے۔

ایک دن سکھارام صبح کو دیر سے اٹھا، انگڑائی لے کر رات بھر کی نیند کا نشہ دور کیا، پھر رام کا نام لے کر کھڑا ہوگیا تو اُسے اپنی اٹی جہاں وہ سب روپیہ رکھا کرتا تھا ہلکی لگی۔ گھبرا کر جلدی سے کھول کر دیکھا تو سب روپیہ غائب تھا۔ چھ مہینے کی محنت پر پانی پھر گیا تھا۔

''کہاں ہے وہ بدمعاش؟'' وہ بے تحاشا چلایا۔

''کون بدمعاش؟'' کسی نے پوچھا۔

''جو میرے قریب یہاں فٹ پاتھ پر سورہا تھا رات کو بڑی دیر تک مجھ سے میٹھی میٹھی باتیں کررہا تھا۔ میں نے اُس کو بتایا۔ ہاں میں نے ہی اُس کو بتایا تھا کہ میرے پاس ساڑھے تین سو روپے جمع ہوچکے ہیں ..... مگر وہ ہے کہاں؟''

ایک بوڑھا بھکاری جو ایک کونے میں بیٹھا سب کچھ دیکھتا رہتا تھا اور اُس فٹ پاتھ کی سب خبریں رکھتا تھا بولا ''ارے بھیکو تمھیں اب نہیں ملے گا۔ وہ تو کہیں بیٹھا تمھارے روپے سے دارو پی رہا ہوگا۔''

پورے تین دن اُس نے شہر کی خاک چھانی۔ ہر دارو بنانے اور دارو بیچنے والے غیر قانونی اڈّے پر ہو آیا۔ بڑے بڑے عجیب آدمیوں سے اس کی ملاقات ہوئی۔ ان میں سے کئی چاہتے تھے کہ وہ بھی دارو سپلائی کرنے کے دھندے میں لگ جائے۔ ایک ہی مہینے میں اُس کا سارا نقصان پورا ہوجائے گا مگر سکھارام کو کام نہیں چاہیے تھا اس کو بھیکو سے بدلہ لینا تھا، جس نے اُس کی تین مہینے کی محنت پر پانی پھیر دیا تھا۔ آخرکار چوتھے دن دھراوی کے ایک جھونپڑے میں وہ بھیکو کو پکڑ پایا۔ وہ ایک میز پر بوتل اور گلاس اور بھنے ہوئے چنوں کی ایک پلیٹ رکھے ہوئے دارو پی رہا تھا۔

سکھا رام نے اُس کو گلے سے پکڑلیا اور چلایا ''نکال میرے روپے۔''

بھیکو نشے میں تھا پھر بھی اُس نے انکار نہیں کیا، صرف اتنا کہا: ''گلا تو چھوڑ دو تا ہوں، دیتا ہوں۔''

سکھارام نے ہاتھ ڈھیلا چھوڑ دیا۔ بھیکو نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ مٹھی بھر کے نکال کر میز پر ڈال دیے۔ سکھا رام نے جھپٹا مار کر ان کو تو اپنے قبضے میں کیا۔ پھر گن کر بولا۔ مگر تو نے تو ساڑھے تین سو روپے چرائے تھے۔ یہ تو صرف تین روپے اتنی پیسے ہیں۔ باقی کہاں ہیں؟

''یہاں'' بھیکو نے اپنے پیٹ کی طرف اشارہ کیا۔ اور پھر قہقہہ لگا کر بولا۔



ایک بوڑھا بھکاری جو ایک کونے میں بیٹھا سب کچھ دیکھتا رہتا تھا اور اُس فٹ پاتھ کی سب خبریں رکھتا تھا بولا "ارے بھیکو تمھیں اب نہیں ملے گا۔ وہ تو کہیں بیٹھا تمھارے روپے سے دارو پی رہا ہوگا"

پورے تین دن اُس نے شہر کی خاک چھانی۔ ہر دارو بنانے اور دارو بیچنے والے غیر قانونی اڈّے پر ہو آیا۔ بڑے بڑے عجیب آدمیوں سے اس کی ملاقات ہوئی۔

''سب پی گیا۔ بھئی بڑا مزہ آیا۔ تھینک یو۔ تھینک یو۔ دھنیہ واد۔''

''دھنیہ واد کے بچے!'' سکھارام نے پھر اس کا گلا پکڑلیا۔ اس پر دارو بیچنے والا اور اس کے دو چار ساتھی وہاں آگئے اور سکھارام کا ہاتھ پکڑا کر اُلٹا اس کو مارنے لگے۔

''نہیں چھوڑ دو اسے۔'' بھیکو نے حکم دیا اور ان لوگوں نے سکھارام کو چھوڑ دیا۔

''یہ میرا دوست ہے ذرا غصے میں آگیا تھا۔'' اور پھر سکھارام کی طرف دیکھ کر ''بیٹھو، بیٹھو، تم بھی پیو۔ ابھی ہم دو بوتلیں اور منگا سکتے ہیں۔''

''میں نہیں پیتا۔'' سکھارام نے کہا۔

''ابھی تو شکل ہے کہ تم پیتے نہیں ہو جب ہی تو اٹی میں اتنے روپے لیے پھرتے ہو اور پھر بھی فٹ پاتھ پر سوتے ہو۔ پیو میرے بھائی۔ دارو تمھارے ہی پیسے سے آئی ہے۔''

یہ کہہ کر اُس نے گلاس میں دارو انڈیل دی اور گلاس سکھارام کی طرف بڑھایا۔

سکھارام نے سوچا ''یہ بھی ٹھیک کہتا ہے۔ میرے پیسے ہی کی تو دارو پی رہا ہے۔'' اس نے گلاس اٹھا کر منہ سے لگایا۔ ایک بار تو بڑی بو آئی۔ پھر دل کڑا کر کے وہ پی گیا۔ اُس کو پہلے تو ایسا لگا کہ کسی نے چاقو سے اس کا گلا اندر سے چیر دیا ہے، مگر تھوڑے ہی عرصے میں وہ احساس جاتا رہا۔ اور اس کی جگہ ایک نرم نرم گرمی نے لے لی جو اس کے بدن میں دوڑتی جارہی تھی۔

بھیکو نے اس کا گلاس پھر بھر دیا تھا ''اور پیو میرے یار۔''

سکھارام نے دوسرا گلاس بھی پی لیا۔

اب اُس نے گلاس واپس میز پر رکھا ہی تھا اور بھیکو اس میں تیسرا پیگ انڈیلنے کے لیے دارو کی بوتل اٹھا ہی رہا تھا کہ اُس کی نظر اس کی کلائی پر پڑی جہاں ایک سنہری پٹے کی گھڑی جگمگا رہی تھی۔

''یہ بھی میرے پیسے سے لی ہے؟'' وہ چلایا۔

بھیکو نے کلائی سے گھڑی اتار کر سکھارام کو دے دی۔ ''یہ لو میرے یار آج ہی ایک اسمگلر سے پچاس روپے میں لی ہے۔ خالص دلایتی گھڑی ہے، اندھیرے میں بھی وقت بتاتی ہے۔''

ڈھائی برس کے بعد آج بھی وہ گھڑی سکھارام کی کلائی پر لگی ہوئی اندھیرے میں وقت بتا رہی تھی۔ چار بج کر پانچ منٹ ہوئے تھے۔ سکھارام نے سوچا وقت بھی کتنے دھیرے دھیرے گزرتا ہے، ساڑھے چار بجیں تو میں اپنا دھندا چالو کروں، اور پھر اس کو گھڑی سے بھیکو کی یاد آئی، بھیکو جواب بھی جیل کی ہوا کھا رہا تھا مگر جس نے سکھارام کے روپے چرا کر اس کو چوری کا راستہ دکھایا تھا۔

پہلے چھوٹی موٹی چوریاں، پھر بڑی چوریاں، مگر کبھی سکھارام کے پاس اتنے روپے نہ ہوئے کہ وہ گاؤں واپس جاکر اپنی زمین چھڑا لیتا۔ دو بیل خرید لیتا۔ ساوتری کے لیے دو چار بڑھیا ساڑھیاں اور کچھ زیور خرید لیتا۔ اوّل تو چوری کا مال دوکان داروں کو کوڑیوں کے بھاؤ بیچنا پڑتا تھا۔ دوسرے جو آتا تھا وہ کھانے پینے پالنے میں خرچ ہوجاتا تھا، جیل میں وہ فضلو ٹھیک کہتا تھا ''یار اس حرام کی کمائی میں برکت نہیں ہوتی ہے۔''

پونا میں ایک دن شام کو اندھیرا ہوتے ایک عورت کا بٹوہ چھین کر بھاگنا چاہا مگر اس کم بخت نے چیخ چیخ کر

آسمان سر پر اٹھا لیا۔ چاروں طرف سے لوگ دوڑ پڑے تھے۔ سکھارام نے بٹوے میں سے دس بیس روپے کے نوٹ نکال کر بٹوہ زمین پر پھینک دیا، اور خود بھاگتے بھاگتے ایس۔ ٹی۔ کے بس اسٹینڈ کی طرف آنکلا۔ ایک بس جانے کو تیار تھی، وہ اس میں سوار ہوگیا، بس چل پڑی۔ کنڈکٹر نے پوچھا، کہاں جاؤ گے؟'' سکھارام نے جس کا سانس دوڑنے سے اب تک پھولا ہوا تھا جواب دیا ''جہاں بھی یہ بس جارہی ہے۔''

بس کنڈکٹر نے کسی جگہ کا نام لیا جو بس کی گھرگھراہٹ میں سنائی نہ دیا، پھر اس نے کہا ''سات روپے ہوں گے۔'' سکھارام نے اُسے چوری کا دس نوٹ پکڑا دیا اور تین روپے لے کر جیب میں رکھ لیے۔

صبح سویرے بس اپنی منزل پر پہنچی تو سکھارام آنکھیں ملتا ہوا اُترا اُس کا خیال تھا کہ کوئی گاؤں ہوگا، مگر یہاں پہنچ کر دیکھا کہ بڑی رونق ہے، اچھا خاصا قصبہ ہے۔ بازار بھی ہے، بازار میں دوکانیں بھی ہیں، دکان میں سامان بھی ہے۔ چوری کرنے کے قابل سامان!

سکھارام نے فیصلہ کرلیا کہ دو تین روز یہیں گزارنے چاہئیں، کون جانتا ہے اس کی قسمت یہاں ہی کھل جائے۔ دن بھر وہ بازاروں میں گھومتا، کس دکان میں کیا کیا سامان ہے، اس کو دماغ میں یاد کرتا۔ کہاں ساڑھیاں ملتی ہیں، کہاں زیور، کہاں ریڈیو، کس کس دکان میں تجوریاں ہیں جو یقین ہے روپوں سے بھری ہوں گی، رات کو چوکیدار بازار کا گشت لگاتے تھے، مگر اس نے دیکھ لیا تھا کہ ساڑھے چار بجے صبح وہ اپنے اپنے گھر چلے جاتے ہیں، بس وہی وقت ٹھیک رہے گا، اس کے کام کے لیے۔ دو چار دکانوں ہی سے اس کا کام چل جائے گا، اور دکانیں کھلنے کے وقت تک وہ وہاں سے بہت دور نکل جائے گا۔

شہر کی ساری رونق بندھ کی وجہ سے تھی، زیادہ تر لوگ وہیں کام کرتے تھے۔ سوسکھارام نے سوچا کیوں نہ بندھ کو بھی دیکھ لیا جائے بندھ واقعی بڑا جنگلی تھا۔ دو پہاڑیوں کے بیچ میں ندی کے پانی کو روکنے کے لیے بندھ بنایا ہوا تھا۔ بڑے بڑے بجلی کے کارخانے بھی تھے۔ بندھ پر اب بھی کچھ کام ہورہا تھا۔ سینکڑوں مزدور کام پر لگے ہوئے تھے۔

ایک مزدور سے سکھارام نے پوچھا ''کیوں بھئی یہ اتنا بڑا بندھ کیوں بنایا ہے؟''

اُس نے کہا۔ تم اتنا بھی نہیں جانتے۔ یہاں پانی اکٹھا کرکے نہریں نکالیں گے جو سوکھے کھیتوں میں پانی پہنچائیں گی۔''

سکھارام نے سوچا ''میرے کھیتوں میں بھی پانی آئے گا؟''

وہ مزدور اب کہہ رہا تھا ''اور یہ بجلی گھر بھی پانی کی طاقت سے چلتے ہیں، یہاں بجلی بنتی ہے اور ان تاروں سے دور دور جاتی ہے۔ جانتے ہو بمبئی بھی بجلی یہیں سے جاتی ہے۔''

اور سکھارام کے دماغ میں بمبئی کی لاکھوں جگمگاتی ہوئی روشنیاں ابھر آئیں۔ اتنی دور سے بجلی وہاں جاتی ہے! پھر اس نے سوچا ''مگر میرا گاؤں تو صرف چالیس میل ہے یہاں سے۔ وہاں تک تو یہ بجلی جاتی نہیں ہے۔ مجھے اس بجلی سے فائدہ؟''

ایک اونچے ٹیلے پر کسی مزدور نے ٹین کی چھت کا

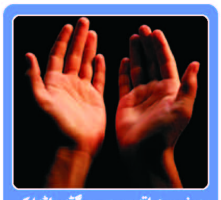

دونوں ہاتھوں سے گنبد اٹھا کر اس نے سر پر رکھا وزن کافی تھا دھیرے دھیرے آسمان میں سویرا ابھر رہا تھا پورب کی طرف بادل پہاڑیاں پر چھائیاں دھیرے دھیرے شہر کے کھنڈر بھی دھرتی پر ابھر رہے تھے۔ ہر طرف سناٹا تھا اور تبھی ایسا لگتا تھا شہر مر گیا ہے، دنیا مر گئی ہے صرف ایک آدمی زندہ ہے، اور وہ دونوں ہاتھوں سے دنیا کی دولت بٹور کر لیے جارہا ہے

ایک جھونپڑا بنایا تھا۔ وہ خالی پڑا تھا، رات کو نظر بچا کر سردی سے بچنے کے لیے سکھارام اُسی میں پڑ رہتا۔ وہاں سے ایک طرف بہت دور بندھ پر لگی ہوئی روشنیاں نظر آتیں، دوسری طرف شہر کے مکانوں اور دکانوں کی بتیاں۔ وہ سوچتا اس روشنیوں کے سمندر میں یہی جھونپڑا ایک اندھیرے کا ٹاپو ہے پھر سوچتا شاید اندھیرا جھونپڑے میں نہیں ہے۔ میرے من میں ہے۔

نہیں یہ اندھیرا کچھ اور قسم کا تھا۔ اس میں تو بندھ کی روشنیاں بھی ڈوب گئی تھیں۔ اندھیرے کے سمندر کی تہہ میں دور کہیں دھندلی دھندلی سی ٹمٹما رہی تھیں، اس کا اپنا گلا ہی گھٹتا نہیں معلوم ہوتا تھا، ایسا لگتا تھا کوئی دنیا کا گلا گھونٹ رہا ہے۔ ممکن ہے یہ میرا وہم ہی ہو، اس نے سوچا اور ایک بار پھر گھڑی کی اندھیرے میں چمکنے والی سوئیوں کی طرف دیکھا۔ چار بج کر بیس منٹ ہوئے تھے، اب اسے چلنا چاہیے۔ بازار پہنچنے میں کم سے کم دس منٹ تو لگیں گے، یہ سوچ کر وہ کھڑا ہی ہوا تھا کہ زمین کے اندر سے ایک گڑگڑاہٹ کی آواز آئی جیسے سرنگ میں کوئی ریل چل رہی ہو یا ہوائی جہاز بہت نیچے اڑ رہا ہو اور چھت پر گرنے ہی والا ہو۔ ساتھ ہی اس کے پاؤں کے نیچے سے زمین جیسے رک گئی ہو۔ قدم ڈگمگائے تو اس نے اندھیرے میں دیوار کا سہارا لینے کی کوشش کی۔ ہاتھ سے چھوا تو اس کو ایسا لگا جیسے دیوار بھی لرز کھڑا رہی ہے۔ اس نے شام کو شراب پی ہوئی تو وہ سمجھتا یہ سب نشے کا کرشمہ ہے مگر اس نے تو چار دن سے دارو کو ہاتھ بھی نہ لگایا تھا، پھر یہ سب کیا .....

''جھونچال!'' دفعتاً یہ خیال بجلی کی طرح اس کے دماغ میں کوندا اور اگلے لمحے میں جھونپڑے کی لرز کھڑاتی ہوئی دیواریں اور کھڑکھڑاتی ہوئی ٹین کی چھت اس کے سر پر آرہی ہیں۔

جب اس کو ہوش آیا تو سب سے پہلے جو چیز اس نے محسوس کی وہ گندھک کی تیز بو تھی اور ایک دم گھونٹنے والا دھول مٹی کا بادل۔ اندھیرا اب بھی اتنا گہرا تھا کہ اس کو چاقو سے کاٹ سکتے تھے۔ سکھارام کو اپنے ماتھے پر پانی کی ایک لکیر چلتی ہوئی معلوم ہوئی ٹٹول کر دیکھا تو منہ سے ''سی'' نکل گئی۔ سر میں گہرا زخم آیا تھا جس میں سے خون رس رہا تھا۔ ٹانگوں پر، بازوؤں پر، ایک طرف چہرے پر بھی چوٹیں آئیں تھیں مگر یہ وقت ان معمولی زخموں کی پرواہ کرنے کا نہیں تھا۔ زخموں کی ٹیس اس کو جھٹک کر بے ہوشی سے باہر نکال لائی تھی اور اب ایک ہی خیال اس کے دماغ میں گھوم رہا تھا۔ اس جھونپڑے کی طرح بازار میں دکانوں کی دیواریں اور چھتیں بھی گر گئی ہوں گی اس کو تالا توڑنے کی تکلیف بھی نہ کرنی پڑے گی۔ اُس نے اپنی گھڑی دیکھی۔ پورے ساڑھے چار بجے تھے۔ بھونچال آئے صرف دس منٹ ہوئے تھے۔

ٹین کا چھپر جو اس کے سر پر گرا تھا اس کو ہاتھ سے ہٹا کر وہ اٹھ کھڑا ہوا، چاروں طرف دیواروں کی اینٹوں کے ڈھیر تھے۔ اندھیرے میں ٹٹولتا، لنگڑاتا، گرتا پڑتا، وہ اندازے سے شہر کی طرف چل کھڑا ہوا، اندھیرا اب ایک ملگجے دھندلکے میں تبدیل ہورہا تھا، مگر بندھ پر اور شہر میں سب جگہ بجلی کی روشنیاں بجھ گئی تھیں۔ اب تو اس کا کام اور بھی آسان ہوگیا تھا۔

سارا شہر ایک دم گر پڑا تھا۔ جیسے گھر نہ ہوں، بچوں

3/21/2018 P45.jpg (1758×2358)

کے بنائے ہوئے مٹی کے گھروندے ہوں۔ زمین سے دھول کے بادل اٹھ رہے تھے۔ اینٹوں، پتھروں ٹین کے پتروں کے نیچے دبے ہوئے آدمی۔ مردہ عورتیں، بچے— جو مر نہیں گئے تھے یا بالکل بے ہوش نہیں ہوگئے تھے وہ چلا رہے تھے، رو رہے تھے، سسک رہے تھے، بلک رہے تھے، کراہ رہے تھے۔ ایک نے ایک سایہ سا پاس سے گزرتے دیکھا تو چلایا۔ ''بھائی۔ مجھے بچاؤ۔ مجھے بچاؤ۔ مجھے اینٹوں کے اس ڈھیر میں سے نکالو۔ شاید میری ٹانگیں جاتی رہی ہیں۔'' مگر سکھارام کو اس وقت ایک ہی دھن تھی۔ وہ کسی کی جان بچانے کے لیے تیار نہیں تھا، آج بھگوان نے اسے سچ مچ چھپر پھاڑ کر دولت دی تھی۔ ایسا موقع وہ کھونے والا نہیں تھا۔ دو ہاتھوں سے جتنا کچھ سمیٹ سکا وہ لے کر وہاں سے چل دے گا، اور جب تک لوگوں کو ہوش آئے گا وہ اپنے گاؤں، اپنی ساوتری کے پاس پہنچ جائے گا۔

اندھیرے میں گرتا پڑتا، سنبھلتا، ٹھوکریں کھاتا، وہ بازار کی طرف چلا جا رہا تھا، کہیں کہیں مکانوں کی دیواریں بیچ سڑک پر آ رہی تھیں۔

اینٹ پتھر کے ڈھیروں سے بچنے کے لیے سکھارام کو گرے ہوئے گھروں میں سے راستہ بنانا پڑتا۔ ایک بار تو اس کو محسوس ہوا کہ اس کا پیر کسی نرم چیز پر پڑا ہے۔ شاید کسی کی ٹانگ تھی یا ہاتھ تھا۔ ایک ہلکی سی ''آہ'' سنا دی اور پھر سکھارام آگے بڑھ گیا۔

سکھارام نے صبح کے دھندلکے میں دیکھا کہ بازار میں کسی دوکان کی چھت یا دیوار سلامت نہیں بچی تھی۔ دوکانوں کا سب سامان بکھرا پڑا تھا یا اینٹ پتھروں کے ڈھیر کے نیچے دبا ہوا تھا۔ سب سے پہلے سکھارام نے ساڑھیوں کی دکان سے دس پندرہ ساڑھیاں گھسیٹیں۔ ایک ساڑھی کو دہرا کر کے زمین پر پھیلایا۔ اس میں سب ساڑھیوں کا ڈھیر لگایا۔ کچھ کپڑے کے تھان ڈالے۔ پاس کی دکان سے دو ریڈیو لے کر ان کو رکھا۔ ایک جیولر کی دکان کے ملبے میں زیور بکھرے ہوئے تھے۔ سکھارام نے ٹٹول ٹٹول کر اٹھائے۔ یہ دیکھنے کا وقت نہیں تھا کہ سونے کے ہیں یا چاندی کے۔ ایک تجوری اوندھی پڑی تھی اس کو سیدھا کرنے کی کوشش کی مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔ ایک اور دکان کا کیش بکس اڑ کر کہیں سے کہیں پہنچ گیا تھا۔ اُس کو کھولنے کی کوشش کی۔ بڑا بھاری تھا۔ ضرور روپے بھرے ہوں گے۔ جب نہ کھول سکا تو بند کا بند ہی ڈھیر میں شامل کر لیا۔ ساڑھی کا گٹھر باندھا۔ اب تو وہ اتنا بڑا ہو گیا تھا کہ بڑی مشکل سے دونوں ہاتھوں سے اٹھا کر اس نے سر پر رکھا وزن کافی تھا اس کی ٹانگیں لڑکھڑانے لگیں۔



فلم اداکار رشی کپور خواجہ احمد عباس کی کہانیوں کے انگریزی انتخاب 'این ایوننگ ان لکھنؤ' کا اجرا کرتے ہوئے

خواجہ احمد عباس کی اہم تصانیف

: ایک لڑکی، زعفران کے پھول، پاؤں میں پھول، میں کون ہوں، گیہوں اور گلاب، نئی دھرتی نئے انسان، نیلی ساڑھی (افسانوں کے مجموعے)، انقلاب (ناول)، آئی ایم ناٹ این آئی لینڈ (خودنوشت سوانح عمری انگریزی)، مسافر کی ڈائری (سفرنامہ)۔

اہم فلم اسکرپٹ

نیا سنسار 1941، نیچا نگر 1946 (حیات اللہ انصاری کی کہانی پر مبنی پہلی ہندوستانی فلم جسے کوئی بین الاقوامی ایوارڈ کان فیسٹیول، حاصل ہوا)، ڈاکٹر کوٹنیس کی امر کہانی، آوارہ، بارہ دری، شری چار سو بیس، جاگتے رہو، میرا نام جوکر، بابی، اچانک، لوان گوآ، حنا

فلمیں بطور ڈائریکٹر/پروڈیوسر/رائٹر

دھرتی کے لال 1946، کل اور آج، انہونی، راہی، نغمہ، منا، دروازہ، جواب، پردیسی، محفل، ہتھکڑی، چار دل چار راہیں، ذرا بچ کے، قاتل، گیارہ ہزار لڑکیاں، روپ لیکھا، مایا محل، تین گھرانے، شہر اور سپنا، ہمارا گھر، آسمان محل، بمبئی رات کی باہوں میں، سات ہندوستانی، دو بوند پانی، فاصلہ، دی نکسلائٹس، ایک آدمی 1988

مگر اس نے جی کڑا کر کے قدم بڑھائے تاکہ سویرا ہونے سے پہلے وہاں سے باہر نکل جائے۔

دھیرے دھیرے آسمان میں سویرا ابھر رہا تھا۔ پورب کی طرف بادل، پہاڑیاں بندھ، ہلکی ہلکی پرچھائیاں سی اب دکھائی دے رہی تھیں، دھیرے دھیرے شہر کے کھنڈر بھی دھرتی پر ابھر رہے تھے۔ ہر طرف سناٹا تھا اور تباہی۔ ایسا لگتا تھا شہر مر گیا ہے، دنیا مر گئی ہے صرف ایک آدمی زندہ ہے، اور وہ دونوں ہاتھوں سے دنیا کی دولت بٹور کر لیے جا رہا ہے۔

نہیں (اس نے سوچا) کوئی اور بھی زندہ ہے! ایک بچے کے رونے کی آواز نے سکھارام کو چونکا دیا، جیسے یہ آواز باہر سے نہ آئی ہو خود اس کے من کے اندر آئی ہو۔ اُس نے مڑ کر دیکھا، ایک گھر کی چھت اور دیواریں ڈھیر ہو چکی تھیں۔ اُن ہی میں ایک طرف باپ مرا پڑا تھا، پاس ہی ماں، اور ان دونوں لاشوں کے قریب ہی ایک سال ڈیڑھ سال کا بچہ جو کسی معجزے سے بچ گیا تھا۔ اینٹوں کے ڈھیر پر بیٹھا دھاڑیں مار مار کر رو رہا تھا۔ سکھارام نے بچے کو دیکھا پھر ایسے نظر پھیر لی جیسے بچے نے اس کی چوری پکڑ لی ہو، جلدی جلدی قدم بڑھائے کہ اتنی دور پہنچ جائے کہ بچے کی آواز اُس کے کانوں تک نہ پہنچے۔ مگر بچے نے پہلے سے بھی زیادہ زور سے رونا شروع کر دیا۔ چلتے چلتے اس کے قدم آپ سے آپ رک گئے، اس کو محسوس ہوا جیسے وہ اُس کا اپنا بچہ ہو جو ہمیشہ اُن کے سپنوں میں آتا تھا مگر جس نے اب تک ساوتری کی کوکھ سے جنم نہ لیا تھا۔

اس نے مڑ کر بچے کی طرف دیکھا۔ سر پر گٹھر اٹھائے الٹے پاؤں اس کے قریب گیا۔ سوچا کسی طرح اس گٹھری کو بھی لے چلوں اور اس بچے کو بھی اٹھا لوں مگر ہاتھ دو ہی تھے۔ یا ایک بوجھ کو سنبھال سکتے تھے یا بچے کو گود میں لے سکتے تھے۔

اس نے سر سے گٹھڑی اتار پھینکی۔ دوڑ کر بچے کے باپ کے پاس گیا، بے چارے کے سر پر ایک بھاری پتھر گرا تھا۔ کب کا دم توڑ چکا تھا۔ ماں کی نبض پر ہاتھ رکھا ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو چکے تھے، پھر اس نے بچے کی طرف ہاتھ پھیلائے۔ بچہ ہمک کر اس کی گود میں آتے ہی خاموش ہو گیا جیسے اُسے اپنی منزل مل گئی ہو۔

سکھارام نے ایک نظر اُس گٹھڑی کی طرف دیکھا، جس میں دنیا کی ہر دولت موجود تھی۔ پھر دونوں ہاتھوں سے بچے کو سنبھال کر اپنی چھاتی سے لگا لیا اور چل کھڑا ہوا۔

دور بندھ کے پیچھے سورج بادلوں سے اپنا سر نکال کر کوئنہ نگر کی تباہی کو دیکھ رہا تھا۔ مگر سورج کی ایک نرم کرن سکھارام اور اُس کی چھاتی سے لگے ہوئے بچے پر پڑی اور بچہ جس کی آنکھ میں اب تک آنسو تھے، آپ سے آپ مسکرا دیا۔ (1968)

■

ماخذ: نئی دھرتی نئے انسان، **مصنف:** خواجہ احمد عباس،
ناشر: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی

http://urducouncil.nic.in/Urdu-Duniya/Urdu-Duniya-June-2012/P45.jpg 1/1

شریفہ الشملان

عربی افسانہ

محرمِ راز



اُن کے کام کے بارے میں پوچھ تاچھ کرنا میری عادت نہیں۔ وکالت اور قانونی امور سے متعلق ان کا ذاتی کاروبار کافی پھیلا ہوا ہے۔ جہاں تک میرا تعلق ہے میں ایک اخبار میں صحافی کے طور پر کام کرتی ہوں۔ کبھی کسی مضمون کے لیے دلچسپ کہانی کی تلاش میں رہتی ہوں، کبھی کسی کا انٹرویو لیتی ہوں اور کبھی خود اپنی کوئی نظم شائع کرنے کا خواب پورا کرلیتی ہوں۔ مجھے فون کالز کا جواب دینے سے سخت چڑ ہے حالانکہ اپنے کام کے سلسلے میں مجھے کافی وقت فون پر ہی صرف کرنا ہوتا ہے۔ مجھے اپنے شوہر احمد سے ان کے کاروبار کے سلسلے میں گفتگو کرنے کا کوئی شوق نہیں۔ نہ ہی ان لوگوں کے نام جاننے میں کوئی دلچسپی ہے جو کاروبار کے سلسلے میں ان کو فون کرتے ہیں۔ اُن کی دنیا الگ ہے، میری دنیا الگ، جیسے قطب شمالی اور قطب جنوبی۔

اپنے مصروف دفتر میں کبھی میں خوش ہوتی ہوں کبھی نروس۔ سعاد دفتر میں میرے ساتھ کام کرتی ہے۔ ہم کافی وقت ساتھ گزارتے ہیں، میٹنگوں میں ساتھ ہوتے ہیں، کبھی مل کر رپورٹیں تیار کرتے ہیں۔ ایک دن کام ختم کرنے کے بعد سُعاد نے اپنی ازدواجی زندگی اور شوہر کے مسائل کے بارے میں مجھ سے باتیں کیں:

''لیلیٰ! اب یہ گاڑی نہیں چلے گی۔ وہ دوسری عورتوں سے تعلقات رکھتا ہے اور اس کی دیدہ دلیری دیکھو کہ مجھ پر شک بھی کرتا ہے جبکہ میں اس معاملے میں بالکل بے قصور ہوں۔ میری زندگی جیسے جن اور عفریت میں گھری ہے، بس ڈر اور دہشت۔ روز امید کرتی ہوں کہ شاید کوئی بہتری کی صورت نکل آئے لیکن نہ جانے وہ دن کب آئے گا۔''

سُعاد مجھے اپنے شوہر کی زیادتیوں اور مظالم کے بارے میں بتاتی رہی، مجھے اس سے ہمدردی ہورہی تھی۔ لیکن وہ جو کچھ اپنے شوہر کے بارے میں بتارہی تھی اس پر کچھ یقین سا نہیں آرہا تھا۔ میں نے کہا:

''لیکن اگر وہ اتنا ظالم ہے تو تمھیں ملازمت کرنے کی اجازت کیسے دے رکھی ہے اور خاص طور صحافت کی ملازمت جس میں تمھیں مستقل اِدھر اُدھر آنا جانا پڑتا ہے، بہت سے لوگوں سے ملنا جلنا ہوتا ہے۔ کیا اس طرح اس کے دل میں شک کا شعلہ اور نہیں بھڑکتا؟ اس سے تو تمھارے لیے اور بھی مشکل پیدا ہوجاتی ہوگی۔''

اس نے کہا ''پیسے کے لیے اس نے مجھے کام کرنے کی اجازت دے رکھی ہے۔ ہر شام جب میں گھر جاتی ہوں تو وہ مجھے بہت پریشان اور نروس کردیتا ہے۔''

ایک دم میری نظر میں اپنے شوہر کی قدر کچھ اور بڑھ گئی۔ احمد نے آج تک مجھ سے یہ نہیں پوچھا کہ میں کتنا کماتی ہوں۔ نہ یہ پوچھا کہ میں اپنی تنخواہ کا کیا کرتی ہوں۔ سُعاد کے شوہر کے مقابلے میں میرا شوہر تو بہت اچھا اور محبت کرنے والا ہے۔

بہرحال مجھے نہیں معلوم تھا کہ اس معاملے میں آگے چل کر احمد کا ذکر بھی آجائے گا۔ کچھ اِدھر اُدھر کی باتوں اور سوالوں کے بعد سُعاد اپنے مقصد پر آگئی اور احمد کی وکالت کے بارے میں پوچھنے لگی۔ اس نے اپنی سخت لکڑی کی کرسی پر ذرا آگے جھک کر میری طرف دیکھتے ہوئے بہت سنجیدگی سے کہا ''میں اپنے شوہر سے طلاق لینا چاہتی ہوں۔ کیا تم سمجھتی ہو کہ احمد میرا یہ طلاق کا کیس کرنے پر راضی ہوجائیں گے؟''

سُعاد کے لہجے اور چہرے کا تاثر اتنا پُراصرار تھا کہ مجھے لگا کہ اس بارے میں مجھے آج رات احمد سے بات کرنی ہی پڑے گی۔

اس سے پہلے میں نے کبھی احمد کے کام میں دخل اندازی نہیں کی تھی اور نہ ہی کسی کی مدد کرنے کی درخواست کی تھی۔ لیکن مجھے معلوم تھا میں سُعاد کی درخواست ٹال نہیں سکتی۔

شام کو میں نے احمد کو سُعاد کے مسائل کے بارے میں بتایا۔ احمد کی ہمدردی حاصل کرنے کے لیے میں نے سارا قصہ کچھ اور بڑھا چڑھا کر پیش کیا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ عام طور پر عائلی کیس نہیں لیتے تھے۔ انھوں نے اکثر خاندانی مسائل میں ہاتھ ڈالنے سے اپنی بے زاری ظاہر کی تھی۔ سُعاد کے اس مسئلے پر ان کے رویے نے مجھے کچھ زیادہ حیران نہیں کیا۔ ان کی تیوری پر ایک بل پڑ گیا اور خفگی کا بادل سا ان کے چہرے پر چھا گیا۔

''میں کسی ایسی عورت پر اپنا وقت برباد کیوں کروں، جس کا کیس برسوں عدالت میں چلتا رہے گا، اور پھر اس کے بچے بھی ہیں تو اس کے قانونی مسائل الگ ہوں گے، اس سے معاملہ اور پیچیدہ ہوجائے گا۔'' انھوں نے گہرا سانس لیا اور میری آنکھوں میں معاملہ فہمی ڈھونڈنے لگے۔ ''لیلیٰ! دیکھو اس قسم کے کیس تھوڑے ہی دن میں وکیلوں کو نچوڑ کر رکھ دیتے ہیں۔ دماغ پچی کردیتے ہیں، ایسے کیسوں میں ہاتھ ڈالنے سے کوئی فائدہ نہیں۔''

''مجھے معلوم ہے، لیکن بس یہ ایک کیس۔ وہ میری خاص دوست ہے، پلیز احمد، بس ایک بار'' میں نے کہا۔

''ٹھیک ہے۔ لیکن میں یہ صرف تمھاری وجہ سے کروں گا'' انھوں نے کہا۔ میرے پورے جسم میں اطمینان کی لہر دوڑ گئی۔ میں احمد کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر مسکرا کر ان کا شکریہ ادا کیا۔

کچھ ہی دن بعد سُعاد اپنے ذاتی معاملات کے بارے میں احمد کا کافی وقت لینے لگی۔ بات شروع ہوئی کورٹ تک احمد کے ساتھ کار میں جانے کی درخواست سے، پھر کیس کے سلسلے میں مستقل فون پر بات چیت کا سلسلہ۔ ایک دن مجھے کچھ شک سا ہوا جب میں نے دونوں کو سُعاد کے فلیٹ کے قریب دیکھا۔ لیکن میں نے اپنے آپ کو یقین دلایا کہ احمد میں اتنی شرافت ہے کہ وہ کسی عدالتی کاروائی میں پھنسی عورت کے چکر میں نہیں پڑیں گے۔

کچھ ہی مہینوں میں احمد نے کیس سے متعلق کاغذات اور گواہ جمع کرلیے اور کیس دائر کردیا۔ انھوں نے اپنی قانونی مہارت سے بہت کامیابی کے ساتھ یہ ثابت کردیا کہ اس رشتہ ازدواج میں سُعاد مظلوم ہے۔ نہ صرف یہ کہ انھوں نے طلاق کا

یہ کیس جیتا بلکہ سُعاد کو نفقے کے پچاس ہزار ریال بھی دلوا دیے۔

یہ بہت غیر معمولی کامیابی تھی۔ زیادہ تر عورتیں تو طلاق حاصل کرنے کے انتظار میں اپنی پوری جوانی گزار دیتی ہیں اور اکثر تو خلع ہی لینی پڑتی ہے اور جج کے فیصلے کے مطابق عورت کو اپنی آدھی عمر اپنے سابقہ شوہر کو قسطوں میں رقم کی ادائیگی میں گذارنی پڑتی ہے۔ لیکن احمد نے بہت ہوشیاری سے یہ کیس لڑا تھا اور سُعاد جیت گئی تھی۔ میں نے احمد سے پوچھا کہ کیا وہ آئندہ بھی عائلی مقدمات لیں گے لیکن انھوں نے منع کر دیا۔

گھر کی زندگی معمول کے مطابق گزرنے لگی۔ سُعاد کے فون بھی اب کم آتے تھے۔ میں نے سوچا کہ اب اسے سکون سے رہنے کا وقت مل گیا ہوگا۔ حالانکہ اب بھی ہم دونوں ایک ہی جگہ کام کرتے تھے لیکن اب کام کے سلسلے میں ہم کم ہی یکجا ہوتے تھے۔ مجھے بھی سکون ہوا کیونکہ میں بہت دن سے چاہ رہی تھی کہ میں خود مختار ہو کر کام کروں۔ لیکن میری چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ چیزیں پہلی جیسی نہیں ہیں۔ احمد شام کے مختلف اوقات میں گھر سے باہر چلے جاتے تھے، مجھ سے اور بچوں سے بہت کم ہی بات کرتے تھے۔ میں احمد کی کم گوئی کی تو عادی تھی لیکن اس کی خاموشی کی نہیں۔ ایسا تو کبھی نہیں ہوتا تھا۔ مجھے پریشانی ہونے لگی، خاص طور پر جب فون کی گھنٹی دوبار بجتی اور پھر بند ہو جاتی۔

ایک دن جب میرے شوہر ایک کاروباری سفر پر روانہ ہوئے، اسی دن سُعاد بھی دفتر نہیں آئی۔ میں نے اپنے سر میں سمائے شیطانی وسوسوں پر لعنت بھیجی۔ دماغ سے نکالنے کی کوشش کی لیکن بے سود۔ میں نے کانپتے ہاتھوں سے سُعاد کے گھر کا نمبر ملایا۔ اس کی فلپینی خادمہ نے فون اٹھایا "ہیلو"

"کیا میں سُعاد سے بات کر سکتی ہوں" میں نے دھیرے سے نروس انداز میں کہا "وہ تو نہیں ہیں میڈم! وہ تو ملک سے باہر گئی ہوئی ہیں" خادمہ نے ٹوٹی پھوٹی عربی میں جواب دیا۔

میں نے فون کا چونگا رکھ دیا، میری دنیا تہ و بالا ہوئی جا رہی تھی۔ میں اتنی پریشان تھی کہ سوچ بھی نہیں سکی۔ کیا احمد اس کے ساتھ ہے؟ یا وہ دونوں الگ الگ کہیں گئے ہیں؟ میرا دماغ کام نہیں کر رہا تھا۔ یا اللہ! ان کے گھر واپس آنے تک یہ سب کیسے برداشت کروں۔

جب احمد گھر آئے تو ان کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ انھوں نے بچوں کو پیار کیا۔ مجھے بانہوں کے گھیرے میں لے کر گلے لگایا۔ ان کی بانہیں مجھے قید جیسی لگ رہی تھیں۔ میں خود اپنے جذبات، کشمکش اور الجھن کا سامنا نہیں کرنا چاہ رہی تھی لیکن مجھے معلوم تو کرنا ہی تھا کہ کیا ہوا ہے۔

اپنا سامان رکھنے کے بعد احمد نہانے چلے گئے۔ میں برابر کے کمرے سے پانی گرنے کی آواز سن سکتی تھی۔ ان کا کینوس کا سوٹ کیس پلنگ پر رکھا تھا، میں نے اس کا زپ کھول لیا۔ میں کانپتے ہاتھوں سے ان کے تہہ کیے ہوئے کپڑوں کو ٹٹول رہی تھی کہ کوئی غیر معمولی چیز مل جائے۔ میری انگلیوں سے کوئی ٹھنڈی اور زنانی چیز ٹکرائی، یہ اُس کی سنہری کنگھی تھی۔ میرے جسم میں ایک سرد لہر دوڑ گئی۔ مجھے احمد کے دروازہ کھولنے کی آواز آئی۔ میں نے جلدی سے وہ کنگھی چھپا دی اور مسکراتے ہوئے ان کی طرف مڑی۔ میں نے اپنی گھبراہٹ چھپانے کی کوشش کی۔ یہ بہت نازک وقت تھا، میں کوئی ایسی بات نہیں کرنا چاہتی تھی جس پر مجھے بعد میں پچھتاوا ہو۔ اللہ نے مجھے مضبوط اعصاب اور اپنے چہرے کے تاثرات چھپانے کی طاقت دی تھی۔

شریفہ الشملان عراق میں پیدا ہوئیں اور پھر سعودی عرب ہجرت کر گئیں جہاں انہوں نے صحافت میں بی اے کیا ان کی کہانیوں کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ وزارت سماجی امور میں ڈائریکٹر کے عہدے پر بھی رہ چکی ہیں۔ عذرا نقوی نے جو خود ایک معروف افسانہ نگار، مترجم اور صحافی ہیں شریفہ کی کہانی کا ترجمہ انگریزی سے اردو میں کیا ہے۔ ادارہ

"میں نے کھانا تیار کر رکھا ہے" میں نے بھاری سی آواز میں کہا، مستقل میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔

"اچھا ہے! بہت لمبی فلائٹ تھی، میں نے پلین میں کچھ بھی نہیں کھایا۔" انھوں نے اپنی مخصوص دلکش مسکراہٹ کے ساتھ کہا، وہی انداز جس نے پہلی بار میرا دل جیت لیا تھا۔ اس سے پہلے کہ میرا چہرہ میرے دکھ کی غمازی کرے میں کچن میں بچوں کے پاس چلی گئی۔

"بابا گھر آ گئے ہیں" میں نے اپنے گلے میں گھٹتی آواز پر قابو پاتے ہوئے کہا "چلو! کھانا لگانے میں میری مدد کرو۔"

صبح کو میں اپنے دفتر چلی گئی۔ میں غور کر رہی تھی کہ میں کروں تو کیا کروں۔ کون سی راہ اختیار کروں؟ گھر...، شوہر...، بچے... میری خوبصورت دنیا بکھرنے لگی تھی۔ ایک تکلیف دہ دراڑ نے میرے گھر کے ٹکڑے کرنے شروع کر دیے تھے۔ کیا یہ دراڑ میں بھر پاؤں گی؟ اس بارے میں جو کچھ کرنا ہے مجھے ہی کرنا ہے... یا پھر میں سب کچھ بکھر جانے دوں۔ مجھے بخار سا چڑھنے لگا، جسم لرزنے لگا اور ایک دم مجھے قے آ گئی۔ کھڑے ہونے کے لیے میں نے کرسی کی پشت کو تھام لیا، میری آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا، میں بے ہوش ہو کر فرش پر گر پڑی۔ میرے دفتر کے لوگ مجھے اسپتال لے گئے جہاں جا کر مجھے معلوم ہوا کہ میں حاملہ ہوں؟ یہ سب کیا ہو گیا؟ میرے قریب میرے بچے اور ان کے لبا بیٹھے تھے۔ مجھے اپنے شوہر کی آنکھوں میں تشویش اور خوف نظر آیا۔ سُعاد نے میری طبیعت نہیں پوچھی، مجھے فون تک نہیں کیا۔

گھر پر فون کی گھنٹی دوبار بجی اور رک گئی، احمد اپنی جگہ سے ہلے بھی نہیں۔ وہ کام کے لیے بھی گھر سے نہیں نکلے۔ اب سرگوشیوں میں فون پر ان کی کسی سے باتیں بھی نہیں ہوتی تھیں۔

ایک دن میرے شوہر نے اپنے رنڈوے بھائی کی دوسری شادی کی بات چھیڑی۔ اُن کے تین بچے تھے، وہ کسی معقول عورت سے شادی کرنا چاہتے تھے جو ان کے بچوں کی دیکھ بھال کر سکے۔ میرے دل میں ایک شرارت بھری خواہش ابھری، میں نے بہت معصومیت کے ساتھ کہا "سُعاد کا جوڑ آپ کے بھائی کے ساتھ اچھا رہے گا۔"

میرے شوہر نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "اللہ کی پناہ۔"

میں نے کہا "آپ اللہ سے کیوں پناہ مانگ رہے ہیں؟ وہ ایک اچھی عورت ہے۔ اس کی طلاق ہو گئی ہے اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ اس کی زندگی تمام ہوئی۔"

"اچھی عورت تو تم ہو، نیک نیت ہو، لیکن اسے اس کے حال پر چھوڑ دو۔ اس کی اپنی زندگی ہے، اپنی دنیا ہے۔ اسے اپنی دنیا میں دخیل مت کرو۔"

میرا دل چاہ رہا تھا کہ چیخ پڑوں "آپ کا اپنے بارے میں کیا خیال ہے۔" لیکن اپنے گھر اور بچوں کی وجہ سے میں خاموش رہی۔ میں ان کروڑوں عورتوں میں سے ایک ہوں جو اپنے گھر اور بچوں کو بچانے کے لیے اپنے غم کو پی جاتی ہیں۔ میں جانتی ہوں کہ وہ میرے پاس لوٹ آئے ہیں۔ لیکن ہماری محبت ایک بلوری گلدان کی طرح ہے جس میں بال پڑ گیا ہو۔ ایک شگاف میرے دل کی گہرائیوں میں بھی پڑ گیا ہے۔ میں تہہ دل سے چاہتی ہوں کہ کبھی میرے شوہر کو اس بات کا پتہ نہ چلے کہ میں ان کا راز جانتی ہوں۔

ترجمہ: عذرا نقوی **ماخذ:** سعودی عرب کے افسانوی ادب کا مجموعہ Whispers from The Heart

Azra Naqvi, Omaxe NRI City, GH2, Tower3, Flat 203, Greater NOIDA



عہدِ مغلیہ کے مغربی سیاح

بنارسی پرشاد سکسینہ

17ویں صدی کے نصف اوّل میں کافی بڑی تعداد میں مغربی سیاح ہندوستان آئے اور اس ملک میں جو کچھ ان کے علم و عمل میں آیا قلم بند کردیا۔ لیکن بدقسمتی سے ان کے بیانات پر اس بات کا اثر ہے کہ وہ اپنے قارئین کی قیاس آرائی کو آسودہ کرنے کی فکر میں رہتے۔ علاوہ بریں ان میں سے اکثر سیاحوں کو اپنی قومی برتری کا وہم تھا اس لیے وہ اس قابل نہ تھے کہ جن اداروں کا ذکر کرتے ان کا مناسب جائزہ لے سکتے۔ ہندوستانیوں کے لیے وحشی، کا عام لقب ان کی زبان زد تھا۔ یہی ایک بات ان کی زبان زدتھی۔ یہی ایک بات ان کی تنگ خیالی کی واضح دلیل ہے۔ ان سیاحوں میں بعض بہم تعلیم یافتہ اور نااہل تھے۔ وہ نہ صحیح زاویہ نظر سے کام لے سکتے تھے نہ اپنے بیانات صحیح طور سے قلمبند کرسکتے تھے، نہ انحصار سے کام لے سکتے تھے۔ ان میں بہت سے ایسے تھے جن کو متعدد سیاسی اطلاعات کی آگاہی نہ تھی اس لیے انھوں نے افواہ اور بازاری خبروں کا قلم بند کرنا کافی سمجھا۔ ان میں سے جو سیاح اچھے خاصے تعلیم یافتہ اور بلند خاندانوں سے وابستہ تھے ان میں ایک دوسرے قسم کا سخت عیب نظر آتا ہے۔ یہ لوگ مغل حکومت اور ہندوستانی اداروں کو ان مثالی نظام سلطنت کی کسوٹی پر پرکھتے جو ان کے ذہن میں پہلے سے تھی اور جب نتیجہ ان کی امیدوں سے کم نظر آتا تو معائب کو زیادہ اہمیت دیتے اور محاسن کو نظرانداز کردیتے۔ ان باتوں نے میرے ذہن کو مشکوک کردیا ہے میرا خیال ہے کہ ان سیاحوں کا بیان صداقت سے دور ہے۔ اس لیے عہد متوسط کے سیاسی یا سماجی اداروں پر ان کی تنقید میرے لیے قابل قبول نہیں۔ علاوہ بریں دور متوسط کے اداروں کا موجودہ اداروں سے مقابلہ کرنا اور یہ نتیجہ نکالنا کہ آخرالذکر

3/21/2018 P49.jpg (1758×2358)

ادارے اوّل الذکر سے برتر ہیں حالانکہ یہ رویہ عہد حاضر کے اُن بہت سے اہل قلم کا ہے جو مغربی سیاحوں کے اشاروں کنایوں پر ایمان رکھتے ہیں۔ لیکن یہ نہ صرف غلط ہے بلکہ اصول ارتقا کے اعتقاد میں ضعف کا بھی ثبوت ہے۔

قبل اس کے کہ فرداً فرداً سیاحوں کے ان کارناموں پر تنقیدی نظر ڈالی جائے جن کا میں نے مطالعہ کیا ہے، ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ایسی شائع شدہ دستاویزات کا ذکر کردیا جائے جو اطلاعات کا مخزن ہیں۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی دستاویزات کو مرتب کرکے ولیم فاسٹر نے ہندوستان کی تاریخ نویسی کی بڑی خدمت کی ہے۔ دو سلسلے مطبوعات ایسٹ انڈیا کمپنی کی دستاویزات (1602-17) اور 'ہندوستان میں انگریزی کارخانے' (1618-56) علاوہ ہندوستان میں انگریزی تجارت کی نشو ونما پر روشنی ڈالنے کے اکثر اپنے زمانے کے سیاسی واقعات کی بھی کارآمد اطلاعات پیش کرتے ہیں۔ اس ضمن میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ سورت کے کارخانے کے نگراں نے جو روزمرہ کے خطوط انگلستان بھیجے بڑے دلچسپ ہیں۔ لیکن ان کے مندرجات کو احتیاط سے قبول کرنا پڑتا ہے کیونکہ بعض اوقات گپ اور افواہ کو بھی ان میں جگہ دی گئی ہے۔ گو اس کے پس پشت شرانگیز ارادہ نہیں معلوم ہوتا۔

سر ٹامس رو

دربار جہانگیر میں ابتدائی سیاحوں کی فہرست میں سر ٹامس رو کا نام بہت نمایاں ہے۔ اپنی ڈائری میں وہ شہزادے خرم کا ذکر کرتا ہے۔ اس کے کردار، شکل وشباہت کی مرقع کشی کرتا ہے۔ چونکہ گجرات شہزادہ خرم کی جاگیر تھا اس لیے قدرتی طور پر سر ٹامس رو کو اس سے رابطہ قائم کرنے کا بہت موقع ملا لیکن یہ انگریزی سفیر ہر موقع ومحل پر اپنی من مانی بات پوری نہ کرسکتا، اس لیے کہ وہ ترش رو بھی ہوجاتا اور مغل حکومت کی نامناسب تصویر پیش کرتا ہے۔ بایں

> بنارسی پرسادسکسینہ کی تصنیف کردہ کتاب 'تاریخ شاہ جہاں' سے لیا گیا یہ اقتباس ان مغربی سیاحوں سے تعلق رکھتا ہے جو جہانگیر، شاہجہاں اور اورنگ زیب کے عہد میں ہندوستان آئے تھے۔ ان سیاحوں نے جو بیان اپنی تصانیف میں اس دور کے تعلق سے درج کئے اس پر بھی مصنف نے ناقدانہ نظر ڈالی ہے اور بتایا ہے کہ سبھی سیاحوں کے بیان معتبر یا قابل یقین نہیں ہیں۔ اردو میں یہ کتاب قومی اردو کونسل نے شائع کی ہے۔ ادارہ

ہمہ مغل دربار کی جتھابندی کا بیان بہت دلچسپ ہے۔

پلسارٹ

فرانکوس پلسارٹ دسمبر 1620 میں ہندوستان بحیثیت گماشتہ ڈچ فیکٹری آیا۔ دوران قیام وہ زیادہ تر آگرہ میں رہا۔ یہاں سے وہ 1827 کے اواخر میں ہالینڈ واپس آگیا۔ اس کی کتاب 'ری مانسٹران ٹی' اس کے سات سالہ تجربات کا دفتر ہے۔ اس نے آگرہ، لاہور، کشمیر، برہان پور کا ذکر کیا ہے شاید ان شہروں میں خود گیا تھا۔ وہ خسرو کے قتل کا ذمے دار شہزادہ خرم کو ٹھہراتا ہے۔ نورجہاں کی بالادستی کی سخت مذمت کرتا ہے۔ ضلع کی عدالتوں اور گاؤکشی بند کرنے کے بیانات بھی دلچسپ ہیں۔ سرکاری طور پر اس گاؤکشی کی بندش کو وہ گورنمنٹ کے اس احترام سے منسوب کرتا ہے جو ہندوؤں کے جذبات سے وابستہ تھا اور اس میں یہ اقتصادی پہلو بھی تھا کہ بیلوں سے یہاں وہ ہر کام لیا جاتا ہے جو ہالینڈ میں گھوڑوں سے لیا جاتا ہے۔

ڈی لایٹ

سچ پوچھیے تو ڈی لایٹ یوروپ سے آنے والے سیاحوں کی فہرست میں شامل نہیں کیا جاسکتا کیونکہ وہ ہندوستان کبھی نہیں آیا اس کا کام صرف کاغذات کا مرتب کردینا تھا۔ اس کے اس کام کا ترجمہ Hoyland اور Banesji نے کیا ہے۔ اس کے آخر میں شہزادہ شاہجہاں کی بغاوت، جہانگیر کی موت اور شاہجہاں کی تخت نشینی کا بیان الجھا ہوا ہے۔

پیسٹر و ڈی لاویل

اٹلی کا ایک اچھا تعلیم یافتہ باشندہ تھا۔ یہ 10 فروری 1623 میں شہر سورت آیا۔ اپنے چار سالہ قیام میں اس نے دکن کے خاص خاص شہروں کی سیر کی۔ اس نے دیانت داری سے وہ واقعات رقم کیے جو اس کے دیکھنے میں آئے۔ اس نے صدق دل سے ایمان دار رہنے کی کوشش کی۔ اس کا تاریخی بیان بڑی حد تک صحیح ہے۔ البتہ بابر کی مہمات کا بیان خالی ہے۔ بابر کا نام اس نے نہیں لیا۔ یہی حال خرم کی بغاوت کے اسباب کا ہے۔ اس بیان میں بھی اس نے قیاس آرائی سے کام لیا ہے۔ علاوہ بریں اس کا یہ بیان بھی غلط ہے کہ قطب شاہ نے باغی شہزادے کی مدد اس لیے نہیں کی کہ اس پر جہانگیر کا خوف طاری تھا۔ خرم سے آصف خان کی جانب داری کا بیان بہت دلچسپ ہے۔ پلسارٹ کی طرح وہ بھی خسرو کے قتل کا ذمے دار خرم کو قرار دیتا ہے۔ مغل حکومت میں آزادی خیال کا بھی ذکر اس نے کیا ہے اور ہندوؤں کے جذبات کے احترام میں کامبے کی گاؤکشی بند کرنے کا بھی بیان ہے۔ اگرچہ اس نے اپنے دور کے انتظامات کا ذکر زیادہ نہیں کیا لیکن ان شہروں اور



عالمی شہرت یافتہ مصور مرزا محمد علی بیگکی ایک منی ایچر پینٹنگ، جس مغل بادشاہ، شاہ جہاں کو دربار کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے

http://urducouncil.nic.in/Urdu-Duniya/Urdu-Duniya-June-2012/P49.jpg 1/1

3/21/2018 P50.jpg (1758×2358)

قصبات کے چشم دید بیانات بہت واضح ہیں۔

سر ٹامس ہربرٹ

مغلیہ سلطنت کی تاریخ نویسی کا حق سر ٹامس ہربرٹ کو صرف اس لیے دیا جاسکتا ہے کہ ایک قلیل وقفے کے لیے سرزمین ہند پر وہ قیام پذیر تھا۔ وہ اپنی تاریخی تحریر کی ابتدا عہد تیمور سے کرتا ہے۔ تیمور کا تعارف کراتے ہوئے لکھتا ہے کہ وہ سلطان بایزید کے قید خانے کا داروغہ تھا۔ بیانات کا سلسلہ شاہجہاں کی تخت نشینی تک چلتا ہے۔ اکبر وجہانگیر کی حکومت کا بیان کتاب کے بہت بڑے حصہ پر پھیلا ہوا ہے۔ محسوس ہوتا ہے کہ کوئی بھی اہم واقعہ نظر انداز نہیں ہوا لیکن مصنف نہ تو تاریخی سلسلے کا خیال کرتا ہے نہ واقعات کی علت ومعلول کا۔ ساتھ ہی ساتھ بعض اوقات وہ زبردست جغرافیائی غلطی کا مرتکب نظر آتا ہے۔ ایسے حالات میں غلطیوں کو چھپانے کے لیے وہ اپنے طرزِ بیان کی دلکشی کا پردہ ڈالنے کی کوشش کرتا ہے وہ بھی خسرو کے قتل کا مجرم شہزادہ خرم کو قرار دیتا ہے اور باپ سے بغاوت کرنے کے سلسلے میں شاہجہاں پر غلط الزامات کا اضافہ کرتا ہے۔ اس نے بہت صحیح عبداللہ خان فیروز جنگ کو ہندوستان کا باد پیما کہا ہے لیکن بنگال میں شاہجہاں کی کارگزاری کا بیان بہت الجھا ہوا ہے۔

مینڈلسلو

جان البرٹ وان مینڈلسلو ایک نوجوان جرمن تھا جو اپنے دوستوں سے الگ ہوکر اپریل 1638 میں سورت آیا۔ اس کے دوست ڈیوک آف ہوسٹین سفیر برائے ایران تھے۔ سال کے اواخر میں اس نے شمالی ملک کا دورہ شروع کیا۔ احمد، کمبے، آگرہ اور لاہور کی سیر کی۔ اس نے جنوری 1639 میں سورت کو خیرباد کہا۔ اپنے سفر کی ابتدا سے بارہ مہینے کے اندر ڈوور واپس گیا۔ اُلیریس نے مینڈلسلو کے سارے اندراجات 1658 میں شائع کیے۔ چار سال بعد اس کا فرانسیسی ترجمہ ابراہیم ڈی وکفورٹ نے شائع کیا۔ ولیم فارسٹر کی رائے میں آخرالذکر نے اصل مسودے میں کافی رد وبدل کیا۔ اسی مسخ شدہ نسخے کا ترجمہ جان ڈے وس نے انگریزی میں کیا۔ اس سے بہتر اور زیادہ صحیح نسخے کی عدم موجودگی میں مجبوراً اسی انگریزی ترجمے کو غنیمت سمجھ کر میں نے مطالعہ کیا۔

مینڈلسلو نے مغلیہ نظم ونسق کا تفصیلی بیان سپرد قلم کیا ہے اس کے بعض بیانات قیاس آرائی کے نتیجے ہیں اور بعض میں حقیقت کی جھلک ہے۔ اس نے شہر آگرہ اور قلعے کا ذکر کیا ہے۔ جشن نوروز اور تولے جانے کی رسم کے بھی حوالے دیے ہیں۔ تعزیہ کی ابتدا اس نے غلط بیان کی ہے (امام حسن اور امام حسین کی قبروں کی نقلی صورت، امام حسین کی شہادت کربلا کی لڑائی میں ہوئی) اس سلسلے میں وہ کہتا ہے کہ جلوس نکلنے پر کسی ہندو کو گلی کوچے میں آنے جانے کی اجازت نہ ہوتی۔ اس کے آگے لکھتا ہے کہ شاہجہاں نے بلاقی سے تخت چھین لیا تھا۔ بلاقی کو مینڈلسلو نے قزوین میں دیکھا تھا۔ اس نے یہ بھی اپنے بیان میں کہا کہ شاہجہاں کو برہنہ رقص بہت پسند تھا۔

پیٹر منڈی

پیٹر منڈی 1628 میں سورت پہنچا اور 1630 میں آگرہ فیکٹری میں ملازم ہوا۔ ہندوستان کے ہشت سالہ قیام میں اس نے مالوہ، موجودہ اترپردیش اور بہار کے متعدد شہر دیکھے۔ اس کے بیان میں ایسے حوالے ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس نے صحیح نظریے سے ہندوستان کے بعض ایسے خاص سماجی اور ایسے عجیب وغریب ہندو

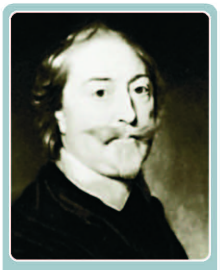

دربار جہانگیر میں ابتدائی سیاحوں کی فہرست میں سر ٹامس رو کا نام بہت نمایاں ہے

سماجی ومذہبی مراسم دیکھنے کی کوشش کی جو دوسرے سیاحوں کی توجہ اپنی طرف مبذول نہیں کرسکے۔

من جملہ عام دلچسپ موضوعات کے جو اس کے بیان میں آئے ہیں ان میں حسب ذیل کا تذکرہ کرنا ضرور رہے۔ گوالیار محل، فاصلہ کی پیمائش کا طریقہ ہندوستانی حجاموں کی مالش میں ہنرمندی، پان، بہنگی، بھاری چیزیں اٹھا کر لے جانے کے واسطے لمبا بانس اور اسی سے ملتی جلتی دوسری باتیں۔ آگرہ، اس کے بازار اور مکانات کا بیان واضح اور دلچسپ ہے۔

اس نے بادشاہ اور دربار کے بارے میں بہت کچھ لکھا ہے۔ ہاتھیوں کی لڑائی چیتا کا شکار، جنگلی ہاتھیوں کا پکڑنا، بقرعید میں بادشاہ کا جلوس، دارا اور شجاع کی شادیاں، نوروز اور مینابازار سب کا بیان اس کے یہاں ملتا ہے۔ وہ فتح پور سیکری کا تقابل مغربی شہروں سے عمارت کی مناسبت کے لحاظ سے کرتا ہے۔ یہ بھی بتاتا ہے کہ مغلیہ بادشاہ بجز دریائے گنگا کے پانی کے اور کہیں کا پانی نہ پیتے تھے۔ وہ یہ بھی دیکھتا ہے کہ شاہی دربار میں برہمن اور مسلمان جوتشی جمع ہیں کیونکہ بادشاہ کی توہم پرستی شگون نیک وبد سے ہمکنار تھی۔

عصری سیاسی واقعات میں بلخ میں فریبی باتسنغر کا قصہ شاہجہاں کے حکم سے بنارس کے مندروں کا گرانا، آصف خان اور مہابت خان کا معزز مرتبہ عبداللہ خان فیروز جنگ کی ہوس ناکی اور ظلم پرستی، شاہجہاں کی دکنی مہمات، مہابت خان کا تقرر، دولت آباد فتح کرنے کے لیے ان سب کا بیان مصنف کے یہاں ملتا ہے۔ مصنف کچھ ایسے واقعات بھی بیان کرتا ہے جو شاہجہاں کی تخت نشینی سے پہلے ہوئے تھے مثلاً خسرو کا قتل، نورجہاں کا اپنے داماد کے لیے تخت وتاج حاصل کرنے کی کوشش اور اس کے محرکات میں آصف خان کی خلل اندازی لیکن سلیم شاہ اور شیر شاہ کی حکومت کے بیانات مایوس کن ہیں۔ اس کا یہ بیان بھی مہمل ہے کہ نورجہاں شاہ جہاں کی ماں تھی۔ اس طرح اس کا یہ دعویٰ بھی غلط ہے کہ جہانگیر نے اپنا جانشین بلاقی کو بنایا تھا۔ یہ قیاس آرائی بازاری خبروں کا نتیجہ ہے۔ مغل طرز حکومت پر اس کا بیان غلط مبحث کا نمونہ ہے لیکن 1630 کے قحط کی تصویر کشی اور لوگوں کی پریشانی کا ذکر بہت پر اثر ہے۔

مان ریکو

اپرٹو کا ایک پرتگالی باشندہ مان ریکو 1629 میں بنگال مشن سے وابستہ ہوا۔ بعد میں چھ سال وہ ارکان میں رہا۔ اس نے تین سال (1637-40) فلپائن وچین کی طولانی سیاحت میں صرف کیے۔ (1640-41) میں یوروپ جاتے ہوئے شمالی ہندوستان پہنچ کر اس نے ڈھاکہ سے قندھار کا سفر کیا۔ 1643 میں وہ روم پہنچا اور اپنی تصنیف آئی ٹے نی رے ریو (Itenerario) 1649 میں شائع کی۔ 1669 میں وہ قتل ہوا۔

اس کی تصنیف کا بڑا حصہ ارکان سے متعلق ہے۔ صحت کے ساتھ عصری معاشی زندگی کی تصویر کشی نے اس کے بیان کو بے حد قیمتی بنا دیا ہے، باوجود ایک مشنری اور رومن کیتھولک ہونے کے وہ بے لوث ہوکر مشرقی تہذیب کے اچھے عناصر کی تعریف کرتا ہے۔ دوسرے متعدد عصری

http://urducouncil.nic.in/Urdu-Duniya/Urdu-Duniya-June-2012/P50.jpg 1/1

سیاحوں کی طرح وہ مشرقی تعصب کا ثبوت نہیں دیتا۔ یہ صحیح ہے کہ وہ ہماری معلومات میں زیادہ اضافہ نہیں کرتا لیکن اس کے ذاتی تجربات جو اس کی پوری کتاب میں رواں دواں ہیں کتاب کی اہمیت بڑھا دیتے ہیں۔

شمالی ہند میں لوگوں کی خوش حالی، زمین کی زرخیزی، سامان خورد و نوش کی ارزانی، اس کے لیے باعث حیرت ہے۔ وہ ہندوستانیوں کے شطرنج کھیلنے کی دانائی اور آم کی تعریف میں رطب اللسان ہے۔ مغل فوج کی تنظیم و ترتیب کی بڑی داد دیتا ہے۔ ارکان کی عوامی تعلیم جو عبادت گاہوں اور خانقاہوں تک مرکوز تھی بڑے دلچسپ انداز میں پیش کی گئی ہے۔ مغلوں کی عیش پرستی کا بیان بالکل صحیح ہے۔ جس شہر میں اس نے قدم رکھے اس کا بیان تفصیل سے لکھا۔ مصنف کے معلیہ شہنشاہ کے سیم و زر میں تولے جانے کی رسم، مغل دربار اور تاج محل کی بنتی ہوئی عمارت کے حوالے بھی دیے ہیں۔ تاج محل کی نقشہ سازی اس نے جرمینو وریدخو سے منسوب کی ہے۔

عصری سیاسی واقعات کا ذکر مان رکھ نے بہت کم کیا ہے۔ قندھار کی سپردگی اور ناظم فرح کی قندھار واپس لینے کی افواہی کوشش کا بھی بیان ہے۔ اس نے آصف خان کے بے پناہ اثر کا بھی ذکر کیا ہے، اس کو Secundur De Rege کہتا ہے۔ مرزا رستم صفوی کی لڑکی سے شجاع کی شادی کا بھی تذکرہ اس نے کیا ہے۔

مان رکھ جب ان تاریخی واقعات کا بیان کرتا ہے جس سے اس کو ذاتی واقفیت نہیں تو اوروں کی طرح وہ بھی حقیقت و افسانے کا تخلوط نمونہ پیش کرتا ہے۔ ان باتوں کا مثالی نمونہ شاہجہاں کی بغاوت کا بیان ہے اس کے یہاں بنگلی کی تحقیر کا ذکر صرف اتنا ہی ملتا ہے جو اس نے فادر ڈی کرسٹو کے قصے میں بیان کیا ہے۔ یہ شخص 9 سال تک آگرہ کے قید خانہ میں تھا، لیکن مان رکھ جب ارکان کا بیان کرتا ہے تو کچھ ہلکی روشنی ان پرتگالی محرکات پر پڑتی ہے جو مغل بادشاہ کے حملہ کرنے کا سبب بن گئیں۔ مغل سرکار کا بیان اس نے ڈی لیٹ کے بیان سے نقل کیا ہے۔

رچرڈ بل او رجان کمپ بل

رچرڈ بل اور جان کمپ بل کے سترہ مون کو دوبارہ سر رچرڈ ٹمپل نے برٹش میوزیم کے سلوان مجموعہ نمبر 811، ہندوستانی آثار قدیمہ (8-1906) میں شائع کیا۔ مدیر کا کہنا ہے کہ Bell کو زبانی بول کر لکھایا گیا تھا۔ جان بل کے لکھے ہوئے واقعات کو زبانی کہے جانے والی داستان کی صورت میں لانے کے لیے حیرت انگیز طریقے پر توڑ مروڑ کر بیان کیا گیا ہے۔ جن واقعات کو جان کمپ بل نے چشم دید بتایا ہے وہ بھی تاریخی اعتبار سے مشکک ہو گئے ہیں۔ مثلاً مراد کو شاہجہاں کا سب سے بڑا لڑکا بتایا گیا ہے اور اورنگ زیب کو سب سے چھوٹا۔ جنگ وراثت کا سارا بیان مخلوط و ناقابل فہم ہے۔ کچھ ایسے دھوے بھی ہیں جو صریحاً غلط ہیں۔ مثلاً مراد کو اورنگ زیب کے حکم سے مچل کر مارڈالا گیا اور شاہجہاں معزولی کے وقت 130 سال کا تھا، حالانکہ کمپ بل جب دارا کا ہاتھی سے جنگ میں اتر آنے کا قصہ دہراتا ہے تو کہتا ہے کہ وہ کسی معزز شخص کے کہنے سے ہاتھی سے اتر پڑا تھا اور یہی حادثہ اس کی موت کا باعث ہوا۔ اسی طرح وہ اس واقعہ کا ذکر کرتا ہے جب اورنگ زیب کے سفیر سے شاہ ایران نے یہ نظر حقارت پوچھا تھا کہ اورنگ زیب اپنے آپ کو عالم گیر کیوں کہتا ہے۔ نہ اس نے ترکوں کو فتح کیا نہ عیسائیوں کو، اس نے صرف اپنے باپ کو قید کیا

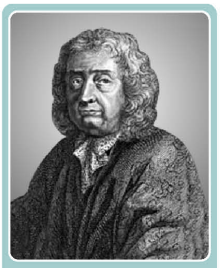

ٹیورنیر پہلی بار 1640 میں ہندوستان آیا اور بعد کے متعدد سفروں میں اس ملک کا کافی بڑا حصہ دیکھ لیا

اور خاندان کو برباد کیا۔ قندھار کا بیان دلچسپ ہے۔

برنیر

مغربی سیاحوں میں جنھوں نے مشرق کے متعلق کچھ لکھا ہے اس میں برنیر کا بیان سب سے زیادہ ہر دلعزیز ہے۔ وہ بہت پڑھا لکھا آدمی تھا۔ اس کی قوت مشاہدہ بہت تیز تھی۔ ہندوستان آنے سے پہلے وہ فلسطین، شام اور مصر بھی گیا تھا۔ یہاں آنے کے لیے قاہرہ سے بحری سفر کرتا ہوا 1658 کے اواخر میں روانہ ہوا۔ ابھی وہ آگرہ نہ پہنچا تھا کہ احمد آباد کے قریب دارا سے ملاقات ہو گئی۔ دارا کو دیورائے (متصل اجمیر) میں شکست ہوئی تھی۔ پسپا ہو کر وہ گجرات چلا گیا تھا۔ ہندوستان میں اپنے قیام کی مدت برنیر نے 12 سال بتائی ہے۔ اس زمانے میں اس نے لاہور، کشمیر، راج محل، قاسم بازار، مسولی پٹم اور گول کنڈہ کی سیر کی۔ یہیں اس نے شاہجہاں کے انتقال کی خبر سنی۔ ایران سفر کرتا ہوا 1669 میں وہ مارسیلز پہنچا۔ اس کے ایک سال بعد اس نے اپنی کتاب شائع کی اور 1688 میں مر گیا۔

دہلی میں دانشمند خان نے اس کی سرپرستی کی۔ دانش مند خان دربار کا سربرآوردہ منصب دار تھا۔ برنیر نے بھی بھی اپنی معلومات کے ذرائع کی نشاندہی کی ہے۔ مثلاً دھرمات کی لڑائی کا حال اورنگ زیب کے ایک ایسے فرانسیسی توپچی سے اس نے سنا، جو اس کی ملازمت میں تھا۔ شجاع کی قسمت کے آخری فیصلے کا حال اس نے پرتگالیوں، مسلمانوں، اور ڈچ کے باشندوں سے سنا جو بنگال میں موجود تھے، مغل حرم سرا کا تذکرہ خواجہ سراؤں کے بیانات پر مبنی ہے۔ اس نے اُن مغربی تجار سے بھی مشورے کیے جو عرصہ دراز سے یہاں تھے۔ ان کے علاوہ سفیروں، مشیر کاروں اور ترجمانوں سے بھی اس نے حالات معلوم کیے۔

اس کے بیان سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ اس نے مغل دربار، اس کی روداد، و زندگی کے متعلق معلومات حاصل کرنے کے لیے بہت سے ذرائع استعمال کیے مگر پھر بھی اس کی بیان کردہ معلومات سب کی سب ذاتی نہ تھیں۔ علاوہ بریں چونکہ وہ نہایت مہذب آدمی تھا۔ اس کے لیے بعض اوقات یہ ممکن نہ ہوا کہ مثالیت اور حقیقت کو علاحدہ علاحدہ رکھ سکتا۔ مغلیہ گورنوں کے مظالم اور شخصی سلطنت کے معائب کا دلچسپی سے بیان کرنا اس قسم کی مثالیں ہیں۔ فطرتاً وہ ایسے نتیجے بھی نکالتا ہے جن کی تائید اس کے دوسرے ہمعصروں کے بیان سے نہیں ہوتی۔ اس کو فرانسیسی اداروں کی برتری کا وہم بھی تھا۔

ہاں یہ جنگ وراثت کا بیان نہایت واضح ہے۔ حالانکہ اس کی جہاں آرا کی کردار نگاری بعید از قیاس ہے۔ اس نے دہلی میں دارا کی تشہیر بہ چشم خود دیکھی تھی۔ سلیمان شکوہ کا دربار میں پہنچنا بھی اس نے بیان کیا ہے۔ اس نے یہ بھی دیکھا کہ اورنگ زیب نے اپنے قیدی باپ کو قلعے کے اندر پوری آزادی دے رکھی تھی، اگرچہ یہ بیان متوہی کے نزدیک صحیح نہیں ہے۔ دور شاہجہاں کے سیاسی واقعات کے سلسلے میں بنگلی اور تبت کو چک کی فتح، مندروں کے گرائے جانے کا بھی ذکر کرتا ہے۔ مغلیہ سلطنت کی فوجی تنظیم کی خامیوں پر اس کی رائے صحیح ہے لیکن فوج کی

تعداد کا بیان قابل اعتماد نہیں۔ دہلی، آگرہ، کشمیر کا بیان دلچسپ ہے۔ تاج محل کو اس نے خراج عقیدت پیش کیا ہے، تاج محل اس تعریف کا مستحق بھی ہے۔

ٹیورنیر

ٹیورنیر کو جہاں گردلوگوں کا شہزادہ کہہ سکتے ہیں 21 سال کی عمر تک پہنچتے پہنچتے اس نے فرانس، انگلستان، ہالینڈ، جرمنی، سوئٹزرلینڈ، پولینڈ، ہنگری اور اطالیہ کے بہترین حصے دیکھ لیے تھے۔ یورپ کی زبانوں کا اسے اچھا خاصا علم تھا۔ مشرق کے 6 سفروں نے اسے تاریخ میں مشہور کردیا، پہلی بار 1640 میں ہندوستان آیا اور بعد کے متعدد سفروں میں اس ملک کا کافی بڑا حصہ دیکھ لیا۔ برنیر سے اس کی دوستی ہوگئی تھی۔ اسی کے ساتھ اس نے بنگال کا سفر بھی کیا۔ اپنے سفرنامے کے لیے وہ اس رفیق کار اور ہم وطن کا ممنون ہے۔

ٹیورنیر کا روزنامچہ اس وقت کی تجارتی تاریخ کے لیے اہم ہے۔ سڑکوں اور شاہراہوں کا بیان بھی معاشرتی زندگی کے اتفاقیہ بیانات کی طرح بڑا دلچسپ ہے۔ سیاسی تاریخ کا باب، افسانہ و حقیقت کا مجموعہ ہے۔ چنانچہ اس کا کہنا ہے کہ شاہجہاں نے عیاری سے تخت حاصل کیا، جن امرا اور شہزادوں سے وہ بدگمان تھا ان لوگوں کو گوالیار میں قید رکھا لیکن ان کو اپنی جائداد سے روپیہ حاصل کرنے کی اجازت تھی، دولت آباد کی تسخیر خیالی ہے۔ جنگ وراثت کا بیان شاید برنیر کی نقالی ہے لیکن میر جملہ کے معمولات اور قطب شاہ کی لڑکی سے سلطان محمد کی شادی کا بیان اس نے کافی صحت کے ساتھ لکھا ہے۔ شاہجہاں کی بغاوت کا بیان قطعاً غیر معتبر ہے، اس کی وجہ غالباً اس کی لاعلمی ہے لیکن شہنشاہ کے بیش قیمت جواہرات کا بیان بالکل قابل اعتماد ہے۔ اس کا بیان ہے کہ یہ ذخیرہ اس کو اورنگ زیب نے دکھایا۔ شائستہ خان اور میر جملہ سے بھی اس کے تعلقات تھے۔ اس کا خیال ہے کہ شاہجہاں جواہرات کا بڑا نقاد تھا۔ اس کا یہ قول کہ جہاں بنیے سودا کرنے پر تیار نہیں ہوتے وہاں اہل مغرب کو نفع کی کیا امید ہوسکتی ہے، ہندوستانی تجار کی ہوشیاری کا اعتراف ہے۔

منوچی

17 ویں صدی کے نصف اوّل کے مغربی سیاحوں میں سب سے زیادہ لکھنے والوں میں منوچی ہے۔ ابھی وہ 14 سال کا لڑکا تھا کہ وینس کو اس نے خیرباد کہہ کر بقیہ زندگی اور خاص کر ہندوستان میں گزاری۔ اس کو فارسی و ترکی زبانوں سے بھی کام چلانے بھر کی واقفیت تھی جس کی وجہ سے دارا کی ملازمت حاصل ہوئی، دارا کی خدمت اس نے خلوص اور وفاداری سے کی۔ ساموگڑھ کی لڑائی میں وہ شریک تھا۔ وہاں سے بچ بچا کر اپنے سرپرست کے شریک غم ہونے کے لیے لاہور پہنچا، ملتان اور بھکر بھی اس کے ہمراہ گیا۔ یہاں خواجہ سرا بسنت کے ساتھ وہ قلعہ کا محافظ مقرر ہوا۔ بھکر فتح ہوجانے پر وہ لاہور چلا گیا اور وہاں سے دہلی واپس آیا۔ اعتبار خان نے زور دیا کہ وہ اورنگ زیب کی ملازمت میں آجائے لیکن اس نے انکار کردیا اورنگ زیب کے کشمیر جانے کے بعد اس نے بنگال کا طولانی سفر اختیار کیا۔ وہاں سے واپس آکر راجہ جے سنگھ کی ملازمت میں آگیا۔ اسی کے ساتھ دکن گیا۔ 1666 میں وہاں بھی استعفیٰ دے دیا اور ایک خطرپسند زندگی بسر کرنے کے بعد لاہور میں سکونت اختیار کرلی۔ وہ 7-8 سال طبیب کی حیثیت سے کام کرتا رہا۔ 1678



داراشکوہ کے ملازموں میں اطالوی سیاح منوچی بھی شامل تھا جو 17 سال کی عمر میں ہی سیاح بن گیا

میں شاہ عالم کی ملازمت میں داخل ہوا جس کے ساتھ وہ اورنگ زیب کی راجپوتانہ اور دکن کی لڑائی میں رہا تھا۔ اس کا انتقال 1717 میں ہوا۔ جو کتاب اس نے فرانکوس مارٹن اور بیورو یوس لینڈ کی فرمائش پر لکھی تھی اس کے متن میں اس نے اپنے استاد و مخزن کا پتہ برابر دیا ہے۔ حسب مذکورہ بالا وہ راجہ جے سنگھ کی ملازمت میں تھا۔ راجہ کے لڑکے کیرت سنگھ سے اس کے دوستانہ تعلقات تھے۔ امانت خان، مرزا لہراسپ، ولد نہایت خان اور فدائی خان کو وہ اپنے بے تکلف دوستوں میں شمار کرتا ہے۔ منطقی طور پر یہ سوچا جاسکتا ہے کہ چونکہ وہ دارا اور بیگم صاحبہ کا منظور نظر تھا اس لیے اور بہت سے افسروں سے بھی اس کی ملاقات رہی ہوگی۔

اس نے دھرمات کی جنگ کی خبر ایسے بلند پایہ اشخاص سے پائی جو خود جنگ میں شریک تھے۔ اورنگ زیب کے مغربی توپچیوں سے بھی اس لڑائی کی خبر ملی۔ ساموگڑھ کی لڑائی میں وہ خود بھی شریک تھا۔ سلیمان شکوہ کی تگ و دو کا حال جے سنگھ نے اسے بتایا۔ کھجوا کی لڑائی کی تفصیلات راج محل کے ناظم مرزا جانی اور جگلی کے ناظم محمد مغل سے معلوم ہوئیں۔ دیورائے کی لڑائی کے حالات میر تقی کے ایک مصاحب نے بیان کیے۔ اس طرح بحیثیت مجموعی جنگ وراثت کے متعلق اس کے بیانات صحیح ہیں لیکن شاہجہاں کی حکومت سے پہلے کے حوالہ جات مہملات کا مجموعہ ہیں۔

ولیم اروِن نے صحیح کہا ہے کہ بجز برنیر کے جزوی نقالی کے منوچی نے کسی دوسرے کی نقل نہیں کی۔ اس میں شک نہیں کہ منوچی، برنیر سے زیادہ باخبر و تجربہ کار آدمی تھا۔ آخرالذکر کی وہ پرزور تردید کرتا ہے اور اسے بڑی حقارت سے دیکھتا ہے۔ دوسرے لوگ جو اس کی حقارت کے مرکز بنے، ان میں پرتگالی، یسوعی اور اورنگ زیب تھے اور بہت سے لوگوں کی طرح وہ بھی ہندوستانی کردار کو بڑی نیچی سطح پر پاتا ہے۔ اس ضمن میں ہندو، مسلمان دونوں شامل ہیں۔ منوچی کا رآمد تو ہے لیکن بہت زیادہ قابل اعتماد نہیں۔

تجزیہ

مذکورہ بالا اسناد کے مطالعے سے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ شاہجہاں کا عہد حکومت صحیفۂ دور متوسط کا سب سے زیادہ شاندار باب تھا۔ اس عہد میں امن، چین، خوش حالی تھی، ہر طرف علم و ہنر کی ترقی نظر آتی تھی۔ اسی عہد میں بہترین، شاندار عمارتیں ظہور میں آئیں۔ بڑے بڑے پرحوصلہ جنگی معرکے ہوئے لیکن اسی جاہ و جلال، شان و شوکت کی تہہ میں زوال کے ایسے آثار بھی جھلک رہے ہیں اور ایسے خطرناک رجحانات کے سامان بھی نظر آتے ہیں جو بڑھتے بڑھتے آگے چل کر اورنگ زیب کی وفات کے بعد ایک دھماکہ بن کر حکومت کے خاتمے کا پیام بن گئے۔ از روئے انصاف یہ سب تباہ کن عناصر شاہجہاں کی حکومت سے وابستہ ہیں۔

■

مستند: تاریخ شاہجہاں، مصنف: ڈاکٹر بنارسی پرشاد سکسینہ، مترجم: ڈاکٹر سید اعجاز حسین، سنہ اشاعت: 2000، ناشر: قومی کونسل برائے بروغ اردو زبان، نئی دہلی



گنگا جمنی تہذیب کا سنگم
الہ آباد

■ نگار ہاشمی

الہ آباد ایک قدیم تاریخی اور ثقافتی شہر ہے۔ گنگا جمنا اور سرسوتی کی متبرک آبھاری نے اس شہر کو مذہبی روح دی ہے۔ مہابھارت اور رامائن میں اس شہر کی تعریف اور خوبیاں بیان کی گئی ہیں۔ ماضی میں بادشاہوں، فوجی اور سیاسی کا تذکرہ ملتا ہے تو پریاگ، ماگھ کے میلہ میں لگنے والے لاکھوں میلے میں یہاں آتا تھا اور اپنا سب پاپ ڈبکی میں دے جاتا تھا۔

الہ آباد شہر کی تاریخی اہمیت دیو اور پرانوں سے شروع ہو کر اکبر کے سولہویں صدی تک کی کتابوں میں محفوظ ہے۔ قدیم روایات کے مطابق یہ ہندو مذہب کا مرکز تھا۔ بارہویں اور تیرہویں صدی عیسوی میں مسلمان فاتحین یہاں آکر آباد ہونے لگے۔ شہر سے جانب مغرب تقریباً 70 کلو میٹر کے فاصلہ پر ایک مقام ہے جو 1296ء سے 1316ء کے درمیان علاؤالدین خلجی کے بھتیجے اور داماد جلال الدین فیروز خلجی کی حکومت کا دارالسلطنت تھا۔ کڑا مانک پور آج بھی ایک مقدس خانقاہوں اور درگاہوں کا مرکز ہے۔ اس شہر میں مغلیہ طرز کی مسجدیں، سرائیں، باغات اور بہت سی عمارتیں ہیں جو اکبر کے دور کی یاد تازہ کرتی ہیں۔ شہنشاہ اکبر نے تو اس کا نام الہ آباد رکھا جو آج بھی سرکاری ریکارڈ میں موجود ہے۔ اسے بعد میں انگریزوں نے الہ آباد کرنے کی سیاسی کوشش کی مگر یہ تبدیلیاں انگریزی رسم الخط سے آگے نہ بڑھ سکیں۔ اردو اور ہندی زبان میں یہ آج بھی الہ آباد ہی لکھا جاتا ہے اور یہی متفقہ نام اس کی پہچان بن گئے ہیں۔

تعلیم اور سماجی صورت

الہ آباد کو قدیم کی ذد سے ہی تعلیمی اور سماجی اہمیت حاصل رہی ہے جو وقت کے تھپیڑوں اور کئی نشیب و فراز سے گزرتے ہوئے آج بھی قائم ہے۔ یہاں ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی، پارسی، تین اور بدھ مذہب کے ماننے والے امن و آشتی کے ساتھ رہتے ہیں اور مکمل آزادی سے اپنے مذہبی رسومات کو بے خوف و خطر انجام دیتے ہیں۔ پرانی جی ٹی روڈ پر بنی ہوئی پکا کی زیارت مثال ہے۔ علما باہمی یہاں پر گنگا جمنی تہذیب کا ملاقہ بھی آبادی کا علاقہ ہے۔ اس شاہراہ سے ہر مذہب کے جلوس اپنی مقررہ تاریخ اور وقت سے گزرتے ہیں جس میں ہر مکتب خیال کے افراد شریک ہو کر خراج عقیدت پیش کرتے ہیں۔ یہاں ہر کر آئی اے ایس، آئی پی ایس، آئی ٹی ایس، آئی آر ایس، اور پی سی ایس میں کامیاب طلبا پریکٹس میں مفت خدمات انجام دے رہے ہیں۔

تعلیمی اعتبار سے یہ شہر بے حد اہمیت کا حامل ہو گیا ہے۔ جس طرح قدیم ہندو روایات میں کاشی میں مرنے پر سیدھے جنت (مکتی) میں جانے کی بات کہی ہے اسی طرح انگریزی حکومت میں یہ بات شہرۂ عام ہے کہ اس شہر میں آکر تعلیم حاصل کرنے، کوچنگ کرنے اور مقابلہ جاتی امتحانات میں شرکت سے نوکریوں کا سہولیہ حاصل کی جا سکتی ہے۔ الہ آباد یونیورسٹی ہندوستان کا قدیم ترین تعلیمی ادارہ ہے جسے 1887ء میں انگریزی سرکار نے شروع کیا تھا۔ اب تک یہاں سے کامیاب ہو کر ہزاروں آئی سی ایس، سائنٹسٹ، جج، وکلا، اساتذہ، شعرا و ادبا اور بیوروکریٹ پوری دنیا میں اپنا نام روشن کر چکے ہیں۔ پروفیسر سنگھ، نارائن، ڈاکٹر ہرگوبند کھورانہ، تریبھون داس نوبل انعام یافتہ سائنسدانوں ہیں۔ سابق وزیر اعظم وشوناتھ پرتاپ سنگھ اور چندر شیکھر اس یونیورسٹی کے طالب علم رہے ہیں۔ چیف جسٹس آف انڈیا کے عہدے تک پہنچنے والے جسٹس ایم ہدایت یکے، جسٹس رنگ ناتھ مشرا کے این سنگھ، الشان سنگھ وغیرہ بھی اسی درسگاہ میں پڑھے

تھے۔ اکبر الہ آبادی، ڈاکٹر تاراچند، ڈاکٹر ایشوری پرشاد، ہری ونش رائے بچن، فراق گورکھپوری، پروفیسر ضامن علی، پروفیسر اعجاز حسین، پروفیسر احتشام حسین، سوریہ کانت ترپاٹھی نرالا، مہادیوی ورما، سمترا نندن پنت، رام کمار ورما اور پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی نے اِس شہر کے ادبی میعار کو بلند سے بلند تر کرنے میں بیش بہا کردار ادا کیا ہے۔

سیاسی اہمیت

الٰہ آباد شہر زبردست سیاسی اہمیت کا بھی حامل ہے۔ سابق وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو، شریمتی اندرا گاندھی اور وشوناتھ پرتاپ سنگھ اسی سرزمین پر پیدا ہوئے۔ لال بہادر شاستری، راجیو گاندھی بھی یہاں سے وابستہ رہے ہیں۔ مولوی لیاقت علی کی قیادت میں لڑی جانے والی پہلی جنگ آزادی 1857 اور مہاتما گاندھی کی قیادت میں ہوئے ستیہ گرہ آندولن میں یہ شہر بہت آگے رہا ہے۔ پنڈت موتی لال نہرو کے ذریعہ بنوایا گیا آنند بھون بیسویں صدی عیسوی میں آزادی کی لڑائی کا مرکز رہا ہے جو اَب قومی یادگار کے طور پر محفوظ ہے۔ ہیم وتی نندن بہوگنا الٰہ آباد کے بارہ حلقہ سے الیکشن جیت کر یوپی کے وزیر اعلیٰ بنائے گئے۔ یہاں کی مشہور ترین سیاسی شخصیات میں پنڈت شمبھر ناتھ پانڈے، سالگرام جائسوال، کلیان چند موہلے عرف پھٹن گرو، ڈاکٹر راجندری کماری باجپئی، جنیشور مشرا، ستیہ پرکاش مالویہ، مظفر حسین، منگلا پرساد، چودھری نونہال سنگھ، پروفیسر مرلی منوہر جوشی، پنڈت کیسری ناتھ ترپاٹھی، وغیرہ کے نام شامل ہیں۔ سنیما کے اداکار امیتابھ بچن کو کون نہیں جانتا؟ امیتابھ نے 1984 میں ہوئے پارلیمانی الیکشن میں ہیم وتی نندن بہوگنا کو شکست دے کر زبردست سیاسی اُلٹ پھیر کی تھی۔

شہر کی تاریخی عمارتیں:

الٰہ آباد شہر میں مختلف مذاہب کی کئی تاریخی عمارتیں موجود ہیں جہاں ہر برس کثیر تعداد میں سیاح اور عقیدت مند پہنچتے ہیں۔ ان میں شہنشاہ اکبر کا بنوایا ہوا لال قلعہ، بھاردواج آشرم، پاتال کنواں، شیتلا دیوی کا کڑا دھام، خسرو باغ، کمپنی باغ، الٰہ آباد ہائی کورٹ، الٰہ آباد یونیورسٹی، آنند بھون، جامع مسجد چوک، شاہی مسجد خلد آباد، سوراج بھون، گھنٹہ گھر وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ گنگا، جمنا اور سرسوتی کی تربینی کے گرد ونواح میں سیکڑوں چھوٹے بڑے مندر ہیں جہاں ہر روز عقیدت کے پھول چڑھائے جاتے ہیں۔ دائرہ شاہ اجمل اور دریا آباد علاقے میں کئی درگاہ خانقاہ اور امام باڑے ہیں جہاں عقیدت مند فاتحہ خوانی کو پہنچتے ہیں۔ الٰہ آباد ہائی کورٹ پورے ہندوستان

خسرو باغ

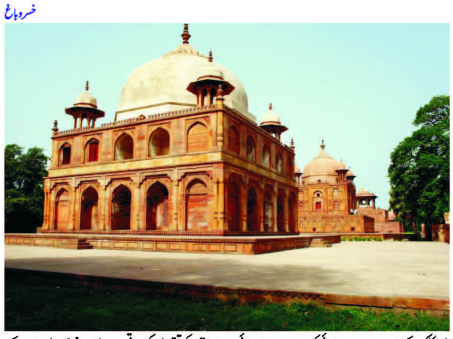

میں کلکتہ کے بعد سب سے بڑا ہائی کورٹ ہے۔ اِسی ہائی کورٹ نے 12 جون 1975 کے ایک فیصلے میں اس وقت کی آئرن لیڈی اور وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی کو اپنے پارلیمانی الیکشن میں بدعنوانی میں ملوث ہونے پر الیکشن کو کالعدم قرار دے دیا تھا۔ پتھر کی بنی ہائی کورٹ کی عمارت قانون کی محافظ ہے یہاں مرکزی اور صوبائی سطح کے سیکڑوں دفاتر کی عمارتیں ہیں جہاں ہزاروں ملازمین کام کرتے ہیں۔

اردو بولنے والے

2011 کی مردم شماری کے اعداد کے مطابق اس ضلع کی آبادی اُتر پردیش میں سب سے زیادہ ہے جو تقریباً پچاس لاکھ ہے۔ نگر نگم علاقہ (شہر) کی آبادی 15 لاکھ سے زائد ہے۔ اس آبادی میں ہندو مسلم، سکھ، عیسائی، پارسی، جین اور بودھ مذاہب کے لوگ شامل ہیں جو مختلف زبانیں بولتے ہیں۔ یہاں کی مرکزی زبان ہندی، اردو، اودھی، انگریزی، بنگالی اور پنجابی ہے۔ اُردو لکھنے پڑھنے اور بولنے والی آبادی آٹھ لاکھ سے زائد ہے۔ یہاں اردو کی تعلیم کے لیے چھوٹے بڑے سیکڑوں مدرسے اور کالج موجود ہیں چونکہ اتر پردیش سرکار نے اردو میڈیم سے اسکول کالج کھولنے پر پابندی عائد کر رکھی ہے لہٰذا اردو میڈیم اسکول کالج نہیں ہیں۔ اتر پردیش اردو مدرسہ بورڈ کا قیام عمل میں لاکر مدارس کو اس سے وابستہ کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ یہاں پورے سال مشاعرہ، محافل، مقاصدہ اور شعری نشست ہوتی رہتی ہیں جن میں ملک اور بیرون ملک کے قدآور شعرا شرکت کرتے رہتے ہیں۔ اردو، اتر پردیش کی دوسری سرکاری زبان ہے، لہٰذا سرکاری سطح پر درجہ ایک سے آٹھ تک بیسک تعلیمی بورڈ کی طرف سے اردو اساتذہ کی تقرری کی جاتی ہے۔ عوام وخواص میں اردو کے الفاظ سمجھنے اور بولنے کی صلاحیت موجود ہے۔

اردو شخصیات اور ان کے کارنامے









اوپر سے، موتی لال نہرو، اکبر الہ آبادی، فراق گورکھپوری اور شمس الرحمٰن فاروقی

تاریخ شاہد ہے کہ پورے ہندوستان کی یونیورسٹیوں میں سے اردو ڈیپارٹمنٹ کی تشکیل سب سے پہلے الٰہ آباد یونیورسٹی میں 1924 میں کی گئی۔ پروفیسر سید ضامن علی اس کے بانی اور پہلے صدر تھے جنھیں کیپٹن کا لقب بھی حاصل تھا۔ ان کی قیادت میں اردو زبان کو فروغ حاصل ہوتا رہا۔ آگے چل کر پروفیسر سید اعجاز حسین رضوی، پروفیسر سید احتشام حسین، ڈاکٹر رفیق حسین، پروفیسر سید محمد عقیل رضوی، پروفیسر جعفر رضا، پروفیسر سید فضل امام رضوی، پروفیسر علی احمد فاطمی جیسے لوگ اس مہم میں شامل ہوتے گئے ہیں۔ اس شہر نے اکبر الٰہ آبادی جیسا طنز ومزاح کا

گنگا کے کنارے اکبر کا قلعہ



شاعر اقوام عالم کو دیا ہے جس کا عالمی تقریباً ایک سو برس بعد بھی میسر نہیں ہو سکا ہے! اکبر الہ آبادی لکھتے ہیں:

کچھ الہ آباد میں ساماں نہیں بہبود کے
یاں رکھا کیا ہے سوا اکبر کے اور امرود کے
جج بنا کر اچھے اچھوں کا لہا لیتے ہیں دل
ہیں نہایت خوشنما دو جسم ان کے ہاتھ میں

داغ دہلوی کے شاگرد اور داغ اسکول کے معروف شاعر نوح ناروی اسی سرزمین سے وابستہ رہے جو لفظوں کے جادوگر مانے جاتے ہیں۔ یہ شعر انہی کا ہے:

ایسے ویسے، کیسے کیسے ہو گئے
کیسے کیسے، ایسے ویسے ہو گئے

بعد کے دور میں فراق گورکھپوری، شبنم نقوی، رازالہ آبادی، عتیق الہ آبادی، وغیرہ نے اردو زبان کو پروان چڑھایا۔ گیان پیٹھ انعام یافتہ فراق گورکھپوری کا منظوم مجموعہ (گل نغمہ) یہیں رہ کر لکھا گیا۔ راز الہ آبادی کی ایک غزل دنیا بھر میں مشہور ہے، جس کا مطلع ہے:

آشیاں جل گیا گلستاں لٹ گیا قفس سے نکل کر کدھر جائیں گے
اتنے مانوس صیاد سے ہو گئے اب رہائی ملے گی تو مر جائیں گے

1947 کے بعد اردو کے جن چار ماہنامو ں جاسوسی دنیا، نجہت، طلسمی دنیا اور روحانی دنیا نے اتنی مقبولیت حاصل کی کہ ہندوستان کا اے ایچ وہیلر کا کوئی بک اسٹال ایسا نہیں تھا جہاں اردو اور ہندی زبان میں ان کے ناول دستیاب نہ رہے ہوں، الہ آباد سے ہی شائع ہوت ے تھے۔ ان کی تصنیف اور اشاعت میں ابن سعید، ابن صفی، عباس حسینی جو نپوری وغیرہ کی کاوشیں قابل ستائش رہیں۔

اُردو کی موجودہ صورت حال

اس شہر میں اردو زبان کی موجودہ صورت حال بڑی حد تک تسلی بخش ہے۔ مدرسوں، خانقاہوں اور امام باڑوں نے اُردو زبان کو برقرار رکھنے میں نمایاں کارکردگی انجام دی ہے۔ حمد و نعت، قصیدہ خوانی، مرثیہ گوئی اور قوالیوں کی بزم آرائی وقتاً فوقتاً ہوتی رہتی ہے۔ انجمن روح ادب ایک قدیمی ادارہ ہے جو سیمینار اور مشاعروں کے ذریعہ فروغ اردو انجام دے رہا ہے۔ پروفیسر عقیل رضوی، ڈاکٹر شمس الرحمٰن فاروقی، نظام صدیقی اور علی احمد فاطمی وغیرہ بین الاقوامی سطح پر اردو زبان کے لیے اس شہر کی نمائندگی کرتے ہیں۔ اردو ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن نامی ادارہ خط و کتابت اور قانونی اصلاحات کے ذریعہ اردو زبان کو تقویت پہنچا رہا ہے۔ معاصر ادیبوں میں، اسرار گاندھی، سید فاضل ہاشمی، چودھری ابن النصیر، ضمیر احسن، اسلم الہ آبادی، سید انوار عباس، طوفان دریا آبادی، قمر الہ آبادی، مخدوم پھولپوری اور مقبول جائسی وغیرہ شامل ہیں۔ کل ملا کر یہاں اُردو کا مستقبل تابناک نظر آتا ہے۔

اکبر الہ آبادی اور اُن کی یادگار

مشہور شاعر اکبر الہ آبادی (1921-1846) اسی شہر میں پیدا ہوئے، پروان چڑھے، جج بنے، ریٹائر ہوئے اور یہیں پر انھوں نے وفات پائی۔ اکبر نے پرانے شہر کے رانی منڈی محلہ میں چوک کوتوالی سے متصل جی ٹی روڈ پر ایک عالیشان کوٹھی بنوائی اور اس کا نام اپنے بیٹے کے نام پر عشرت منزل رکھا۔ پندرہ ہزار مربع فیٹ کے وسیع و عریض رقبہ میں پھیلی اس کوٹھی میں کمروں اور برآمدوں کے ساتھ باغات کا خوبصورت امتزاج تھا۔ الہ آباد میں پیدا ہو سکنے والا کوئی ایسا پھل نہیں تھا جس کے درخت عشرت منزل میں نہ لگائے گئے ہوں۔ چھوٹی باغ کے نام سے مشہور حصہ باغیچہ میں 1980 تک اس طرح کے پیڑ موجود تھے۔ لیکن اب نہیں ہیں۔ ایسے خطوط بھی دستیاب ہوئے ہیں جن میں پتہ کے طور پر صرف 'اکبر الہ آبادی' لکھا ہوتا تھا اور ڈاک انھیں مل جاتی تھی۔ ان سے متعلق اس شہر میں ایک اور روایت مشہور ہے۔ پنڈت موتی لال نہرو ایک مشہور وکیل اور اکبر الہ آبادی ایک جج تھے۔ دونوں ہی دعوت و مدارات کھانے اور کھلانے کے بیحد شوقین تھے۔ موجودہ آنند بھون کی زمین کو سر سید احمد خاں کے ورثا سے خرید کر پنڈت موتی لال نہرو نے ایک عالیشان کوٹھی کی تعمیر کرائی اور اس سلسلے میں منعقدہ دعوت میں شہر کے خواص کو بلایا۔ اکبر الہ آبادی بھی تشریف لے گئے۔ موتی لال نہرو، اکبر کو مخاطب کرتے ہوئے بولے۔

''آپ ایک جج، عالم اور بلند شاعر ہیں۔ میری اس کوٹھی کا مناسب نام تجویز کر دیجیے۔'' اکبر نے برجستہ جواب دیا۔ ''ہم دونوں بیحد قریبی دوست ہیں۔ میں مسلمان ہوں اور میری کوٹھی کا نام عشرت منزل ہے۔ آپ ہندو ہیں لہٰذا عشرت منزل کا ہندی ترجمہ 'آنند بھون' ہوتا ہے اس لیے آپ اسے قبول کر کے اپنی کوٹھی کو آج سے آنند بھون کہنا شروع کر دیجیے۔ موتی لال کو یہ نام بیحد پسند آیا اور 1912 میں تعمیر آنند بھون ایک صدی بعد بھی اسی نام سے مشہور ہے۔ اکبر الہ آبادی زندگی کے آخری وقت میں بے حد نحیف و زار ہو گئے تھے۔ آنکھ کی بینائی کمزور ہو گئی۔ ضعف پیری سے لکھنے پڑھنے سے معذور ہو گئے۔ عشرت منزل میں آخری سانسیں لیں۔ الہ آباد شہر کے کالا ڈانڈہ قبرستان میں تجہیز و تکفین عمل میں آئی جہاں آج بھی اکبر الہ آبادی کی قبر دیکھی جا سکتی ہے۔

1947 میں ملک انگریزی حکومت سے آزاد ہوا تو اکبر کے ورثا نے پاکستان جانے کا فیصلہ کیا۔ عشرت منزل میں کسی قریبی کو پناہ دے کر پاکستان چلے گئے اور وہیں کے شہری بن گئے۔ یہ کوٹھی کسٹوڈین میں چلی گئی۔ جلد ہی اکبر میموریل کے نام سے اس کوٹھی میں لائبریری کھول دی گئی جس کا مکمل انتظام اہل ہنود کے ہاتھ میں تھا۔ اس دور میں ہندو، مسلم فرقہ وارانہ فسادات ایک عام بات تھی۔ کوٹھی گنجان مسلم آبادی میں تھی لہٰذا ہمیشہ نقص و نسخ کا مسئلہ پیدا ہوتا رہا۔ اس میں مسلمانوں کی تعلیم کے لیے ایک تعلیمی ادارہ کھولنے کی تجویز پاس ہوئی جہاں انگریزی، سائنس اور ریاضی وغیرہ کی تعلیم دی جا سکے۔ یادگار حسینی سوسائٹی کی تشکیل ہوئی اور سرگرمی سے زمین یا عمارت کی تلاش برائے ادارہ شروع ہوئی۔ عوام الناس کی نظر عشرت

منزل پر گئی۔ کافی جدوجہد اور اس وقت کے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو، وزیر تعلیم، مولانا ابوالکلام آزاد اور محکمہ تعلیم کے مرکزی سکریٹری، پروفیسر ہمایوں کبیر کی کوششوں سے حکومت، کسٹوڈین کی جائیداد یادگار حسینی سوسائٹی کو منتقل کرنے پر راضی ہوئی۔ اس وقت کے الہ آباد کے ضلع مجسٹریٹ نے 1952 میں اس جائیداد کی قیمت بائون ہزار روپے مقرر کی اور ایک سال کے اندر چار مساوی قسطوں میں پوری رقم ادا کرنے کے عہد و پیمان پر فریقین نے دستخط کیے۔ اس وقت یہ ایک کثیر رقم تھی لیکن الہ آباد کے تعلیم پسند دوستوں نے اسے ایک مشن کے طور پر لیا اور پابندی وقت سے ساری قسطیں ادا کر دی گئیں۔ عشرت منزل، یادگار حسینی سوسائٹی کی ملکیت بذریعہ خریداری ہوگئی اور آج بھی اسی سوسائٹی کو حق مالکانہ حاصل ہے۔ 1949 میں یادگار حسینی ہائر سکنڈری اسکول کو یوپی ایجوکیشن بورڈ سے الحاق ملا۔ 1952 میں اسکول اس خریدی گئی عمارت میں منتقل ہوا۔ 1975 میں یوپی بورڈ نے انٹر کالج کے طور پر تسلیم کرلیا۔ انیسویں صدی کی عشرت منزل اب یادگار حسینی انٹر کالج ہے، یہاں انٹر میڈیٹ درجات تک ہندی اردو، انگریزی، ریاضی، سائنس، بایولوجی اور کامرس کی تعلیم کا مکمل انتظام ہے۔ گورنمنٹ سے تسلیم شدہ اس تعلیمی ادارہ سے اہل الہ آباد برابر مستفیض ہو رہے ہیں۔

فروغ اردو اور مرکزی حکومت

موجودہ مرکزی حکومت نے اس شہر میں اردو کے فروغ کے لیے دلچسپی دکھائی ہے۔ نیشنل کونسل فار پروموشن آف اردو لینگویج نے اُردو کمپیوٹری تعلیم کے لیے الہ آباد ضلع میں کئی انسٹی ٹیوٹ قائم کیے ہیں جہاں بلا تفریق مذہب وملت کمپیوٹر کی سرکاری تعلیم دی جارہی ہے۔ اُردو کے فروغ کے لیے اُتر پردیش اردو اکادمی اور مرکزی حکومت نے وظائف مقرر کیے ہیں جو وجہ ایک سے لے کر پی ایچ ڈی کر رہے طلبا وطالبات تک کے لیے ہیں۔ اُردو میں معیاری کتابیں شائع کرنے کے لیے بھی مرکزی حکومت امداد بہم پہنچا رہی ہے۔

قومی اردو کونسل نے اپنے اب تک کے سفر میں جو بھی کامیابی حاصل کی ہے اس میں ڈاکٹر حمید اللہ بھٹ کے رول کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا جن کی قیادت میں قومی اردو کونسل نے اردو زبان کی تعلیم و تدریس کو کمپیوٹر اور آئی ٹی سے منسلک کرنے کے لیے پورے ملک میں بہت سے مراکز کا قیام کیا اور جن کے سرٹیفکیٹ اور ڈپلومہ کورسز نے نہ صرف لاکھوں نوجوانوں کو اردو زبان سے جوڑ کر روزگار حاصل کرنے کے قابل بنایا بلکہ اردو بولنے والوں کو ایک مضبوط اور طاقت کے طور پر بھی سامنے لا کر کھڑا کیا۔

قومی اردو کونسل کی تاریخ میں کونسل کے چیئرمین جناب کپل سبل کا بھی رول اہمیت رکھتا ہے، جن کی بدولت اردو بولنے والی آبادی کے معاشی و اقتصادی استحکام کے وسیع تر امکانات روشن ہوئے ہیں۔ ان ہی کی پالیسیوں کے نتیجے میں بہت جلد پچاس ہزار اردو والوں کو ملازمتیں ملنے کی صورت پیدا ہوئی ہے۔ انھوں نے اردو کونسل کو سرٹیفکیشن کے قانونی اختیارات دینے کا وعدہ بھی کیا ہے جس کا اردو والوں کو یقیناً فائدہ ہوگا۔

قومی اردو کونسل کی کارکردگی

بھارت سرکار کی ایچ آر ڈی منسٹری کے تحت ہائیر ایجوکیشن کے شعبہ نے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی تشکیل کی ہے۔ یہ ادارہ اُردو زبان اور نیشنل کو کمپیوٹر سے جوڑنے کے لیے ایک عرصہ سے کام کر رہا ہے۔ پورے ملک میں کونسل اُردو نے کمپیوٹر سنٹر کھول رکھے ہیں۔ شہر الہ آباد میں یادگار حسینی انفارمیشن ٹکنالوجی سینٹر خاص کہنہ، وصیۃ العلوم انفارمیشن ٹکنالوجی انسٹی ٹیوٹ روشن باغ، ڈاکٹر مرلی منوہر جوشی انفارمیشن ٹکنالوجی انسٹی ٹیوٹ کرما، جامعہ امامیہ انوار العلوم انفارمیشن ٹکنالوجی انسٹی ٹیوٹ کریلی، الحرا فاروقی گرلس انٹر کالج چکیہ سرسید میموریل سوسائٹی رانی منڈی لعل بارٹ انسٹی ٹیوٹ آف انفارمیشن ٹکنالوجی نینی کے نام سے فی الوقت چھ شاخیں قائم ہیں۔

اُردو داں طبقہ کا مطالبہ ہے کہ کونسل کے کورسز کو 'O' Level کا درجہ دلانے کی کوشش کی جائے تاکہ یہاں سے کامیاب شدہ طلبا روزی، روٹی سے جڑ سکیں۔ ہندوستان کے تمام شہروں میں جہاں پر کونسل کے سنٹر چل رہے ہیں، ایک برس میں کم سے کم دو بار روزگار میلہ لگایا جائے تاکہ سند یافتگان ذریعہ معاش حاصل کر سکیں اور اُن تمام سرکاری و غیر سرکاری شعبوں میں جہاں پر کمپیوٹر ضروری ہو کونسل کے ڈپلومہ یافتہ نوجوانوں کو تقرری میں فوقیت دی جائے۔

M M Kazmi, Centre Incharge YHIT (2516) Allahabad (UP)

الہ آباد ہائی کورٹ کی عمارت





الہ آباد میں قومی اردو کونسل کے ایک کمپیوٹر سینٹر کے طلبا اور طالبات

سلمہ حسین

دلّی کا دسترخوان



مشہور انگریزی کہاوت ہے کہ روم ایک دن میں نہیں بنا۔ یہ قول دلی پر بھی صادق آتا ہے۔ پانڈوؤں کے زمانے سے لے کر مغلوں کے زمانے تک دلی نے سیکڑوں انقلابات اور تغیرات دیکھے ہیں۔ یہ وہ حسین دوشیزہ ہے جس کی مانگ بار بار اجڑی ہے اور نئی آن بان کے ساتھ پھر آباد ہوئی ہے۔

اس کی دہلیز پر قدم رکھنے والوں نے کبھی اسے سر آنکھوں پر بٹھایا تو کبھی زخموں سے لہولہان کیا۔ اس کی مٹی میں ہندوستان کی تاریخ پوشیدہ ہے اور اس کی اینٹوں نے دل دہلانے والے نظارے دیکھے ہیں۔

یہ شہر نگاراں رنگارنگ تہذیبوں اور رواجوں کا حامل ہے۔ کبھی تو یہ شہر مہابھارت کے صفحات سے جھانکتا ہے تو کبھی راجپوتوں کا چولا بدلتا ہے۔ کبھی مسلمانوں کا انگرکھا پہنتا ہے تو کبھی لاٹ صاحب کا کوٹ پتلون، تو کبھی پنڈت کا دھوتی کرتا۔ بس یوں سمجھیے کہ دلی وہ حسینہ ہے جو فیشن، اور لباس بدل بدل کر آتی رہی اور لوگوں کو لبھاتی رہی۔

نویں صدی سے لے کر ستر ہویں صدی تک یہ ہر فاتح کی محبوبہ رہی ہے۔ ہر صدی میں اس کے مختلف نام رہے۔ لال کوٹ، سری تھلتی آباد، جہاں پناہ، فیروز آباد، دین پناہ، شاہجہاں آباد اور نئی دلی۔

وقت کے دھارے میں بہتا یہ شہر ہر نئی تہذیب کو گلے لگاتا رہا اور ایک نیا روپ دھارتا رہا۔ وقت کے ساتھ نہ صرف اس کا نام اور تہذیب بدلتی رہی بلکہ اس کے ذائقے بھی بدلتے رہے۔

مہابھارت کے صفحات میں کھانے کا ذکر ضرور ملتا ہے لیکن صرف ایک ضرورت کے لحاظ سے راجپوت ٹھہرا پیدائشی شکاری وہ شکار کرتا رہا اور کھاتا رہا۔ مسلمانوں کی حکومت کا پہلا دور بھی کھانوں کے لحاظ سے پرتکلف نہیں تھا۔ ابن بطوطہ، امیر خسرو اور بیرونی سیاحوں نے ان کے دسترخوان کا ذکر ضرور کیا ہے۔ لکھتے ہیں ''پٹھانوں اور افغان سلاطین کے دسترخوان پر کچھ روٹیاں جیسے نانِ تنک اور نانِ تنوری، گوشت اور پیاز سے بھرے سموسے، بھونا مرغ، دو ایک طرح کے پلاؤ، کچھ حلوے اور شربت موجود رہتے تھے۔ لیکن یہ کھانے نفاست اور تکلف سے بری تھے۔

کھانے کو دراصل ایک فن بنانے والے مغل تھے۔ جو دور دراز سے گھوڑے دوڑاتے اس اجنبی ملک میں وارد ہوئے تھے۔ سلطنت کے پھیلاؤ کے ساتھ ساتھ یہ شان و شوکت کے بھی دلدادہ ہو گئے۔ ایک عرصے تک وارث رہنے کے بعد یہ شہر مغل خاندان کے پانچویں بادشاہ شاہجہاں کے ہاتھوں پھر آباد ہوا اور شاہجہاں آباد کہلایا۔

شاہجہاں آباد کی بنیاد بڑے چاؤ چونچلے سے رکھی گئی۔ شاہجہاں آباد شان و شوکت کا شہر تھا۔ شعر و شاعری کا مرکز تھا۔ پہلے روپے کی ریل پیل تھی جواہرات کی بارش تھی، قلعہ معلّٰی کی شان و شوکت، تخت طاؤس کی چکاچوند، لال قلعے کی چہل پہل غرض شاہجہاں نے اس شہر کو وہ رونق بخشی کہ تاریخ اُسے بھلا نہ پائے گی۔ اس کے بازار، ہنگاموں، رونقوں، میلوں ٹھیلوں، تہواروں اور تقریبوں سے آباد تھے۔ قلعہ معلّٰی کے شاہی باورچی خانوں کے چولہے دہک اٹھے۔ کباب سکنے لگے اور پلاؤ پکنے لگے۔ معطر کھانوں کی مہک سے فضا مہک اٹھی۔

ملک ملک سے آئے ماہر باورچیوں اور رکابداروں نے شاہی دسترخوان کو پرتکلف لذیذ کھانوں سے آراستہ کر دیا۔ قسم قسم کے کباب، نفیس پلاؤ، تنجن، حلیم، شاہی، نہاری، کوفتہ قورمے، قلیے، اچار مربے شیرینی اور شربت بنانے میں یہ باورچی ایک دوسرے کو پیچھے چھوڑنے لگے۔ بادشاہ کی عنایت کے طلب گار یہ باورچی مہارت کی منزلیں طے کرتے گئے۔ نہ صرف قلعہ معلّٰی بلکہ امرا اور وزرا کے دسترخوان بھی مرغن کھانوں سے سجنے لگے۔ چاندنی چوک کی دکانوں سے خوشبوئیں لپٹیں اٹھنے لگیں۔ چاٹ کے خوانچے سج



یوں تو دھلی کا روایتی دستر خوان اب قصے کہانیوں کا حصہ بن گیا ہے لیکن جامع مسجد دھلی میں ہوتت افطار اب بھی اس کسی ہلکی سی جھلک دیکھنے کو مل جاتی ہے

گئے، نان بائیوں کی دکانوں پر بہار آگئی۔ شیرمال، کفتان، باقرخوانی، گاؤمبان، ورقی پراٹھے اور کلچے ہاتھوں ہاتھ بکنے لگے۔ اگر نہاری بارہ سالوں کی دیگ تھی تو حلیم تین ہانڈی کا پکوان اور دولت کی چاٹ شبنم کی سوغات، شاہی حلوائی بڑی نفاست سے ادرک، گاجر اور دارچینی کے حلوے بنانے لگے۔ مٹھائیوں کے تھال سجنے لگے۔ بادام لتے کی لوز، سوہن حلوا، پیٹھے کے انگور ایسے کہ اصل کا گمان ہو۔

شہر کی آمد و رفت بڑھی، بھٹیارے اپنی اپنی سرائے کھولے اِس فن کے رکھوالے بن گئے۔ شہر میں داخلہ سرائے کے قریب بنے دروازوں سے ہوا کرتا تھا۔ یہ دروازے سورج ڈھلے بند ہوجایا کرتے تھے۔ بھٹیارا حقہ تازہ کرتا تھا تو بھٹیارن دیگ اتارتی تھی۔ سل بٹے کے کباب، سرائے کی بریانی، تارقلیہ، سگڑی پر پکا گوشت، خمیری روٹی کھا کر دور سے آنے والے سوداگر کھاٹ پر لمبی تان کر سوجائے اور تڑکے شہر میں داخل ہوتے تھے۔ کبھی کبھی بھٹیارن کہتی: بھیا سات دن گوشت کھانے سے دل سخت ہوجاتا ہے۔ آج جمعہ ہے دال چاول کھالو اصلی گھی سے بگھاری ہے۔ آج یہ ساری باتیں قصہ ہوکر رہ گئی ہیں۔

مسلمانوں کے علاوہ غیر مسلموں کے گھروں میں بھی عمدہ کھانے پکتے تھے۔ کائستھ کو آدھا مسلمان کہا جاتا ہے۔ یہ ترکاریوں کے ساتھ گوشت کا استعمال خوب کرتے تھے۔ کہتے ہیں شب دیگ کی مہارت انھیں پر ختم ہے۔ کھٹی میٹھی مچھلی، خستہ بھنڈی، دم کے کریلے ایسے کہ تارے کا گمان ہو۔

تجارت پیشہ مارواڑی اور بنیے گوشت مچھلی سے پرہیز ضرور کرتے تھے لیکن سبزیاں بنانے میں ایسے ماہر کہ کھانے والا گوشت کا مزہ بھول جائے۔ بیسن کے عمدہ پکوان، اروی کا قورمہ، دم آلو ایسے عمدہ کہ کھاتے ہی چلے جاؤ لہسن اور پیاز بنا کے یہ کھانے نہ صرف صحت مند بلکہ لذت سے بھرپور ہوتے تھے۔ کہتے ہیں ان بنیوں نے دلی والوں کو چٹورا بنا دیا۔ چاٹ کے کٹورے کھاتے چلے جاؤ پر من نہ بھرے۔ خوانچے والے گھر گھر آواز لگاتے۔ دلی کے بڑے، میاں بیوی مروے کھاؤ پکوڑی، بنوکڑوڑی۔

غرض المختصر دلی کے دسترخوان کو وسیع کرنے میں ہر مذہب وملت نے بڑی لگن سے ساتھ دیا۔ نیز ان سب کی دلی یہ میراث دلی کا انمول خزانہ ہے۔

مغلوں کی سلطنت پر زوال کیا آیا۔ شاہی باورچی خانوں کے چولھے ٹھنڈے پڑ گئے۔ کباب اور بریانی کی خوشبوئیں ہوا میں گم ہوگئیں، چاندنی چوک کی دکانیں ویران ہوگئیں۔ گھنٹے والے مٹھائی فروش کا گھنٹہ خاموش ہوگیا۔ خوانچے والوں کی آوازیں سرے سے غائب ہوگئیں۔ شربت کے کٹورے بجنے بند ہوگئے اور چاندنی چوک سونا ہوگیا۔



پایا، نہاری اور تندوری نان دھلی کے وہ روایتی کھانے ہیں جو آج بھی پرانی دلّی میں شوق سے کھائے جاتے ہیں اور وہ بھی بطور ناشتہ!

ملک کی تقسیم نے جہاں شہر پر ظلم ڈھائے وہاں پنجاب سے آنے والے شرنارتھیوں نے شہر کو تندور سے آشنا کروایا۔ سانجھا چولھا سلگنے لگا اور تندوری روٹیاں سکنے لگیں۔ پنجابی ریسٹورنٹ شہر کی رونق بنے۔ تندوری مرغ، مکھنی چوزہ، مکھنی دال، دلی کے دسترخوان کا حصہ بنے، پراٹھوں کی مہک دور دور تک پھیل گئی۔ جگہ جگہ چھوٹے چھوٹے ڈھابے کھل گئے جہاں تازہ سادہ کھانا لوگوں کی بھوک مٹانے لگا۔

جب ذرا سکون ہوا۔ قلعہ معلیٰ کے کھانوں سے دلی کی گلیاں آباد ہوئیں اور آج تک آباد ہیں۔ بھٹیارے سرائے سے اٹھ کر شہر کی گلیوں میں آبیٹھے اور یہیں اپنے چولھے روشن کیے۔ آج بھی ان کی روزی روٹی انھیں پرانے کھانوں کی میراث سے چل رہی ہے۔ لیکن وہ نزاکت وہ نفاست کہاں۔ نہ وہ لگن رہی اور نہ وہ روپیہ۔ مفت کی سبز دھوپ سب کچھ جھلس کر رہ گیا۔

گو نئے دور کے تھپیڑوں نے اس فن کو تقریباً مٹا سا دیا ہے۔ لیکن کہیں کھونے کھدرے میں یہ اب بھی سسک رہا ہے۔ ضرورت ہے اسے اوپر اٹھانے کی تاکہ یہ فن ایک بار پھر زندگی کی سانس لے سکے۔

ضرورت ہے نئی نسل کو قدیم کھانوں کی لذت سے واقف کرانے کی تاکہ ہمارے دسترخوان پھر سے ان نعمتوں سے آراستہ ہوجائیں۔

Salma Husain, Culinary Expert, Indian Food, E-52 GF, Sun City, Sector 54, Gurgaon - 1122002 (Haryana)



کون ہوگا ایسا کھانوں کا شوقین کہ دھلی کی چاٹ اور پستہ زعفرانی قلفی سامنے ہو اور اس کے منہ میں پانی نہ آجائے!

خالد حسین خاں

بوم میرٹھی اور اُن کا مزاحی شعور

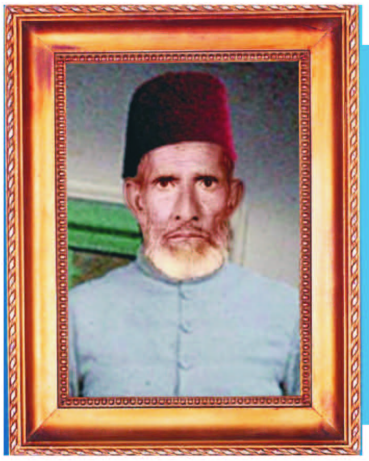

اردو کے نہ جانے کتنے شاعر و ادیب ایسے ہیں جو اپنی خود داری، غیرت مندی اور غیور طبیعت نیز مزاج اور مذاق کے سبب گمنام رہ گئے اور اگر کچھ طور پر گمنام نہیں ہوئے تو وہ مقام و مرتبہ بھی حاصل نہ کر سکے، جس کے وہ بجا طور پر مستحق تھے۔ اس تناظر میں جب ہم دبستانِ میرٹھ کے ایک معروف شاعر بوم میرٹھی کے فکر و فن کا بنظرِ غائر جائزہ لیتے ہیں تو یہ دیکھ کر افسوس ہوتا ہے کہ ماضی قریب میں طنز و مزاح کی دنیا کے جس شاعر کا ڈنکا چہار سو بج رہا تھا، آج وہ داستانِ پارینہ بن چکا ہے۔ طنز و ظرافت کے ایوان میں میرٹھ کا مقام کچھ کم نہیں ہے۔ سرزمین میرٹھ میں سب سے پہلے قابلِ ذکر و فکر جس شاعرِ طنز و مزاح نے آنکھیں کھولیں اور اپنی طنزیہ و مزاحیہ شاعری سے نہ صرف اپنے وطنِ مالوف میرٹھ بلکہ تمام ہندوستان میں اپنی قادر الکلامی، عصری حسیت، زمانے کی بوالعجبیوں، اُمرا و رؤسا کی رکیک حرکتوں اور نظامِ وقت کی سیاہ کرتوتوں کو جس طرح مزاحیہ اسلوب میں ہدفِ تنقید و ملامت بنایا ہے، وہ نام بوم میرٹھی کا ہے، جن کے تبسم زیر لب، ظریف، حساس اور شوخ و شگفتہ مزاج تھے۔

بوم میرٹھی کا اصلی نام منشی شیر محمد خاں اور تخلص بوم ہے۔ ان کی ولادت پیر ولی بخش میرٹھ شہر میں ہوئی تھی۔ انیس احمد حسینی انیس میرٹھی سکریٹری حسینی لائبریری میرٹھ شہر کے بقول، معروف ادیب و شاعر محمد مشتاق شارق بیرٹھی مرحوم نے انھیں بوم کا سن پیدائش 1881 بتایا تھا۔ میرٹھ شہر میں ہی غربت اور کس مپرسی کے عالم میں انھوں نے 1954 میں انتقال کیا اور میرٹھ میں ہی آسودۂ خاک کیے گئے۔

منشی شیر محمد خاں نے اپنا تخلص بوم یوں ہی اختیار نہیں کیا تھا، اس کے پس پشت ان کے دماغ میں غالباً یہ خیال اور یہ تصور جاگزیں تھا کہ جب کسی بھی مشاعرے میں ناظم مشاعرہ ان کو بوم کہہ کر دعوتِ سخن دے گا تو سامعین ان کا تخلص سنتے ہی قہقہہ بردوش ہو جائیں گے اور ان کا یہ خیال صحیح ثابت بھی ہوا۔ لطف یہ کہ جب بوم میرٹھی کو مشاعرے کے اسٹیج پر دعوتِ شعر و سخن دی جاتی تھی تو وہ بے حد مسکین و معصوم صورت بنائے، آنکھیں نیم وا کیے، سکوت و سکون کے ساتھ جب اسٹیج پر نمودار ہوتے تو وہ بذاتِ خود اپنے تخلص کی تصویر نظر آتے۔ اس صورت حال کی کیفیت، اپنی مقبولیت اور اپنی فطرت کی مرقع کشی وہ ایک مقطع میں یوں کرتے ہیں:

کلام اچھا سنائیں یا سنائیں فحش سی غزلیں
جنابِ بوم سے محفل میں رونق آ ہی جاتی ہے

بوم میرٹھی نے کسی تعلیمی ادارے، کتب یا مدرسے میں باقاعدہ تعلیم حاصل نہیں کی تھی۔ اسی کے ساتھ یہ بھی صحیح ہے کہ بوم میرٹھی فنِ عروض کے ماہر بھی نہ تھے۔ تاہم یہ بھی اپنی جگہ مبنی برحق ہے کہ وہ فطری شاعر، زود گو، ذی حس، تجربہ، مشاہدہ اور دنیاوی معاملات و مسائل کے پورے رازداں تھے۔ گرچہ وہ علم اکتسابی سے محروم رہے نیز یہ کہ ان کے کلام رنگا رنگ کے مطالعے سے ہمیں فنی و عروضی اور بحوری استقام و انقلاط بھی مل جاتے ہیں، ان سب کے باوجود ان کی خداداد صلاحیتوں اور فطری خوبیوں کو تسلیم کیے بغیر نہیں رہ سکتے۔ خدا نے ان کو وہبی اوصاف سے بھرپور نوازا تھا، وہ مادرزاد شاعر تھے، مادرِ فطرت کی گود میں پروان چڑھ کر اردو کی طنزیہ و مزاحیہ شاعری کی دنیا میں وارد ہو کر انھوں نے قبولِ عام کی سند ضرور حاصل کی۔

تقسیم وطن سے قبل بوم میرٹھی کی شہرت و مقبولیت بام عروج پر تھی، ان کی ہر دل عزیزی اور مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ

وہ نہ صرف میرٹھ اور اس کے قرب وجوار بلکہ متحدہ ہندوستان کے ہر بڑے مشاعرے میں بصد اصرار مدعو کیے جاتے تھے اور ان کی شرکت مشاعرے کی کامیابی کی ضمانت سمجھی جاتی تھی۔ ہر محفل، ہر مجلس اور مشاعرے میں ان کی قادرالکلامی کا سکہ خواص وعوام کے دلوں پر یکساں تھا۔ ان کی شاعرانہ صلاحیتوں اور خداداد خوبیوں کا چرچا عرصہ تک لوگوں کے ورد زبان رہا۔ حقیقت یہ ہے کہ یوم میرٹھی بیسویں صدی کے طنز ومزاح کے بہت مقبول، مشہور اور معروف شاعر سمجھے جاتے ہیں۔ لیکن مقام افسوس ہے کہ اکیسویں صدی کے پہلے عشرے میں نہ صرف نوجوان طبقہ بلکہ عمر رسیدہ حلقہ بھی یوم میرٹھی کے نام اور کلام کو تقریباً بھول چکا ہے!

یوم میرٹھی کی اپنی نجی زندگی، آلام ومصائب اور کرب و مفلسی کی ایک غمگین داستان ہے۔ ان کی غربت، گمنامی اور زبوں حالی کی ایک اہم وجہ یہ ہے کہ وہ ایک خوددار، لاابالی، بےخبر اور صاحبِ طرف شخص وشاعر تھے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ باپوڈ کے تحصیل دار کی ایک بہو جن زادی سے عشق کی پینگیں جب حد سے تجاوز کرگئیں تو یوم میرٹھی نے اس کے سیاہ کرتوتوں کا کچا چٹھا اپنی مزاحیہ شاعری کے وسیلے سے تفصیل سے اجاگر کردیا، نتیجتاً تحصیل دار یوم میرٹھی سے سخت برافروختہ ہوا اور ان کو ارولی کی معمولی ملازمت سے برطرف کردیا۔ لیکن یوم میرٹھی کا ظرف، حوصلہ اور خودداری دیکھیے کہ روزی روٹی کے لالے پڑجانے کے باوجود انھوں نے تحصیل دار سے معافی نہیں مانگی، اور نہ ہی کسی دوسرے کے سامنے دست سوال دراز کیا۔ اس کے بجائے اپنے جسم وجاں کا رشتہ برقرار رکھنے کے لیے یوم میرٹھی نے یہ سبیل نکالی کہ وہ اپنی طنزیہ ومزاحیہ شاعری کے مختصر کتابچے خود ہی طبع کراتے اور میرٹھ کے مصروف چوراہوں اور مشہور بازاروں مثلاً گھنٹہ گھر، ویلی بازار اور بدھانہ گیٹ پر لب سڑک محفل لگا کر ان کو اپنی دلکش آواز میں ترنم سے بآواز بلند خود سناتے اور جب مجمع اکٹھا ہوجاتا تو ان کتابچوں کو فروخت کرتے تھے۔ اس دوران وہ بھیڑ میں شامل سامعین اور ناظرین کو، جن میں اکثریت نوجوان لڑکوں کی ہوتی تھی، ہنساتے ہنساتے لوٹن کبوتر بنا دیتے تھے لیکن خود ساکت وجامد اور خاموش رہتے۔ مجھے میرٹھ کے بزرگوں اور معمر لوگوں نے بتایا کہ یوم میرٹھی بذات خود کبھی ہنستے نہ دیکھے گئے۔ ان کے چہرے پر متانت اور مسکینیت چھائی رہتی، آنکھیں نیم وا رہتیں اور لبوں پر ہنسی کا شائبہ نہ ہوتا۔ غالباً یہ بھی یوم میرٹھی کی ایک ادائے دلبرانہ اور کردار شاعرانہ تھی۔

بالعموم یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ دوسروں کو مشاعروں، مجلسوں، محفلوں، بزموں اور بازاروں میں ہنسانے والے فنکار اپنے مکانوں میں رنجور وبیمار اور درد وداغ سے مجبور رونے کے لیے محصور اور آہیں بھرنے کے لیے مشہور ہوتے ہیں۔ یوم میرٹھی کا معاملہ بھی اسی ڈگر کے تخلیق کاروں میں ہوتا ہے۔

یوم میرٹھی کے کلام میں سلاست ہے، نفاست ہے، روانی ہے اور زمانہ شناسی کی خوبیاں بھی لائقِ ذکر وفکر ہیں۔ انھوں نے عام بول چال کے لفظوں کو شعروں میں برت کر ان میں حسن، دلکشی، روانی اور معنی آفرینی کی صفات بڑی خوبی سے پیدا کی ہیں۔ مثلاً یہ شعر ملاحظہ ہو:

جب چڑھے باغی پہ ہم دونوں تو پبلک نے کہا
یہ مجنّی ہے، یہ موہنی ہے، یہ کوہ طور ہے

یہ شعر یوم میرٹھی کے فکر وفن، تصور وتخیل، معنی آفرینی اور طنز ومزاح کا خوبصورت اظہاریہ ہے ان کا یہ فصیح وبلیغ شعر ان کی شناخت وشہرت کے لیے اور ان کے رجحانِ شاعری کے لیے نیز ان کے مزاح ومذاق کو سمجھنے کے لیے کافی ہے۔



میں واقف ہی نہیں ہوں کس کو دولت مال کہتے ہیں
میں ہوں کنگال کا بچہ مجھے کنگال کہتے ہیں
جو روٹی مل گئی تو دال کے ہوتے نہیں درشن
اسی باعث تو مجھ کو یوم بے دال کہتے ہیں

یوم میرٹھی نے جملہ اصنافِ سخن میں اپنی شاعرانہ جولانیاں دکھائی ہیں۔ اکثر شعروں میں سنجیدہ شاعری کے تمام محاسن بھی جلوہ گر ہیں۔ مثلاً یہ اشعار دیکھیے جو کسی سنجیدہ غزل کی تمام خوبیوں سے مملو ہیں:

اپنے الفاظوں میں بہہ رہا ہوں میں
اُف یہ چشمِ پُر آب کا عالم
ایسی پیری سے لاکھ بہتر تھا
ٹوٹا پھوٹا شباب کا عالم
نہ گئو بوسہ وصل کی شب میں
آج ہے بے حساب کا عالم
ہے دعا یوم کی ہزاروں سال
رہے تم پر شباب کا عالم

یوم میرٹھی کا مخصوص رنگ وآہنگ طنز وظرافت سے عبارت ہے۔ اس طنز خاص میں انھوں نے 'دہشت' کے ذیل میں کتنے اہتمام اور دل آسا اسلوب میں اشعار کہے ہیں، جن کے مطالعے سے ہمیں ان کی مشاقی، دانائی، ہوشمندی اور قادرالکلامی کا احساس واندازہ بخوبی ہوجاتا ہے:

گلے میں پائجامہ سر پہ جوتے پاؤں میں ٹوپی
جنابِ یوم کا دہشت میں نقشہ اور ہی کچھ ہے
جو سیکھی تھی کبھی جمناسٹک دہشت میں کام آئی
بہار آتے ہی بھاگا پھاند کر دیوار زنداں کی
میری دہشت سے میرا بچہ گر بھی ہوگیا پاگل
مرے دامن پہ بچی ٹانک دی میرے گریباں کی

ان شعروں میں یوم میرٹھی نے دہشت میں، انسانی دیوانگی اور بدحواسی کی جو مضحکہ خیز صورت اور کیفیت کی منظر کشی ہے اور جس ہوشمندی اور فنکاری سے کی ہے، یہ خوبی لائقِ تحسین وآفریں ہے۔

یوم میرٹھی کی طنز وظرافت اور تفتیش وتسخر سے مزین شاعری میں ہزل، ہر طرح اور ہر قسم کا مال دستیاب ہے۔ ان کے کلام میں بے ساختگی اور چستگی بھی اپنے عروج پر نظر آتی ہے، اس قبیل کا یہ شعر دیکھیے:

کبھی آندھی کبھی اولے کبھی بارش کبھی بجلی
جہاں یہ آفتیں ہوں ایسی تیسی اس گلستاں کی

یوم میرٹھی نے کہیں کہیں سفلی لفظوں کو بھی اپنے مزاحیہ شعروں میں پرو کر قابلِ مطالعہ بنا دیا ہے۔ اس قبیل کے شعروں میں بھی ان کے یہاں روانی، برجستگی اور زبان وبیان کی دلکشی اپنی پوری لطافت وظرافت کے ساتھ موجود ہے۔ مثلاً:

بلا کے مقتل میں عاشقوں کو یہ کہہ کے وہ قتل کررہے ہیں
لو ختم کرتا ہوں آج سالو تمھاری قسمت کا آب ودانہ
پس فنا بھی حرام زادے نے ایسی مٹی خراب کی ہے
کہ جس جگہ تھی ہماری تُربت وہیں بنا یا ہے پاخانہ

کوستا ایسے ہے مردود ہمیشہ مجھ کو
کبھی مانگی نہ دعا غیر کے مرجانے کی
اس سنگدل نے اپنے قدچوں کے واسطے
پتھر منگالیا میرے لوحِ مزار کا
ابے اُلو کے پٹھے قتل کرکے چل دیا مجھ کو
تماشہ دوگھڑی تو دیکھتا تھا رقصِ بسمل کا

یوم میرٹھی نے غزلوں کے علاوہ طویل نظمیں بھی کہی ہیں، اس کے علاوہ انھوں نے معروف شاعروں کے مصرعوں پر تضمینیں بھی کی ہیں۔ قطعات اور رباعیات میں اپنے جوہر دکھائے ہیں۔ ان سب میں ان کے قدرتِ کلام کی خوبیاں

پوری طرح مترشح ہیں۔ انھوں نے مہوشوں، ماہ رخوں، محبوباؤں پر بھی طعنہ زنی کے تیر چلائے ہیں اور کس خوبی، فنکاری اور صناعی سے انھیں ہدفِ ملامت بنایا ہے۔ یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

آتشیں حسن بھرا ہے ترے رخساروں میں
کون منہ مارے دہکتے ہوئے انگاروں میں
ان حسینوں نے اُجاڑیں بستیاں
بوم سالا مفت میں بدنام ہے

بوم میرٹھی کے ہم عصروں کے علاوہ ان کے بعد کے تخلیق کاروں نے بھی ان کے کلامِ فن کا لوہا تسلیم کیا ہے۔ میرٹھ کے مقبول شاعر حفیظ میرٹھی یوں رطب اللسان ہوئے: ”منشی شیر محمد خاں بوم میرٹھی کی شہرت میرٹھ اور اس کے گرد ونواح کے ضلعوں میں ہی نہیں بلکہ پورے ہندوستان میں ہے۔ مشاعروں میں جب ان کو ڈائس پر آکر کلام سنانے کی دعوت دی جاتی تھی تو سامعین ان کا تخلص بوم سن کر ہی بے اختیار ہنس دیا کرتے تھے۔ سلاست اور روانی ان کے کلام کی خاص خوبی ہے، وہ عام بول چال کے لفظوں سے شعر میں حسن پیدا کرنے کے ہنر میں طاق تھے۔“

میرٹھ کے ہی ایک اور مشہور شاعر شمیم جے پوری (جو دراصل میرٹھ ہی کے ہو کر رہ گئے تھے) بوم میرٹھی کے سلسلے میں یوں اظہارِ خیال کرتے ہیں۔ ”1947 سے قبل جب میرا لڑکپن تھا اور شاعری کی ابتدائی منزل میں تھا اس وقت بوم میرٹھی کی شہرت عام تھی۔ ہندوستان کے ہر بڑے مشاعرے میں شرکت کرتے اور ہر محفل میں ان کی قادر الکلامی کا چرچا ہوتا تھا۔ وہ اپنے عہد کے بہت ہی مقبول و مشہور مزاح نگار شاعر سمجھے گئے ہیں۔ افسوس ان کے انتقال کے بعد نہ صرف میرٹھ بلکہ اردو دنیا نے ان کو فراموش کر دیا۔“

بوم میرٹھی کی شاہکار نظموں میں قتلِ تمیزن، رفتارِ زمانہ، اور کماری نامہ نے آزادیِ ہند سے قبل خوب دھوم مچائی تھی۔ ضروری ہے کہ ان کے کلام، اور ان کے مقام کو از سرِ نو عوام کے سامنے لایا جائے تاکہ دبستانِ میرٹھ کے ایک رفتگاں محروم، معصوم، معتبر اور مشہور، بھلا دیے گئے طنز و ظرافت کے شاعر کو کائناتِ اردو میں ایک مقامِ رفیع حاصل ہو سکے اور میخانۂ ظرافت کے متوالوں اور میکدۂ طنز کے دیوانوں کو بوم میرٹھی کے کلام سے آگہی و عرفان اور شناسائی و رغبت حاصل ہو سکے۔ شکر ہے کہ مشہور مزاح نگار شاعر پاپولر میرٹھی نے ان کے کلام کی تلاش و تدوین کا کام شروع کر رکھا ہے اور ان پر پی ایچ ڈی بھی کی ہے۔ اب وہ کلامِ بوم میرٹھی کو بھی کتابی شکل میں سامنے لا رہے ہیں۔ ■

Dr Khalid Husain KharEx Head ofUrdu Deptt Meerut College Meerut UP

مضمون اور کلام سید اعجاز پاپولر میرٹھی کی زیرِ طبع کتاب سے بشکریہ ماخوذ

نمونۂ کلام

جب خزاں آئی چمن میں سب دغا دینے لگے
تنکے اُڑ اُڑ کر نشیمن کا پتہ دینے لگے
جب مری گستاخیوں کی وہ سزا دینے لگے
وصل کی شب لات گھونسہ بھی مزا دینے لگے
آپ تو مانگا کریں تھے میرے مرنے کی دعا
اب لگا مرنے تو جینے کی دعا دینے لگے

بلاتی ہے مجھے گھر پر جو تم گھر پر نہیں ہوتے
تمھاری ماں کو تم سے ہر طرح اچھا سمجھتا ہوں
کسی نے ان سے پوچھا بوم کو تم کیا سمجھتے ہو
تو بولے مسکرا کر اُلّو کا پٹھا سمجھتا ہوں

دھول دھپّا لات گھونسے سے نہ گھبراتا ہوں میں
بے تکلف ان کی محفل میں چلا جاتا ہوں میں

انگریزی پڑھ کے شیخ کی بگڑی ہے وہ زبان
جب ہم کریں سلام تو وہ تھینک یو کریں

جہاں میں لیڈروں کی عیش سامانی نہیں جاتی
کچوری پوریاں اور زردہ بریانی نہیں جاتی

آتشِ حسن سے ماچس کی کفایت ہوگی
سگریٹیں خوب جلیں گی تیرے رخساروں سے

قطعات

کہیں عزت کہیں بے عزتی سے انقلاب آیا
کہیں جوتے پڑے سر پر کہیں جامِ شراب آیا
اجی چھوڑو انھیں تم اپنے ہی دل کی طرف دیکھو
زُلیخا کی طرح سے پھر بڑی بی پر شباب آیا

جاں دے کے سپوتوں نے کیا ہے اسے حاصل
آزادی کوئی لوٹ کا سامان نہیں ہے
ہر شخص یہ کہتا ہے مجھے دو مرا حصہ
یہ ملک ہے حلوائی کی دکان نہیں ہے

مفلسی یہ بھی رنگ لائی ہے
نہ بچھونا نہ چارپائی ہے
سات بچے ہیں دو میاں بیوی
آدمی تو ہیں ایک رضائی ہے

خدا کے فضل سے غارت مصیبت ہونے والی ہے
کہ حاصل کوئی دن میں عیش و عشرت ہونے والی ہے
دعائیں مانگتا ہوں اس لیے باوا کے مرنے کی
کہ جو دولت ہے ان کی مابدولت ہونے والی ہے



خمسہ

ذرا کچھ صبر کرتی دردِ الفت کا مزا لیتی
کنوئیں میں ڈوب مرتی یا منگا کر زہر کھا لیتی
کسی گوشے میں یونہی بیٹھ کے نامِ خدا لیتی
مزا جب تھا زلیخا جا نماز اس کی بنا لیتی
'جو ٹکڑا رہ گیا تھا ہاتھ میں یوسف کے داماں کا'

'شہر آشوب'

سناتا ہوں تمھیں اس وقت جو دنیا کی حالت ہے
جہاں میں جس قدر بھی قوم ہیں سب پر مصیبت ہے
رئیسوں کا نہیں کچھ ذکر محتاجوں پہ آفت ہے
جو رشتہ دار آسودہ ہیں ناداروں سے نفرت ہے

بوقتِ تنگدستی آشنا بیگانہ می گردد
صراحی چوں شود خالی جدا پیمانہ می گردد

بگڑتے ہی ہمارا کام بیوی رامپور پہنچی
ہوا اماں کو جب فاقہ تو سیدھی دھامپور پہنچی
بہن بھی ساتھ لے دولھا کو اپنے شاہپور پہنچی
چچا تھے فوج میں نوکر چچی بلرام پور پہنچی

بوقت، تنگدستی آشنا بیگانہ می گردد
کوئی بگڑا جوئے میں اور کوئی کوکین کھانے میں
پڑا رہتا ہے دن اور رات کوئی چانڈو خانے میں
نشہ بازوں کا جی لگتا نہیں کھانے کمانے میں
رضائی اور جوتے بک رہے ہیں دو دو آنے میں

بوقتِ تنگدستی آشنا بیگانہ می گردد
یہ سچی بات لکھی ہے یہ سچا حال لکھا ہے
بتائے جو اسے جھوٹا وہ خود دنیا میں جھوٹا ہے
بہت ہی مجھ کو اس غربت میں غربت کا تجربہ ہے
کوئی اپنا نہیں ہے بوم سب مطلب کی دنیا ہے

بوقتِ تنگدستی آشنا بیگانہ می گردد
صراحی چوں شود خالی جدا پیمانہ می گردد

تضمین

مرقد دشمن کی جانب پھول لے کر تم چلے
میری تُربت پر جو آئے دور سے پھینکے ڈلے
اس حرامی کی لحد پر رات بھر ہنڈے جلے
برمزارِ ماغریباں نے چراغے نے گلے
نے پر پروانہ سوزد نے صدائے بُلبلے



پرویز احمد

ڈجیٹل ڈیوائڈ: دنیا کی ایک اور سماجی تقسیم؟

لفظ تقسیم کسی کے لیے بھی نیا نہیں ہے۔ سب لوگ اس لفظ کو اپنے اسکول کے زمانے سے جانتے ہیں۔ معلوم نہیں کہ لوگوں کا اس لفظ کے ساتھ کیسا تجربہ رہا ہے لیکن مجھے تو یہ لفظ بہت بھیانک لگتا ہے۔ میں اس لفظ سے متنفر ہوں۔ اس لفظ کو پڑھنے سے میری آنکھیں نفرت کرتی ہیں، میرا دماغ اس کو قبول نہیں کرتا ہے، میرے لب اسے ادا نہیں کر سکتے ہیں، میرے کان اسے سننے سے گریز کرتے ہیں۔ ایسے کلمات جو نہ ہی تقسیم، لوگوں کی تقسیم، ملکوں کی تقسیم سے تعلق رکھتے ہیں یا وہ اصطلاحات جیسے تقسیم کرو اور حکومت کرو زیر کر دیمرے اعصاب پر بہت گراں گزرتی ہیں۔ میری اذیت کے لیے یہ پرانی اصطلاحات ہی کیا کم تھیں کہ انفارمیشن ٹکنالوجسٹ نے ایک نئی اصطلاح ڈجیٹل ڈیوائڈ گھڑلی۔ آپ سوچتے ہوں گے کہ میرے لیے یہ نئی اصطلاح اتنی اذیت ناک کیوں ہے؟ وہ اس لیے کہ اس میں ایک لفظ ڈجیٹل ہے۔ یوں تو یہ لفظ ڈجیٹل نیا نہیں ہے لیکن اس اصطلاح میں شامل ہونے سے اس کے معنی بدل گئے ہیں۔ میری اذیت کا راز جاننے کے لیے لفظ ڈجیٹل کے نئے مفہوم کو سمجھنا ضروری ہے۔

دراصل لفظ ڈجیٹل اس دور کی سب سے اہم ایجاد کمپیوٹر سے منسوب ہے۔ کمپیوٹر سسٹم کے دو حصے ہوتے ہیں۔ ایک حصے کو ہارڈ ویئر اور دوسرے کو سافٹ ویئر کہتے ہیں۔ کمپیوٹر ہارڈ ویئر ڈجیٹل سرکٹ کا مجموعہ ہوتا ہے۔ ڈجیٹل سرکٹ میں الیکٹریکل سگنل کی موجودگی اور غیر موجودگی کو دو عدد صحیح صفر (0) اور واحد (1) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ واحد سے مراد الکٹریکل سگنل کی موجودگی ہوتی ہے اور صفر سے مراد سگنل کی غیر موجودگی۔ ریاضی کے ماہرین نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ صرف صفر اور واحد سے انسان کی

ہر فکر کا چربہ اتارا جاسکتا ہے اور اسے ڈیجیٹل سرکٹ کے استعمال سے کمپیوٹر میں نقش کیا جاسکتا ہے بشرطیکہ فکر کے بنیادی اجزا معلوم ہوں۔ مثال کے طور پر اگر کسی فکر کی صفت ایک جز سے بیان کی جاسکتی ہے تو جز کی موجودگی کو واحد سے اور غیر موجودگی کو صفر سے ظاہر کیا جاسکتا ہے اور اگر صفات دو اجزا سے بیان کی جاسکتی ہیں تو اس کی چار صورتیں ہوں گی: پہلی صورت دونوں اجزا کی موجودگی، دوسری صورت پہلے جز کی موجودگی دوسرے کی غیر موجودگی، تیسری صورت پہلے جز کی غیر موجودگی اور دوسرے کی موجودگی اور چوتھی صورت دونوں اجزا کی غیر موجودگی سے ظاہر کی جاسکتی ہے۔ اسی طرح سے اگر فکر کی بنیاد تین اجزا پر ہے تو اس فکر کی صفات کی آٹھ صورتیں ہوں گی اور اگر فکر کی بنیاد چار اجزا پر ہیں تو اس کی صفات کی سولہ صورتیں ہوں گی۔ غرضیکہ فکر اور اس کے اجزا معلوم ہوں تو اس کی صفات کو اجزا کی موجودگی اور غیر موجودگی کی بالترتیب پیونڈ کاری سے پیش کیا جاسکتا ہے۔ ذیلی مثال علم عروض سے ہے۔ اس مثال کے انتخاب کی وجہ صرف یہ ہے کہ علم عروض کی فکر بہت سادہ ہے۔

علم عروض کے موجد ابوعبدالرحمٰن خلیل بن احمد بصری کی فکر کا بنیادی جز حرف ہے جس کی دو صفات ہوسکتی ہیں: متحرک یا ساکن۔ لیکن ایک وقت میں صرف ایک ہی صفت ہوگی۔ اس بنیاد پر کسی بھی دو حرفی کلمہ کی چار



ڈیجیٹل ٹیکنالوجی سے دنیا کی دو حصوں میں وہ تقسیم بھی مراد لی جاتی ہے جس میں ایک کی آبادی ڈیجیٹل تکنولوجی کا فیض اٹھا رہی ہے اور دوسری اس سے محروم ہے

صورتیں ہوسکتی ہیں اور وہ ہیں (متحرک متحرک)، متحرک ساکن)، (ساکن متحرک) اور (ساکن ساکن)۔ ان صورتوں کو واحد (۱) اور صفر (۰) سے بتدریج یوں (۱ ۱)، (۰۱)، (۱ ۰) اور (۰ ۰) پیش کیا جاسکتا ہے جس میں صرف (متحرک متحرک) یعنی (۱۱) اور (متحرک ساکن) یعنی (۱ ۰) ہی ممکن ہے۔ دیگر دو صورتوں میں دو حرفی کلمہ کا بننا ممکن نہیں ہے۔ علم عروض کے مطابق جس دو حرفی لفظ میں پہلا حرف متحرک اور دوسرا ساکن ہوتا ہے وہ سبب خفیف کہلاتا ہے اور اسے یوں (۱ ۰) پیش کیا جاسکتا ہے۔ تین حرفی کلمہ کی آٹھ صورتیں ہوں گی اور وہ ہیں (۱۱۱)، (۱۱۰)، (۱۰۱)، (۱۰۰)، (۰۱۱)، (۰۱۰)، (۰۰۱) اور (۰۰۰)۔ اس میں (۱ ۱ ۰) اس کو عروض کی زبان میں وتد مجموع کہتے ہیں اور (۱۰۱) کو وتد مفروق ہے۔ چار حرفی کلمہ کی سولہ صورتیں ہوں گی اس میں (۱۱۱۱) کو فاصلہ صغریٰ کہتے ہیں۔ انھیں بنیادی صورتوں کی بالترتیب پیونڈ کاری سے ارکان بنتے ہیں۔ مثلاً رکن فعولن وتد مجموع (۱۱۱) اور سبب خفیف (۱۱) کی بالترتیب پیونڈ کاری سے بنا ہے جسے کمپیوٹر کی ڈیجٹل سرکٹ میں (۱ ۱ ۱ ۰ ۱) سے پیش کیا جاسکتا ہے۔ یا فاعلن جو سبب خفیف اور وتد مجموع کی بالترتیب پیونڈ کاری سے بنتا ہے اس کو کمپیوٹر کے ڈیجیٹل سرکٹ میں (۱ ۰ ۱ ۰ ۱) کے روپ میں پیش کیا جاسکتا ہے۔ اسی طرح سے بھی ارکان واحد اور صفر کے استعمال سے پیش کیے جاسکتے ہیں۔

سافٹ ویئر بھی واحد اور صفر سے کمپیوٹر کے ڈیجیٹل سرکٹ کو پیش کیا جاتا ہے۔ سافٹ ویئر ہدایتوں کا مجموعہ ہوتا ہے۔ ہدایتوں سے مراد کمپیوٹر کو یہ تعلیم دینا کہ اسے کیا عمل کرنا ہے۔ کمپیوٹر ایک وقت میں ایک ہی ہدایت کو انجام دیتا ہے۔ ایک ہدایت کے مکمل ہونے پر ہی دوسری ہدایت پر کام کرتا ہے۔ ہر ہدایت صفر اور واحد کا مختلف سلسلہ ہوتی ہے اور سافٹ ویئر صفر اور واحد کا ایک طویل سلسلہ ہے اور اسے ڈیجیٹل سرکٹ کے ذریعے کمپیوٹر میں پیش کیا جاتا ہے۔ ایک اور شے ہدایتوں پر عمل کرنے کے



ڈیجیٹل سرکٹ میں الیکٹریکل سگنل کی موجودگی اور غیر موجودگی کو دو اعداد صفر (۰) اور واحد (۱) سے تعبیر کیا جاتا ہے

لیے درکار ہوتی ہے اور وہ ہے آنکڑہ۔ کمپیوٹر ہدایتوں پر عمل کرنے کے لیے آنکڑوں کا استعمال کرتا ہے اور آنکڑے بھی صفر اور واحد کے سلسلے سے کمپیوٹر میں پیش کیے جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر اگر ہم کمپیوٹر سے یہ جاننا چاہیں کہ لفظ مضطرب میں کتنے ارکان ہیں تو ہم کو کمپیوٹر کو پوری ہدایت دینی ہوگی کہ وہ کس طرح ارکان کا پتہ لگائے۔ اس کے لیے جو آنکڑے چاہیے ہوں گے اسے بھی کمپیوٹر کو پیش کرنا ہوگا۔ اس کام کو کرنے کے لیے دو طرح کے آنکڑوں کی ضرورت ہوگی: ایک تو ارکان کی فہرست اور دوسرا لفظ مضطرب کا صفر اور واحد کا سلسلہ جیسے کہ 01101۔ فرض کریں فہرست میں ارکان کا نام اور اس کا صفر و واحد کا سلسلہ پہلے سے موجود ہے تو ارکان کو معلوم کرنے کے لیے ہدایتوں کا مجموعہ کچھ یوں ہوگا:

ہدایت1: شروع

ہدایت2: فہرست کو کمپیوٹر میں لاؤ۔

ہدایت3: لفظ مضطرب کو پڑھو۔

ہدایت4: جو لفظ پڑھا ہے اس میں متحرک اور ساکن حروف کو الگ کرو۔

ہدایت5: ساکن کو صفر اور متحرک کو واحد میں تبدیل کر کے صفر اور واحد کے سلسلے کی شکل پیش میں کرو۔

ہدایت6: ارکان کی فہرست میں لفظ مضطرب کے صفر و واحد کے سلسلے کو تلاش کرو۔

ہدایت7: اگر مل جائے تو فہرست میں تلاش ختم کر دو اور ہدایت 10 کرو۔

ہدایت8: اگر نہیں ملتا ہے تو ہدایت 6 اس وقت تک جاری رکھو جب تک لفظ مل نہ جائے یا فہرست ختم نہ ہو جائے۔

ہدایت9: اگر فہرست ختم ہو گئی ہے اور لفظ نہیں ملا ہے تو لکھو "لفظ مضطرب کے ارکان فہرست میں نہیں ہیں" اور ہدایت 11 کرو۔

ہدایت10: لفظ مضطرب کے ارکان بتاؤ۔

ہدایت11: ختم۔

اس مثال سے ظاہر ہے کہ ایسے سافٹ ویئر بنائے جا سکتے ہیں جو تصحیح کر سکتے ہوں یا خود اشعار کہہ سکتے ہوں لیکن اس کے لیے شرط ہے کہ تصحیح کے اصولوں کو یا شعر کی ساخت اور شعر کہنے کے موضوعات و محرکات کو سافٹ ویئر کے روپ میں ڈھالا جائے۔ یہ کوئی آسان کام نہیں ہے لیکن ناممکن بھی نہیں ہے مگر اس کے لیے ہمیں سافٹ ویئر بنانے کے بنیادی سائنسی اصولوں کو سمجھنا ہوگا اور ایسے موثر طریقہ کار دریافت کرنے ہوں گے جس کے ذریعے ہم کمپیوٹر کو واضح ہدایات دے سکیں۔

سافٹ ویئر بنانے کا سلسلہ الگوردم Algorithm بنانے سے شروع ہوتا ہے۔ اوپر ہدایات کا جو نمونہ پیش کیا گیا ہے وہ ایک الگوردم ہے۔ الکتاب الجبر و مقابلہ کے مصنف محمد ابن موسیٰ ابوجعفر الخوارزمی نے ریاضی کے مسائل کو مرحلہ وار حل کرنے کا جو طریقہ ایجاد کیا وہ الخوارزمی کہلایا۔ الگوردم اسی لفظ الخوارزمی کی بدلی ہوئی شکل ہے۔ الگوردم بنانے کے لیے منظم اور منصوبہ ساز ذہن چاہیے جو مسئلے کو سمجھے اور اسے چھوٹی چھوٹی اکائیوں میں تقسیم کرے۔ ان اکائیوں کو ایک ایک کر کے اس طرح حل کرے کہ مسئلے کا حل نکل آئے۔ اوپر کی مثال میں ارکان تلاش کرنے کے مسئلے کو ۱۱ اکائیوں میں تقسیم کیا گیا ہے اور ہر اکائی کو حل کرنے سے ہی مسئلہ حل ہوگا۔ الگوردم بنانے کے بعد اس کو اس زبان میں پیش کرنا جو کمپیوٹر سمجھ سکے یہ سافٹ ویر بنانے کا دوسرا قدم ہے۔ اس مقصد کے لیے کمپیوٹر کی زبانیں بنائی جاتی ہیں جو انسانی سوچ کو کمپیوٹر میں بآسانی منتقل کر سکیں۔ آج ایسی زبانیں ایجاد کی جا چکی ہیں جو ہر طرح کی سوچ کو کمپیوٹر میں منتقل کرنے میں کافی مددگار ثابت ہو رہی ہیں جس کی وجہ سے نئے نئے کمپیوٹر سافٹ ویئر ممکنات کے نئے افق اجاگر کر رہے ہیں اور یہ خیال کیا جا رہا ہے کہ کمپیوٹر سے ہر وہ کام لیا جا سکتا ہے جس کو ایک انسانی ذہن سوچ سکتا ہے اور ہم دیکھ بھی رہے ہیں کہ کمپیوٹر آج سہل ترین کام مثلاً فہرست بنانے سے لے کر مشکل ترین کام خود کار آلات سے ہوائی جہاز کو اڑانے کا کام کر رہے ہیں۔

کیا ہم نے کبھی سوچا ہے کہ وہ کون لوگ ہیں جو کمپیوٹر سازی کر رہے ہیں۔ ہم میں سے کتنے لوگوں نے اس اہم مسئلے پر غور کیا ہے یا کر رہے ہیں۔ میرے خیال میں بہت ہی کم لوگ ایسے ہوں گے۔ اس بے توجہی کی وجہ ہماری لاعلمی ہے۔ ہماری اس ٹکنالوجی کے بارے میں لاعلمی ہی ڈیجیٹل ڈیوائڈ کی پہلی لائن ہے۔ اس لائن کے ایک طرف وہ اقوام



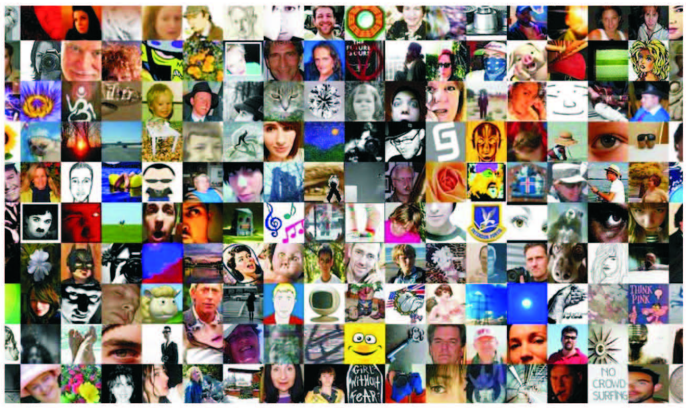

انسان ٹکنولوجی خطوط کی بنیاد پر تقسیم ہوں گے اور ننی زبان میں وہ ٹکنومفکر، ٹکنو منصوبہ ساز، ٹکنو مزدور کہلائیں گے

ہیں جو اس علم میں آپ اپنی مثال ہیں اور دوسری طرف وہ اقوام ہیں جو اس کے بنیادی اصولوں سے بے بہرہ ہی نہیں بلکہ انھیں اندازہ ہی نہیں ہے کہ یہ ٹکنالوجی کس طرح ان کے سیاسی، ثقافتی سماجی اور معاشی ڈھانچے کا شیرازہ بکھیر رہی ہے۔ سماجی اور معاشی نقطۂ نظر سے یہ دنیا کے سماج کو پروڈیوسر اور کنزیومر سماج میں تقسیم کررہی ہے۔ پروڈیوسر وہ لوگ ہیں جو نت نئے کمپیوٹرز ایجاد کررہے ہیں اور اس کے بھانت بھانت کی ایپلی کیشنز ریلیز کررہے ہیں۔ کنزیومر وہ لوگ ہیں جو صرف اس کا استعمال کررہے ہیں۔ پروڈیوسرز دن بہ دن آقا اور کنزیومرز غلام بنتے جارہے ہیں۔ الغرض یہ ٹکنالوجی انسانی سماج کے درمیان ایک ایسی لائن کھینچ رہی ہے جس کے ایک طرف آقا اور دوسری طرف غلام ہوں گے۔

بدقسمتی سے آقا وغلام کی تقسیم بہت خطرناک ہے۔ سماجیات کے ماہرین کا کہنا ہے کہ یہ ڈیوائڈ ہندو منووادی طرح مستقبل کے سماج کو ایک نیا ورن سسٹم دے رہا ہے جس میں انسانوں کو ٹکنو برہمن، ٹکنو چھتریہ، ٹکنو ویش اور ٹکنو شودر میں بانٹا جائے گا، اور ٹکنالوجی کی زبان میں انھیں ٹکنو مفکر، ٹکنو منصوبہ ساز، ٹکنو مزدور اور ٹکنو استعمالی کہا جائے گا۔ ٹکنو مفکر وہ لوگ ہوں گے جو نئی سوچ کو جنم دیں گے۔ ٹکنو منصوبہ ساز وہ لوگ ہوں گے جو نئی سوچ سے نئے پروڈکٹ کی ڈیزائن تیار کریں گے۔ ٹکنو مزدور وہ لوگ ہوں گے جو ان ڈیزائن سے نئے پروڈکٹ تیار کریں گے اور ٹکنو استعمالی ان پروڈکٹ کو استعمال کریں گے۔ آج کے حالات کو دیکھتے ہوئے مجھے اس ورن سسٹم میں دو جاتیاں اور نظر آرہی ہیں وہ ٹکنو تماشائی اور ٹکنو غافل ہیں۔ ٹکنو تماشائی وہ لوگ ہیں جو یہ تو سمجھتے ہیں کہ کوئی نیا تماشا ہو رہا ہے لیکن وہ اسے سمجھنے سے قاصر ہیں۔ ٹکنو غافل وہ لوگ ہیں جن کو یہ بھی پتہ نہیں ہے کہ کوئی تماشا ہو بھی رہا ہے یا نہیں۔

یہاں پر میں پھر اس ٹکنالوجی کے سماجی اور معاشی اثرات کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ یہ ٹکنالوجی انسانی تاریخ میں ایک نیا انقلاب لارہی ہے۔ یہ انڈسٹریل سوسائٹی کو انفارمیشن سوسائٹی بنا رہی ہے، اقتدار حاصل کرنے کے نئے مواقع فراہم کررہی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مستقبل میں کمپیوٹر سے انفارمیشن اور نالج کو کنٹرول کرکے سوسائٹی میں بالادستی اور اقتدار کو قائم کرنا ہی مرکزی نقطۂ نظر ہوگا کیوں کہ پرانے مرکزِ اقتدار، چاہے وہ گورنمنٹ کے ادارے ہوں، تعلیمی ادارے ہوں، صنعتی ادارے ہوں، اقتصادی ادارے ہوں یا حربی ادارے ہوں سب متاثر ہورہے ہیں۔ کمپیوٹر سافٹ ویئرس نالج کو بتدریج جمہوری بنا رہے ہیں اور عام انسانوں تک پہنچا رہے ہیں۔ لیکن اس میں سب سے زیادہ اہمیت کا حامل نالج کا اقتصادی پہلو ہے کیونکہ نالج سے جو دولت حاصل ہورہی ہے اس میں صرف ذہین دماغوں کا استعمال ہورہا ہے جو کسی بھی روایتی توانائی جیسے تیل یا جوہری توانائی کا محتاج نہیں ہے۔ ابوعبدالرحمٰن خلیل بن احمد بصری کے علم عروض اور دوسری الخوارزمی کے کام سے عیاں ہے کہ یہ ذہین دماغ ہمارے پاس تھے لیکن ہم اسڈ جینئل ڈوائڈ کی سب سے نچلی سطح پر تماشائی بنے کھڑے ہیں۔ یہ بہت ہی بھیانک بات ہے۔ ہمیں اسڈ جینئل ڈوائڈ سے کچھ حاصل نہیں ہورہا ہے۔ موجودہ صورت حال یہ ہے کہ امریکیوں کا اس میں 70 فیصدی سے زیادہ حصہ ہے۔ مائکروسافٹ جو ایک امریکن کمپنی ہے وہ اکیلے اتنے سافٹ ویئرز بنا رہی ہے جتنا کہ 100 ممالک مل کر بھی نہیں بنا پارہے ہیں۔ ہمیں اس سے گھبرانا نہیں چاہیے۔ ہم بھی اس میں حصہ لے سکتے ہیں لیکن شرط یہ ہے کہ ہم ایک اچھا تعلیم یافتہ معاشرہ بنا سکیں جس میں ذہانت کو پروان چڑھنے کے بھرپور مواقع ہوں۔ ہمارا تعلیمی نظام انفارمیشن ٹکنالوجی کی ضرورت سے ہم آہنگ ہو۔ ہم روزگار سے جڑے روایتی نظام تعلیم کو ترک کرکے ایسا نظام رائج کریں جو ایسے مفکر پیدا کریں جو فردا کے اجالوں کو دیکھ سکیں اور آنے والے کل میں رونما ہونے والے واقعات کی نشاندہی کرسکیں:

جھانکنا ہے پرے اجالوں کے
روشنی کے سفر سے آگے چل

Dr. Pervez Ahmad, Head Society of Muslim Computer Scientist and Computer Professions, 10 Alig Shopping Complex, Shamshad Market, Aligarh UP



خورشید اقبال

اپنی ویب سائٹ کیسے بنائیں -2

گزشتہ قسط میں، میں نے آپ کو HTML کی بنیادی ساخت کے بارے بتایا تھا۔اس کے علاوہ آپ کو لائن بریک، ہیڈ اگراف اور فونٹ کلر کے Tags کے بارے میں بھی بتایا تھا۔امید ہے آپ نے خوب مشق کی ہوگی اور ہلکے پھلکے ویب پیج بنانا سیکھ گئے ہوں گے۔ آیئے اب آپ کو پیڈنگ اور Tags کے بارے میں بتاتا ہوں۔

رنگوں کا استعمال :

ابھی تک آپ نے جو بھی ویب پیج ڈیزائن کیے ہیں ان کے صفحات سفید تھے۔اگر آپ چاہتے ہیں کہ آپ کے ویب پیج کا بیک گراؤنڈ کسی خاص رنگ کا ہو تو آپ کو درج ذیل کمانڈ دینا ہوگا۔

آپ پیج کے HTML کوڈ میں <body> ٹیگ میں bgcolor لکھ کر برابر کا نشان (=) دیں اور اس رنگ کا نام لکھ دیں جسے آپ بیک گراؤنڈ میں دینا چاہتے ہیں۔مثال کے طور پر اگر آپ چاہتے ہیں کہ آپ کے ویب پیج کا بیک گراؤنڈ لال رنگ کا ہو تو <body> ٹیگ میں bgcolor=red لکھ دیں۔ساتھ ہی اگر آپ چاہتے ہوں کہ اس ویب پیج کے تمام حروف سفید رنگ سے لکھے جائیں تو اسی کے ساتھ ایک space دے کر text=white بھی لکھ دیں۔یعنی پورا کمانڈ یوں لکھا جائے گا: (اسپیلنگ کا خاص خیال رکھیں)

```
<body bgcolor=red text=white>
```

مشق کریں:

نوٹ پیڈ میں ایک HTML پروگرام یوں لکھیں:

```
<html>
  <head>
  <title> My Color Page</title>
  </head>
  <body bgcolor=red text=white >
    India is great .
  </body>
</html>
```

اب اسے گزشتہ قسط میں بتائے گئے طریقے سے html فائل کے طور پر save کریں۔

اب جب آپ اس html فائل کو open کریں گے تو وہ انٹرنیٹ ایکسپلورر میں کھلے گا۔آپ دیکھیں گے کہ پورا صفحہ سرخ ہے اور India is great. سفید رنگ سے لکھا ہوگا۔

مندرجہ بالا مثال میں آپ رنگوں کو تبدیل کر کے بار بار مشق کریں۔

ہمیشہ یاد رکھیں:

انگریزی میں ہم لوگ عام طور سے COLOUR لکھتے ہیں جو انگریزی لکھنے کا برطانوی طریقہ ہے مگر انٹرنیٹ کی دنیا میں امریکی طریقہ استعمال ہوتا ہے اور COLOR لکھا جاتا ہے۔HTML میں آپ ہمیشہ COLOR لکھیں، COLOUR لکھیں گے تو غلط ہو جائے گا۔

HTML کوڈ میں بنیادی رنگوں کے نام تو آپ براہ راست لکھ سکتے ہیں جیسے:

Black	Gray	Silver	White
Yellow	Lime	Aqua	Fuchsia
Red	Green	Blue	Purple
Maroon	Olive	Navy	Teal

لیکن ان رنگوں کے علاوہ بھی بے شمار رنگ ہیں بلکہ ہم ویب پیج ڈیزائن میں اکثر رنگوں کے مختلف ہلکے شیڈز استعمال کرتے ہیں۔ان رنگوں کا استعمال تھوڑا پیچیدہ ہے اور شروع شروع میں آپ کو کافی مشکل بھی محسوس ہوگا۔ لیکن گھبرانے کی بات نہیں تھوڑی سی مشق سے آپ بہت جلد ان کے استعمال پر قادر ہو جائیں گے۔اس لئے تھوڑی سنجیدگی سے سمجھنے کی کوشش کریں۔

پہلی اہم بات تو یہ ہے کہ کمپیوٹر کے اسکرین پر ہم جو بھی رنگ دیکھتے ہیں وہ دراصل صرف تین بنیادی رنگوں کے ملنے سے بنتے ہیں۔کمپیوٹر کے یہ تین بنیادی رنگ ہیں سرخ (Red) ، سبز (Green) اور نیلا (Blue) ۔ انہیں ہم علامتی طور پر RGB کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ انہی تینوں رنگوں کے مختلف انداز سے آپس میں ملنے سے بے شمار رنگوں کے شیڈز بنتے ہیں جنہیں آپ اسکرین پر دیکھتے ہیں۔

دوسری اہم بات یہ ہے کہ ان رنگوں کی کے مختلف شیڈز کو 0 سے 255 نمبروں سے ظاہر کیا جاتا ہے۔ 0 کا مطلب ہے کہ وہ رنگ بالکل موجود نہیں ہے اور 255 کا مطلب ہے کہ وہ رنگ اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ موجود ہے۔اس رنگ کے باقی سارے شیڈ 0اور 255 کے درمیان ہوتے ہیں۔نمبر شار جس قدر بڑھتا جائے گا رنگ اتنا ہی تیز ہوتا جائے گا۔

میرا خیال ہے مندرجہ دونوں باتیں آپ کی سمجھ میں آگئی ہیں۔ایک بار پھر سمجھ لیجئے۔

(۱) اسکرین پر نظر آنے والا ہر رنگ دراصل تین رنگوں (سرخ، سبز اور نیلا) سے مل کر بنتا ہے۔

(۲) ان میں سے ہر رنگ کی شدت 0 سے 255 کے درمیان ہوتی ہے نمبر جتنا بڑھتا جائے گا رنگ اتنا ہی تیز ہوتا جائے گا۔

اب آگے.....!

اسکرین پر سرخ رنگ نظر آنے کا مطلب ہے کہ اس میں سرخ رنگ کی ویلیو 255 ہے جب کہ سبز اور نیلے رنگ 0 ہیں۔ ویسے ہی نیلے رنگ کا مطلب ہے کہ اس میں سرخ اور سبز کی ویلیو 0 ہیں جب کہ نیلے رنگ کی ویلیو 255 ہے۔سبز کے معاملے میں سبز کی ویلیو 255 ہوگی اور نیلا اور سرخ رنگ 0 ہوں گے۔

سیاہ رنگ نظر آنے کا مطلب ہے کہ تینوں میں سے کوئی بھی رنگ وہاں موجود نہیں ہے اس لئے تینوں بنیادی رنگ 0،0،0 ہوں گے۔

سفید رنگ اسی وقت ظاہر ہوتا ہے جب تینوں بنیادی رنگ مکمل تیزی کے ساتھ آپس میں مل جائیں۔ اس لئے سفید رنگ میں سرخ، نیلے اور سبز رنگوں کی ویلیو 255،255،255 ہوگی۔

باقی سارے شیڈز انہیں رنگوں کے مختلف مقدار میں ملنے سے بنتے ہیں۔مثال کے طور پر گلابی رنگ میں سرخ کی ویلیو 240، سبز کی ویلیو 40 اور نیلے رنگ کی

ویلیو120 ہوتی ہے۔

چلئے کمپیوٹر میں بگڑ آنے والے رنگوں کا نظام تو آپ کی سمجھ میں آگیا۔اب اس سلسلے کی ایک آخری بات بھی سمجھ لیجئے۔

HTML میں رنگوں کے نام کی جگہ ان کی ویلیو لکھی جاتی ہے لیکن ان کو لکھنے کا ایک خاص طریقہ ہے جسے Hexadecimal system کہتے ہیں۔میں اس سسٹم کی تکنیکی تفصیلات میں نہیں جانا چاہتا۔صرف اتنا سمجھ لیں کہ ہم روزمرہ کی زندگی میں جو نمبر سسٹم استعمال کرتے ہیں اس کی بنیاد دس اعداد پر قائم ہے یعنی 0 سے 9 [Decimal system]۔لیکن HTML میں استعمال ہونے والے نمبر سسٹم کی بنیاد 16 اعداد پر قائم ہوتی ہے۔

0,1,2,3,4,5,6,7,8,9,A,B,C,D,E,F

زیادہ تفصیلات میں نہ جائیں بس اتنا سمجھ لیں کہ اس نمبر سسٹم کے مطابق FF کا مطلب 255 ہوتا ہے۔

اس نمبر سسٹم کے مطابق HTML میں کسی بھی نمبر کا کوڈ لکھنے کے لئے چھ اعداد یا حروف کا استعمال کرتے ہیں۔پہلے دو اعداد یا حروف RED کے لئے، بعد کے دو GREEN کے لئے اور آخری دو BLUE کے لئے۔

مندرجہ بالا طریقے کے مطابق سفید رنگ کا کوڈ ہوگا FFFFFF ، سیاہ رنگ کا کوڈ ہوگا 000000 ، سرخ رنگ کا کوڈ ہوگا FF0000 ، سبز رنگ کا کوڈ ہوگا 00FF00 ، نیلے رنگ کا کوڈ ہوگا 0000FF۔

باقی سارے رنگوں کے شیڈز کے لئے بھی ویسے ہی مختلف ویلیو ہوں گے جیسے ٹیلرنگ کے مختلف شیڈز ہیں 003399 ،000099 ،0000CC ،0000FF ،0033CC ،0033FF ،0066CC ،0066FF ،0099FF ،00CCFF اور 00FFFF وغیرہ۔یوں ہی ہر رنگ کا اپنا ایک کوڈ ہے۔آپ کو جو رنگ استعمال کرنا ہو اس کا صرف کوڈ لکھنا ہوگا وہ رنگ ظاہر ہو جائے گا۔

سسٹم تو آپ کی سمجھ میں آگیا ہوگا۔اب سوال یہ ہے کہ مختلف رنگوں کے کوڈ آپ کو کیسے معلوم ہوں گے؟ گھبرانے کی بات نہیں۔ جیسے جیسے آپ پریکٹس کرتے جائیں گے،مختلف کوڈ آپ کو یاد ہوتے جائیں گے۔

رنگوں کے Hex Codes آپ مندرجہ ذیل ویب سائٹس سے بھی معلوم کر سکتے ہیں۔

http://html-color-codes.info/
http://cloford.com/resources/colours/500col.htm
http://www.computerhope.com/htmcolor.htm

اب آیئے رنگوں کے ان کوڈز کا عملی استعمال کریں۔

HTML کے درمیان جب بھی کسی رنگ کا کوڈ لکھنا ہو تو اس کے پہلے # کا نشان لگا دیا جاتا ہے۔ آپ کے کی بورڈ میں اوپر کی جانب جو نمبر بٹن ہیں ان میں سے 3 نمبر کے بٹن کو Shift کے ساتھ دبائیں گے تو یہ نشان بنے گا۔



اب آپ نے جو HTML پروگرام ٹائپ کیا تھا اسی میں تھوڑی تبدیلی کیجئے: Red کی جگہ #FF0000 اور White کی جگہ #FFFFFF

```
<html>
  <head>
  <title> My Color Page</title>
  </head>
  <body bgcolor=#FF0000text=
#FFFFFF >
    Indie is great .
  </body>
</html>
```

اس فائل کو نئے نام سے save کریں۔جب آپ اسے open کریں گے تو دیکھیں گے کہ پہلے کی طرح اس ویب پیج کا بیک گراؤنڈ بھی سرخ ہے اور حروف سفید ہیں۔فرق صرف یہ ہے کہ پہلے آپ نے رنگوں کے نام یعنی Red اور White استعمال کئے تھے لیکن اس بار آپ نے رنگوں کے کوڈ یعنی FF0000 # اور #FFFFFF استعمال کیے ہیں۔

اب آپ مختلف ویب پیجز بنائیں اور ان میں مختلف کوڈ لکھ کر بیک گراؤنڈ اور حروف کے رنگ بدل بدل کر مشق کریں۔

Fonts کا بیان :

آپ یہ تو جانتے ہی ہیں کہ کمپیوٹر میں کسی بھی زبان کے حروف مختلف اسٹائل میں پائے جاتے ہیں انہیں ہم Fonts کہتے ہیں ۔فونٹس مختلف ناموں سے جانے جاتے ہیں جیسے انگریزی کے مشہور فونٹس کے نام Arial, Verdana, Calibary, Tohama وغیرہ ہیں۔آپ کے کمپیوٹر میں بیک وقت کئی سو فونٹس Installed ہو سکتے ہیں۔

ایک بات یاد رکھیں کہ ویب پیج بناتے وقت ان تمام فونٹس کا استعمال نہیں کیا جا سکتا ہے کیونکہ کوئی ضروری نہیں ہے کہ جو فونٹس آپ کے کمپیوٹر میں موجود ہوں وہ دنیا کے ان تمام لوگوں کے کمپیوٹر میں بھی موجود ہوں، جو آپ کے ویب پیج کو دیکھیں گے۔

آپ اگر اپنے ویب پیج میں کوئی ایسا فونٹ استعمال کریں گے جو بہت سارے دوسرے لوگوں کے کمپیوٹر میں موجود نہیں ہوں گے تو انہیں آپ کی ویب سائٹ دیکھنے میں پریشانی ہو سکتی ہے۔ان کا کمپیوٹر ان فونٹس کو کسی ایسے فونٹ میں تبدیل کر کے دکھائے گا جو ان کے کمپیوٹر میں موجود ہوگا۔اس طرح آپ کا ویب ڈیزائن بگڑ جائے گا۔

اس لئے بہتر یہ ہے کہ ویب پیج ڈیزائن کرتے وقت ایسے common فونٹ استعمال کریں جو دنیا کے ہر کمپیوٹر میں پائے جاتے ہوں۔ Arial, Times New Roman اور Verdana ایسے فونٹس ہیں جو دنیا کے تقریباً ہر کمپیوٹر میں موجود ہوتے ہیں۔ان میں سے Verdana ایک ایسا فونٹ ہے جو خاص طور سے انٹرنیٹ کے لئے ہی بنایا گیا ہے اور اسکرین پر بے حد خوبصورت دکھائی دیتا ہے۔اس لئے میرا مشورہ ہے کہ ویب پیج بناتے وقت آنکھیں بند کر کے یہی فونٹ استعمال کریں۔آگے چل کر جب آپ کو تجربہ ہو جائے گا تو خود ہی سمجھ جائیں گے کہ کون کون سے فونٹس کہاں استعمال کرنے ہیں۔

آپ جس عبارت کے لئے کوئی فونٹ مخصوص کرنا چاہتے ہوں اس سے قبل درج ذیل ٹیگ استعمال کریں۔

یہاں verdana کے بجائے آپ کسی بھی فونٹ کا نام دے سکتے ہیں مثلاً arial، tohama وغیرہ۔پھر عبارت ٹائپ کریں اور آخر میں کے ذریعہ اس ٹیگ کو بند کر دیں۔یعنی اور کے درمیان جو بھی عبارت موجود ہوگی وہ verdana فونٹ کی صورت میں اسکرین پر ظاہر ہوگی۔

HTML میں حروف کے سائز کو بڑا یا چھوٹا کرنے

کے لئے 1 سے 7 کے درمیان کوئی بھی ویلیو استعمال کیا جا سکتا ہے۔ نمبر جتنا زیادہ ہوگا فونٹ اتنا ہی بڑا ہوگا۔ یعنی 1 سب سے چھوٹا اور 7 سب سے بڑا۔

عام طور سے ویب پیج کے لئے 2 یا 3 نمبر کے فونٹس استعمال ہوتے ہیں جب کہ Heading کے لئے 4، 5 یا 6 سائز استعمال ہوتے ہیں۔ 1 بے حد چھوٹا اور 7 بہت زیادہ بڑا ہوتا ہے۔

سائز کے لئے درج ذیل Tag لکھیں گے:

 یہاں 2 کی جگہ 1 اور 7 کے درمیان کوئی بھی ویلیو لکھ سکتے ہیں۔ آخر میں کے ذریعہ ٹیگ کو بند کریں۔

فونٹ کے رنگ کے لئے درج ذیل ٹیگ استعمال کریں:

 یہاں blue کی جگہ کسی بھی رنگ کا نام یا hex code لکھ سکتے ہیں جیسے اور آخر میں کی مدد سے ٹیگ کو close کریں۔

اوپر بیان کی گئی، فونٹس کی یہ تینوں خصوصیات کو ہم ایک ساتھ بھی استعمال کرتے ہیں۔

مشق کریں:

مندرجہ ذیل HTML پروگرام کو ٹائپ کریں۔

```
<html>
   <head>
    <title>Font Styles/title>
   </head>
   <body>
 <font face=verdana size=2 color=red>
    India is great.
</font>
</body>
</html>
```

میرا خیال ہے مندرجہ بالا مثال سے آپ فونٹس کا استعمال اچھی طرح سمجھ گئے ہوں گے۔ آپ کسی بھی لائن یا اقتباس کے حروف، ان کے سائز اور رنگ تبدیل کر سکتے ہیں۔ اب آپ اس کی خوب مشق کریں۔ پہلے باری باری 1 سے 7 تک سائز تبدیل کر کے دیکھیں۔ پھر مختلف رنگ تبدیل کر کے دیکھیں اور آخر میں مختلف فونٹ تبدیل کر کے مشق کریں۔

آج کے سبق میں اب تک آپ نے دو اہم چیزیں سیکھیں: (۱) بیک گراؤنڈ رنگ تبدیل کرنا اور فونٹس کی خصوصیات تبدیل کرنا۔

ان کا استعمال کر کے مختلف ویب پیج بنائیں اور save کریں۔ ہر ایک میں مختلف فونٹس، سائز اور رنگ استعمال کریں۔

فونٹس کو بولڈ کرنا:

حروف کو بولڈ کرنے کے لئے اور ٹیگ کا استعمال کریں۔ ان کے درمیان جو کچھ بھی لکھیں گے وہ بولڈ ہو جائے گا۔ گزشتہ مثال میں India کو ان tags کے درمیان رکھ کر دیکھیں۔

```
<b> India</b> is great.
```

صرف India بولڈ ہو جائے گا جب کہ is great عام حالت میں ہی رہے گا۔ اس طرح ویب پیجز میں جہاں کہیں بھی بولڈ کرنا ہو وہاں یہ ٹیگ استعمال کریں۔

فونٹس کو انڈر لائن کرنا:

حروف کو انڈر لائن کرنے کے لئے <u> اور </u> کا استعمال کریں۔ ان کے درمیان لکھا جانے والے حروف انڈر لائن ہو جائیں گے۔

```
<u> I am an Indian</u>
```

فونٹس کو ترچھا (Italicized) کرنا:

حروف کو Italicized کرنے کے لئے اور کا استعمال کریں۔

```
I live in <i>Kolkata</i>
```

آپ چاہیں تو ان میں سے کوئی دو یا چاہیں تو تینوں کو ہی ایک ساتھ بھی استعمال کر سکتے ہیں۔ تجربہ کر کے دیکھ لیں۔

```
<i><b><u> I am an Indian</i></b></u>
```

ہاں ایک بات کا خیال رکھیں: جس ٹیگ کو شروع کریں اسے close ضرور کریں۔

فونٹس سے متعلق تقریباً ساری ضروری باتیں آپ سیکھ چکے ہیں۔ ان کی خوب مشق کیجئے تاکہ آپ کو اچھی طرح یاد ہو جائیں۔

آیئے اب آگے بڑھتے ہیں اور ویب ڈیزائننگ کی ایک بے حد اہم شے یعنی تصویروں کی بات کرتے ہیں۔

تصویروں کا استعمال :

تصویریں ویب پیج کی خوبصورتی میں اضافہ کرتی ہیں۔ تصویروں کے استعمال کے بغیر اچھی ویب سائٹ بنالینا ناممکن ہے۔

سب سے پہلے تو میں یہ بتا دوں کہ کمپیوٹر میں تصویروں کو بے شمار قسم کی فائلوں کی صورت میں محفوظ رکھا جا سکتا ہے۔ ان مختلف قسموں کو فارمیٹ (Format) کہا جاتا ہے جیسے JPEG, GIF, TIF, BMP, WMF, PCX, DIB, TGA, CDR, PSD وغیرہ۔

ایک بات ذہن نشین کر لیں کہ انٹرنیٹ کی دنیا میں صرف تین قسم کی تصویروں کا ہی استعمال کیا جا سکتا ہے۔

(۱) JPG یا JPEG

(۲) GIF

(۳) PNG

ان میں سے بھی PNG کا استعمال بے حد کم کیا جاتا ہے۔ عام طور سے ویب سائٹس میں آپ کو صرف دو ہی قسم کی تصاویر ملیں گی: JPG اور GIF

ان دونوں قسم کی تصاویر کے اپنی کچھ مثبت اور منفی پہلو ہیں۔ JPG فارمیٹ کیمرے سے لی گئی تصاویر (فوٹوگراف) کے لئے مناسب ہوتا ہے۔ یہ رنگوں کے کروڑوں شیڈز (True colors) دکھا سکتا ہے۔

دوسری طرف GIF فارمیٹ کمپیوٹر کے ذریعہ بنائے گئے ڈیزائنوں اور آئی کون وغیرہ کے لئے مناسب ہوتا ہے جن میں Solid colors موجود ہوں۔ یہ زیادہ سے زیادہ 256 رنگوں کو ہی دکھا سکتا ہے۔ لیکن اس فارمیٹ کی خوبی ہے کہ اس میں شفاف (Transparent) بیک گراؤنڈ کو دکھانا ممکن ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ اس میں Animation (حرکت کرتی تصاویر) بنانا ممکن ہوتا ہے۔

تصویر کو ویب پیج میں شامل کرنے کے لئے سب سے پہلے کسی جگہ ایک نیا فولڈر بنائیں۔ فرض کیجئے آپ کے کسی ڈرائیو میں بنا لیتے ہیں۔

اب ایک JPG یا GIF تصویر اسی فولڈر میں save کر لیں۔ JPG یا GIF تصویر آپ کے کمپیوٹر میں ہوگی۔ اگر نہ ہو تو کسی ویب سائٹ یا فیس بک سے save کر لیں۔ (اس کے لئے تصویر پر Right click کریں اور ظاہر ہونے والے Menu میں سے Save Picture As کو کلک کر دیں۔)

اب نوٹ پیڈ میں ایک HTML پروگرام لکھیں اور </body> کے بعد درج ذیل کوڈ لکھ دیں۔

```
<img src= name of pic file >
```

name of pic file کی جگہ آپ تصویر کی فائل کا پورا نام .jpg یا .gif کے ساتھ لکھ دیں اور html فائل کو اسی فولڈر میں save کر دیں۔

تصویروں سے متعلق مزید تفصیلات اگلے ماہ۔

Mr. Khurshid Eqbal,Stall No.5,
New Market, Jagatdal, North 24 Parganas,
WB, - 743125 Email:*keqbal@gmail.com*

ایم نسیم اعظمی

بنکنگ سروس مشترکہ تحریری امتحان



زندگی کے تقریباً تمام ہی شعبوں میں اب مسابقتی امتحان میں کامیابی کو ضروری مانا جاتا ہے۔ اب میڈیکل اور انجینئرنگ کے طرز پر ملک کے بینکنگ مینجمنٹ کے شعبے نے بھی ہندوستان کے 19 اہم ترین بینکوں میں پی او اور مینجمنٹ ٹرینی کی ملازمت کے حصول کے لیے کامن رٹین اگزام (CWE) یعنی مشترکہ تحریری امتحان میں کامیابی کو ضروری قرار دے دیا ہے۔

کامن رٹین اگزام میں شرکت کے لیے امیدوار کا گریجویٹ ہونا پہلی اور لازمی شرط ہے۔ اس مشترکہ امتحان میں کامیابی کے بعد جن بینکوں میں پی او یا مینجمنٹ ٹرینی کی ملازمت حاصل کی جاتی ہے ان میں الہ آباد بینک، آندھرا بینک، بینک آف بڑودہ، بینک آف انڈیا، بینک آف مہاراشٹر، سنٹرل بینک آف انڈیا، کنارا بینک، کارپوریشن بینک، دینا بینک، انڈین بینک، انڈین اوور سیز بینک، اورینٹل بینک آف کامرس، پنجاب نیشنل بینک، پنجاب اینڈ سندھ بینک، سنڈیکیٹ بینک، یونین بینک آف انڈیا، یونائیٹڈ بینک آف انڈیا، یوکو بینک، وجیا بینک شامل ہیں۔

سی ڈبلو ای (CWE) میں کامیاب امیدوار کو ایک اسکور کارڈ دیا جاتا ہے۔ جس کی بنیاد پر وہ مذکورہ بالا بینکوں میں صرف انٹرویو اور جی ڈی میں شریک ہو کر پی او (PO) یا مینجمنٹ ٹرینی کی ملازمت حاصل کرنے کا مجاز ہو جاتا ہے۔ اس امتحان کے اہتمام سے بینکوں کی نوکری کے خواہش مند نوجوانوں کو بیک وقت انیس بینکوں کا مشترکہ پلیٹ فارم مل جاتا ہے اور انھیں الگ الگ مختلف بینکوں کے ٹسٹ وغیرہ کی پریشانیوں سے بھی نجات مل جاتی ہے۔ اس امتحان کا انعقاد انسٹی ٹیوٹ آف بینکنگ پرسنل سلکشن (IBPS) کے ذریعے کرایا جاتا ہے۔ اس امتحان میں شریک ہونے والے امیدوار کی عمر کی حد زیادہ سے زیادہ تیس سال اور کم سے کم اکیس سال مقرر کی گئی ہے۔ اس میں پوچھے جانے والے سوالات عموماً پانچ شعبوں سے متعلق ہوتے ہیں۔ کل 225 نمبروں کے سوالات ہوتے ہیں جن میں ریزننگ، انگلش لینگویج، کوانٹی ٹیٹیو، اپٹی ٹیوڈ کمپیوٹر نالج اور جنرل ایوِرنس وغیرہ سے متعلق سوالات ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ ڈسکرپٹ پیپر ہوتا ہے۔ آبجیکٹو امتحان کے لیے ڈھائی گھنٹے اور ڈسکرپٹ پیپر کے لیے ایک گھنٹے کا وقت مقرر ہوتا ہے۔ ریزننگ میں ورمل اور نان ورمل دونوں طرح کے سوالات ہوتے ہیں۔ ورمل میں نمبر سیریز، الفابٹ سیریز، اقوال اور تجزیاتی سوالات ہوتے ہیں۔ ڈائرکشن ٹسٹ، کوڈنگ، نمبر رینکنگ، ارتھ میٹیکل ریزننگ، بلڈری لیشن، اینالاجی اور ڈیسیزن میکنگ وغیرہ سے سوالات پوچھے جاتے ہیں۔ نان ورمل میں گروپنگ، پکچری لیشن شپ اور سیریز وغیرہ سے متعلق سوالات ہوتے ہیں۔ ریاضی میں ہندسہ، فیصد، اوسط، رفتار، وقت اور رقبہ وغیرہ کے علاوہ تناسب اور اگریزی میں کامن ایرر کہری پشن، پری پوزیشن، اسپیلنگ، رول اور سنٹنس تو کمپیوٹر سے بنیادی معلومات اور جنرل ایوِرنس کے تحت بینکنگ سے متعلق سوالات ہوتے ہیں۔ ڈسکرپٹ پیپر کے تحت ایسے (مضمون نگاری) پریس لیٹر رائٹنگ وغیرہ کے بارے میں جانچ پرکھ کی جاتی ہے۔ جنھیں صرف انگریزی زبان میں لکھنا ہوتا ہے اور اس میں کامیابی کے بعد ہی آبجیکٹو پیپر کی جانچ کی جاتی ہے۔ اس امتحان کا پیٹرن اور مارکس درج ذیل انداز کے ہوتے ہیں:

بینک سروس کے لیے امیدواروں کی جانچ پرکھ کا یہ امتحان تقریباً ویسا ہی ہے جیسا عام طور سے دوسرے اداروں کی سروس کے لیے لیا جانے والا امتحان ہوتا ہے۔ اس امتحان کے ڈسکرپٹ پیپر کے علاوہ باقی نصاب بھی تقریباً جنرل ہے۔ اس لیے امیدواروں کو گھبرانے، ڈرنے، ذہنی کشمکش یا تناؤ کا شکار ہونے یا پریشان ہونے

TES Selection		Ques	Marks	Marks/Questn	-ive Mark
Reasoning	ریزننگ	50	50	1	-0.25
English Language	انگریزی زبان	50	25	0.5	-0.25
Quantitative Aptitude	کوانٹی ٹیٹیو اپٹی ٹیوڈ	50	50	1	-0.25
General Awarence	جنرل اویرنس	50	50	1	-0.25
Computer Knowledge	کمپیوٹر نالج	50	50	1	-0.25
Total		250	225		
Descriptive English	ڈسکرپٹیو انگلش		25		
Total			250		

کے بجائے پورے حوصلے اور یقین کے ساتھ اپنی تیاری میں پورے طور پر سرگرم عمل ہوجانے کی ضرورت ہے۔ اس کے آبجکٹیو پیپر کی تیاری وقت رہتے پوری محنت، لگن اور دل جمعی سے اور منصوبہ بند طریقے سے بہتر ہوتی ہے۔ وربل ریزننگ میں اصول وقواعد کی جانکاری اور عملی مشق سے اچھے نمبرات حاصل کیے جاسکتے ہیں۔ نان وربل میں یادداشت، دوربینی، قوت فیصلہ اور بار بار کی عملی پرکٹس کارگر ثابت ہوتی ہے۔ ریاضی کے سوالات عموماً کانسپٹ پر مبنی ہوتے ہیں اس لیے کانسپٹ کلیئر ہونے سے سوالات آسانی سے حل ہوجاتے ہیں۔ بینکنگ میں سوالوں کا ریپیٹی شن بہت کم ہوتا ہے لیکن ان کی بنیاد پر سوالات زیادہ پوچھے جاتے ہیں جس میں شارٹ ٹرک، فارمولوں اور اصولوں کی جانکاری کارآمد ہوتی ہے۔ ان لڑکوں کو کوچنگ، بازار میں دستیاب کتاب کے مطالعے یا اکسپرٹ اور گائڈ کی مدد سے سمجھایا جاسکتا ہے اور پوری لگن، مستعدی، محنت ومشق، سائنٹفک طریقے اور منصوبہ بند تیاری سے اچھی کارکردگی کا مظاہرہ کرکے کامیابی حاصل کی جاسکتی ہے۔

انگریزی میں کامیابی کے لیے گرامر کی جانکاری، لفظوں کا صحیح استعمال، اسپیلنگ کی بہتر معلومات اور سنٹنس فارمیشن میں دسترس وغیرہ کارآمد ہوتی ہے۔ انگریزی گرامر بک کا مطالعہ، قومی سطح کے انگریزی اخبارات کا پابندی سے مطالعہ، ذخیرۂ الفاظ میں بتدریج اضافے کی کوشش اور کمپیوٹر کی بنیادی عملی جانکاری کے ساتھ کسی مستند کتاب کا مطالعہ، ریزننگ، ریاضی اور انگریزی وغیرہ میں اچھے نمبرات حاصل کرنے والے امیدواروں کا اصل مقابلہ مضمون پیپر میں ہوتا ہے۔ اس میں کہیں سے بھی اور کچھ بھی پوچھا جاسکتا ہے اس لیے اس میں زیادہ محنت، زیادہ مطالعہ اور زیادہ معلومات کی ضرورت ہوتی ہے جس کے لیے گزشتہ چھ مہینوں کے اخبارات ورسائل، ملکی اور غیرملکی اہم واقعات وحادثات پر گہری نظر، کھیلوں اور معاہدوں کی جانکاری خصوصاً بینکنگ اور اکنامکس سے متعلق جانکاری اور اس کے لیے ضروری کتابوں کا بغور مطالعہ مفید ہوسکتا ہے۔ اس امتحان کی تیاری کرتے وقت کچھ نئے پن اور انوکھے طریقۂ کار کا مظاہرہ بھی بہتر ہوسکتا ہے کیونکہ اس امتحان میں کچھ نہ کچھ بالکل نیا ہوتا ہے۔ انگریزی لکھنے کی مہارت، لیٹر رائٹنگ پریسس، آسان زبان واسلوب میں اپنی باتوں کو قلم بند کرنے کی صلاحیت بھی اس کی کامیابی کا زینہ بنتی ہے۔

جی ڈی اور انٹرویو:— سی ڈبلو ای (CWE) کے امتحان میں کامیابی کے بعد جی ڈی یعنی گروپ ڈسکشن اور انٹرویو سے گزرنا ہوتا ہے۔ اس امتحان میں پاس امیدوار کو ایک اسکور کارڈ دیا جاتا ہے جس کی بنیاد پر وہ مذکورہ بینکوں میں محض انٹرویو اور گروپ ڈسکشن میں حصہ لے کر اور بہتر مظاہرہ کرکے ملازمت حاصل کرنے کا حقدار ہوجاتا ہے۔ کوالی فائنگ امیدوار کے لیے انٹرویو اور گروپ ڈسکشن انتہائی اہمیت کا حامل ہوتا ہے اور اس میں ذرا سی بھی چوک نقصان کا باعث ہوسکتی ہے۔ گروپ ڈسکشن میں امیدوار کی خود اعتمادی یا کانفیڈنس اور اس کی نمائندگی اور لوگوں کے ساتھ مل کر کام کرنے کی اہلیت کی جانچ کی جاتی ہے تو انٹرویو میں امیدوار کا پرسنالٹی ٹسٹ لیا جاتا ہے اور اس کے ذریعے یہ دیکھنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ امیدوار کے جنرل نالج یا عام معلومات کا معیار کتنا ہے۔ اس کی بات چیت کا انداز کیسا ہے، اس کی کمیونی کیشن اسکل یعنی اپنی بات دوسروں تک پہنچانے کی مہارت کتنی ہے اور ماتحتی میں کام کرنے کی اس میں کیسی اور کتنی صلاحیت ہے— گروپ ڈسکشن میں آٹھ سو لوگوں کا ایک گروپ ہوتا ہے جس میں کوئی لیڈر نہیں ہوتا ہے اور اس کے سبھی ممبران مخصوص حالات میں کسی مخصوص موضوع یا ٹاپک پر ایک مقررہ وقت کے اندر اپنے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔ اس میں حصہ لینے والے افراد کی تعداد اور مقررہ وقت میں حسب ضرور کمی بیشی بھی کی جاتی ہے۔ گروپ ڈسکشن کے دوران موڈریٹر پینل اس میں حصہ لینے والوں کے بارے میں درج ذیل نکات کے تحت غور کرتا رہتا ہے:

1 لیڈرشپ ایبی لیٹی:— موڈریٹر پینل اس کا مشاہدہ کرتا ہے کہ امیدوار اینی شی ایٹیو لیتا ہے یا نہیں؟ یعنی کسی کام میں از خود پہل کرتا ہے کہ نہیں۔ اس میں سمتوں کے تعین کی اہلیت کیسی اور کتنی ہے؟ کیا وہ کسی بھی معاملے میں آگے بڑھ کر ذمے داری قبول کرنے کی جرأت کرنے کی اہلیت کا حامل ہے؟ گروپ کے لوگوں میں اس کا کوآرڈینیشن یا تال میل کیسا ہے اور حصول مقصد میں امیدوار کس قدر متحرک اور فعال ہوسکتا ہے؟

2 معلومات عامہ:— گروپ ڈسکشن میں یہ بھی غور کیا جاتا ہے کہ امیدوار کی جنرل نالج یا معلومات عامہ کیسی ہے اور موقع ومحل سے اس کا اظہار کرکے وہ کس طرح کسی کو مطمئن کرسکتا ہے؟ اس کی سبجیکٹ پر دسترس کیسی ہے اور اپنی معلومات اور اپنے نکات کی اہمیت سے اپنے مخاطب کو کس قدر متاثر کرنے کی قابلیت رکھتا ہے؟

3 اینالیٹیکل ایبی لیٹی:— اینالیٹیکل ایبی لیٹی کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ اس لیے اس کی جانچ پرکھ پر خصوصی توجہ دی جاتی ہے۔ امیدوار کے اندر اینالیٹیکل ایبی لیٹی یعنی تجزیاتی لیاقت کتنی اور کیسی ہے اور وہ آرگومنٹ یا دلیل کو کیسے استعمال کرتا ہے اور اس کی منطق و استدلال میں کتنا دم خم ہوتا ہے یہ سب دیکھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

4 کمیونی کیشن:— اس میں امیدوار کی فلوایٹسی، خیالات کی وضاحت، حاضر جوابی، نقطہ نظر اور باڈی لینگویج کی جانچ پرکھ کی جاتی ہے۔

آبجکٹیو ٹسٹ، ڈسکرپٹیو انگلش، گروپ ڈسکشن اور انٹرویو میں کامیابی کے بعد امیدوار ملک کے مذکورہ اہم ترین انیس بینکوں میں سے اپنی پسند کے کسی بھی بینک میں پی او (PO) یا مینجمنٹ ٹرینی کی حیثیت سے نوکری پانے کا اہل قرار دیا جاتا ہے اور تقرری کے بعد بینک ملازمت کے اپنے دیرینہ خواب کو شرمندۂ تعبیر کرتے ہوئے اپنے روشن اور تابناک مستقبل کی راہ پر گامزن ہوجاتا ہے۔

Dr. M Naseem Azmi, Adeela Publications Domanpura (Kasari) Mau Nath Bhanjan(UP)

बैंक ऑफ़ इंडिया Bank of India
बैंक ऑफ़ बड़ौदा Bank of Baroda
ALLAHABAD BANK (A Govt. of India Undertaking) A tradition of trust
Andhra Bank
सेन्ट्रल बैंक ऑफ़ इंडिया Central Bank of India
सिंडिकेटबैंक SyndicateBank भारत सरकार का उपक्रम A Govt. of India Undertaking
Union Bank of India
VIJAYA BANK (A Government of India Undertaking) A friend you can bank upon

تبصرہ وتعارف

شاعری کی تنقید



مصنف: ابوالکلام قاسمی
صفحات: 327 قیمت: 90 روپے
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی
مبصر: سعید رشیدی، معرفت پروفیسر معین الدین جینابڑے
CIL/SLL & CS، جے این یو، نئی دہلی 67

یہ کتاب ابوالکلام قاسمی کے ان تنقیدی مضامین پر مشتمل ہے جو نامور شعرا کے فنی وفکری امتیازات سے کلام کرتے ہیں۔ شروع میں انھوں نے اپنا متوازن تنقیدی موقف بھی ظاہر کردیا ہے۔ انھوں نے مختلف عہد کے توانا غزلیہ ونظمیہ اسالیب کو موضوع بنایا ہے۔ تجزیاتی اور تعبیری طریق کار کو بروے کار لاتے ہوئے انھوں نے متن کے تشکیلی نظام پر توجہ دی ہے۔ نئی اردو نظم کے تہذیبی تشخص، ہجرت اور تانیثیت کے مسئلوں کو تہذیبی میلانات کے تحت نمایاں کیا ہے۔ غزل کے اسالیب کے تحت انھوں نے سب سے پہلے امیر خسرو کے شعری طریق کار اور فنی تدابیر کے سلسلے میں ان کی انفرادیت کو نشان زد کرتے ہوئے ان کی غزل کی حرکیات کی تفہیم کی کوشش کی ہے۔

ولی کے شعری تشخص کو عام طور پر لسانی اساس پر سمجھنے کی کوشش کی جاتی ہے، لیکن لسانیات کے اصول اور زبان کا تخلیقی کردار، دو الگ چیزیں ہیں۔ لسانی اساس پر ان کا مطالعہ لسانی تشکیل کے پہلوؤں کو نشان زد کرتا ہے، لیکن شعر کے تشکیلی عناصر پر بات کی جائے اور اطلاقی نمونے تلاش کیے جائیں تو متن اور حرمۂ متن، دونوں کی تفہیم دلچسپ ہوجاتی ہے۔ ولی پر کافی مضامین لکھے گئے ہیں۔ ان میں بیشتر نوعیت کے مضامین کی افراط ہے اور تکرار ان کا مشترکہ وصف۔ قاسمی صاحب نے ولی کے شعری رویوں کو مرکز میں رکھ کر مضمون وسعتی آفرینی کے مراحل تک رسائی حاصل کی ہے۔ اس سلسلے میں ان کا موقف درست ہے کہ ''مضمون آفرینی ہو یا معنی آفرینی، دونوں ان کے فنی طریق کار سے اس طرح پیوست ہیں کہ مضمون یا معنی کی حیثیت، پیش کش کی ہنرمندی اور فنی کارکردگی کے باعث ارتفاع حاصل کرلیتی ہے''۔ اس طرح انھوں نے ولی کے اس نظریے کی آفاقیت تسلیم کی ہے:

راہ مضمون تازہ بند نہیں تا قیامت کھلا ہے باب سخن

قاسمی صاحب کا اصل مقصد ولی دکنی کی شاعری کا جائزہ لیتے ہوئے ان کے فنی طریق کار پر بات کرنا ہے۔ خواجہ میر درد کو عام طور پر صوفی شاعر سمجھا جاتا ہے اور اکثر یہی دیکھا گیا ہے کہ تصوف سے ہٹ کر ان کے شعری امتیازات پر بات کم کی جاتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ درد کی شاعری کا ایک جز تصوف بھی ہے، لیکن اسے ہی کل قرار دینا کسی طرح مناسب نہیں۔ موصوف نے درد کو ماورائے تصوف دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ شعری مرتبے کا تعین کرتے ہوئے انھوں نے انھیں صف دوم کے کلاسیکی شاعروں میں نہایت اہم بتایا ہے۔ غالب کے شعری لہجے پر بات کرتے ہوئے انداز گفتگو کے نحوی اور معنوی سطحوں پر پیدا ہونے والی جہتوں کو موضوع بنایا ہے۔ ذوق کو عام طور پر قصیدے ہی کا شاعر تسلیم کرلیا گیا ہے، لیکن انھوں نے غزلیں بھی کہی ہیں۔ ان کی غزلوں پر بھی بات ہونی چاہیے۔ قاسمی صاحب نے ذوق کے غزلیہ اسلوب کا مطالعہ کیا ہے۔ اسی تسلسل میں اقبال اور فراق کے امتیازات کو نشان زد کرتے ہوئے جدید تر غزل کا منظرنامہ مرتب کیا ہے۔

معاصر غزل کی شعریات اپنے وسیع تر مفاہیم میں محسوسات، تجربات اور اظہار کی کشائش سے عبارت ہے۔ آج انسانیت انتشار اور بحران کی شکار ہے۔ یہ انتشار خارج میں بھی ہے اور باطن میں بھی، بلکہ یہی عالم گیر منظر ہے کہ آج کا فرد وقوع بہ نوع ذہنی، جذباتی اور نفسیاتی پیچیدگیوں میں گھرا ہوا ہے، اور مہذب دنیا سیاسی، سماجی، تہذیبی، اخلاقی اور ذاتی قدروں کا بنا نظام مرتب کررہی ہے۔ ہر تجربہ گوناگوں انتشارات کا اسیر ہے۔ مشینوں کی بے درد حکومت احساس مروّت کو تار تار کررہی ہے۔ رفتہ رفتہ دنیا عالمی گاؤں میں تبدیل ہوتی جارہی ہے۔ معاصر غزل زندگی کی یکلمونی سے عبارت ہے اور زندگی تجربات کا سرچشمہ ہے۔ معاصر غزل کی شعریات کے انسلاکات میں محض تنہائی سے بیزاری، ایقان اور اعتبار، روحانی تحفظ اور اثبات ہی نہیں، بلکہ حزن ویاس کا بھی بڑا دخل ہے۔ یہ شعریات اپنے موضوعات اور بیرایۂ اظہار پر اصرار اور تخصیص نہیں کرتی، کہ یہ جدیدیت کے موضوعات تھے اور اب یہ ہمارے موضوعات اور اسالیب ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ اصرار پھر جدیدیت اور سکّہ بندی کی جانب لے جائے گا۔ معاصر شعریات متوازن اور فطری افکار کی حامل ہے۔ قاسمی صاحب نے 'جدید تر غزل کی صورت حال' میں انھی مسائل پر اظہار خیال کرتے ہوئے نمایاں اسالیب کو نشان زد کیا ہے۔ آزادی سے قبل اور تقسیم کے بعد کی صورت حال اور حالیہ لہجوں کو واضح کرنا مشکل کام ہے، لیکن انھوں نے معاصر شعری منظرنامے کو اس کے اپنے انتخاص کی روشنی میں دیکھا اور پرکھا ہے۔ اس مطالعے میں کسی طرح کی شدت پسندی یا ادعائیت نظر نہیں آتی۔ افہام وتفہیم کی متوازن صورت حال آج کی تنقید میں خال خال ہے۔

نظم کے اسالیب میں انیس، دبیر، اختر الایمان، وحید، سردار جعفری اور مہدی جعفر کے تخلیقی سرمایے کا جائزہ لیا گیا ہے۔ تجسیر وتجزیے کے تحت غالب، فیض، شہریار، زیب غوری اور عرفان صدیقی کی غزل کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ شعری متن کے تعبیری رویوں کی روایت پر اظہار خیال کرتے ہوئے 'شعر شور انگیز' کے تعبیری رویوں پر توجہ دی گئی ہے۔ یہ کتاب شاعری کے طلبہ اور شعری مسائل میں دلچسپی رکھنے والوں کے لیے مفید ہے۔

یونانی دوا سازی (علم الادویہ)



مصنف: محمد مستان علی
صفحات: 236، قیمت: 49 روپے
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی
مبصر: ڈاکٹر وسیم احمد، چیف آفیسر انسٹی ٹیوٹ آف یونانی میڈیسن، کونگیے پالیا، گنڈی روڈ (مین)، بنگلور

زیر تبصرہ کتاب 'یونانی دوا سازی' علم الادویہ معروف دوا ساز محمد مستان علی کی تصنیف ہے، جنھوں نے دوران طالب علمی میں اپنے زمانے کے لائق استاد حکیم عبدالعلی صاحب جو حکیم اجمل خاں کے شاگرد تھے اور جن کا شمار نظامیہ طبی کالج کے ماہر اساتذہ میں ہوتا تھا، ان سے

انھیں شرفِ تلمذ نیز ان کے خانگی مطب پر بھی بیٹھنے اور استفادہ کرنے کا موقع ملا۔ دریں اثنا مطب میں مستعمل ادویات مصنف کے زیرِ نگرانی تیار ہونے لگیں، اس سے انھیں فنِ دوا سازی میں غیر معمولی مہارت اور تجربہ ہوا، جس کا براہِ راست فائدہ اس وقت حاصل ہوا، جب مصنف کا انتخاب سینٹرل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ فار یونانی میڈیسن حیدرآباد میں ہوا، جہاں پر انھیں اپنی صلاحیتوں کو مزید جلا بخشنے کا موقع ملا۔

زیرِ نظر کتاب کی ابتدا تاریخ علم الادویہ کے عنوان سے کی گئی ہے، بعد ازاں اصل کتاب زیرِ بحث ہے، جو دس ابواب پر مشتمل ہے۔ باب اول: اصطلاحات دوا سازی کے ضمن میں اگر مندرجہ ذیل عنوانات کے تحت اصطلاحات کی تفصیل دی جاتی تو اس سے قاری کے ذہن میں عملیات، اشکال اور مسالک کے تعلق سے ایک بہتر تصویر سامنے آتی مثلاً: صیدلی عملیات/عملیات دوا سازی Pharmacentical procedures کے تحت احراق، اذابت، ارتحال، ازالہ لون، اقلاء، برد، بصرہ بستہ، تبلور، تجفیف، تحجیب، تحلیل، تبخیر، تخمیص، تشویہ، تخمیر، تدخین، تدہین، ترسیب، ترشیح، تصعید، تصفیہ، طبخ، نقع اور عصر وغیرہ۔

اشکال ادویہ Doses Form: اس عنوان کے تحت شیاف، فرزجہ، فتیلہ، کبوس، غازہ، نورہ، طلا، زلال، کجلی، ضماد، حلیب، سنون اور ماء الفواکہ وغیرہ شامل ہیں۔

مسالک ادویہ Mode of Administration: اس عنوان کے تحت سعوط، سکوب، ذرور، قطور، لخلخہ وغیرہ آتے ہیں۔ سفوف چٹکی: ایک مخصوص مرکب مسفوف کا نام ہے جو چٹکی کی مقدار میں بچوں کو استعمال کرایا جاتا ہے اس اصطلاح کا تذکرہ باب اول اصطلاحات دوا سازی کے ذیل میں غیر ضروری ہے۔ چہار تخم، چہار مغز: خالص دوا سازی کی اصطلاح نہیں ہے، بلکہ علم الادویہ میں مفردات یا مرکبات کے نسخہ جات کے تحت ذکر کرنے کے قابل ہے۔

باب دوم: آلات دوا سازی: ذیلی عنوانات مثلاً آلات تعریق، آلات قرص سازی، آلات سفوف وسحق اور آلات تخلیط مذکورہ سبھی موضوعات کثیر الاضلاع معلومات سے پُر ہیں، مزید بہتر ہوتا اگر جدید معلومات اور نئے فکر کو جگہ ملتی۔ باب سوم: سفوف وسحق کے طریقۂ کار کے کلی اصول کو نظر انداز کیا گیا ہے۔ سفوف کی واضح درجہ بندی بھی موجود نہیں ہے۔ چھلنیوں کے نمبر کا واضح تصور نہیں ہے کہ کن بنیادوں پر چھلنیوں کے نمبر گھٹتے بڑھتے ہیں اور اس کا سفوف کے سائز پر کیا اثر پڑتا ہے۔

چند مشہور متفرقات: متفرقات کا لفظ غیر واضح مقصدیت کا حامل ہے۔ چند مرکبات مسفوفہ کا تکنیکی لحاظ سے دوا سازی کی اس کتاب میں ذکر غیر ضروری ہے۔ یہ مرکبات کا موضوع ہے نہ کہ صیدلہ کا لیکن علمی لحاظ سے مفید ہے۔

تصویل (Seiving): صوّل، الشی، اخرجہ بالماء کتصویل الکلس، نقاہ، اخرج ما فیہ من تراب ونحوہ بالماء کتصویل الحنطۃ۔ چھلنیوں کے Description کے لیے بہتر یہ ہے کہ سوراخوں کی تعداد کے بجائے سوراخوں کے سائز کو وضاحت کے لیے بنیاد بنایا جائے کہ 10 نمبر کی چھلنی کے سوراخ کا سائز 1.7mm ہوگا اور اس کے ایک مربع انچ میں سوراخ کی تعداد 13.00^2 (یعنی 169 سوراخ ہوں گے)۔ 100 نمبر کی چھلنی کے سوراخ کا سائز 0.150mm ہوگا اور اس کے ایک مربع انچ میں سوراخ کی مقدار 36.37^2 (یعنی 1325.504 سوراخ ہوں گے) گویا کہ چھلنی کے نمبر میں اضافے کا بھی چھلنی کے سوراخ کے سائز سے کوئی تعلق نہیں ہے اور نہ ہی چھلنی میں سوراخوں کی تعداد کا۔

باب چہارم: حبوب واقراص کا بیان قابلِ قدر ہے۔

چند مشہور حبوب واقراص۔ تکنیکی وفنی لحاظ سے غیر ضروری، لیکن علمی لحاظ سے مفید ہے۔

باب پنجم: قوام کا بیان قابلِ قدر، روایتی فن صیدلہ میں ایک اضافہ ہے کہ جدید معلومات سے استفادہ کیا گیا ہے۔ قوامی مرکبات کا تذکرہ: تکنیکی وفنی لحاظ سے غیر ضروری لیکن علمی لحاظ سے مفید ہے۔ باب ششم وہفتم: خمیرہ اور لعوق کا طریقہ تیاری وشربتوں طریقۂ تیاری۔ باب پنجم میں شامل ہونا چاہیے۔ الگ سے اس کو باب کی شکل میں ذکر کرنا کسی حکمت سے بالاتر محسوس ہوتا ہے۔

مربہ جات: قابل قدر، غذائی مرکبات: قابل قدر روغنیات کی تیاری: روغنیات: روغن کثیفہ وروغن لطیفہ کے حصول پر کلی وبنیادی گفتگو موجود نہیں ہے، بلکہ روغن کے حصول کے طریقۂ کار پر بحث کی گئی ہے۔ روغنیات لطیفہ وکثیفہ کے حصول کے مختلف طریقوں پر الگ ایک کلی بحث سامنے آجائے تو طالب علم وقاری کے ذہن میں ایک بہتر تصویر بن سکے گی۔

باب ہشتم: تکلیس پر بنیادی مباحث غیر موجود تکلیس کے طریقہ کار پر کلی گفتگو بھی موجود نہیں۔ تکلیس میں تصفیہ کے حوالے سے گفتگو واضح نہیں ہے۔

مرہم قیروطی کے موضوع پر اصول، کلی اور بنیادی مباحث نہیں جو کہ نقص کتاب ہے۔

طریقۂ کار کی وضاحت نہیں ہے، مختلف اجزا مرہم اور قیروطی کی بھی وضاحت نہیں ہے۔

باب نہم: قابل قدر وضروری۔ اس پر مصنف نے سیر حاصل گفتگو کی ہے جو اطبا کے لیے کارآمد ہے۔ باب دہم: علم الصیدلہ میں قابلِ قدر اضافہ ہے۔ اس کتاب کے مصنف ایک ٹیکنکل آدمی ہیں، جن کا علمی پہلوؤں کے بجائے عملی پہلو زیادہ مستند اور لائقِ اعتبار ہے۔ جبکہ علم الصیدلہ علمی وعملی پہلوؤں کا امتزاج ہے۔ یہ نمونہ مصنف کی مثبت کوششوں کا عکس ہے جو قابلِ قدر ہے۔

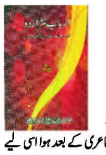

ارباب نثر اردو

مصنف: سید محمد

صفحات: 247، قیمت: 77 روپے

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

مبصر: امتیاز احمد علمی، شعبہ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی 25

دنیا کے دیگر ادب کی طرح اردو میں بھی نثر کا ارتقا شاعری کے بعد ہوا اسی لیے ہمارے یہاں شعری کارناموں کی بہتات ہے، اور اردو میں نثری تخلیقات کا سلسلہ بہت بعد میں شروع ہوا اس کی وجہ یہ تھی کہ اس وقت ادبی زبان کی حیثیت صرف فارسی کو حاصل تھی اور فارسی ہی دفتری زبان ہونے کے ساتھ امرا و روسا کی زبان تھی اور اس کا استعمال تہذیب یافتہ ہونے کی دلیل تھی۔ مگر تبادلۂ خیالات کے ذرائع کی کمی اور فکر وخیال کی سطح پر عہد قدیم میں جو تعطل وجمود اور ٹھہراؤ تھا اس میں نثر کا ارتقا مشکل تھا۔ مگر اردو کے ابتدائی دور تشکیل میں اسے صوفیائے کرام اور مذہبی رہنماؤں سے جو سہارا ملا اسی سے اردو نثر نگاری کی داغ بیل پڑی۔ تاریخی اعتبار سے اگر دیکھا جائے تو 12 ویں صدی ہجری کے آغاز سے ہی اردو نثر پاروں کا عہد شروع ہو جاتا ہے اور 18 ویں صدی تک پہنچتے پہنچتے یہ زبان اس لائق ہوگئی کہ اب اس میں باقاعدہ نثری کتابیں لکھی جانے لگیں اور 4 جولائی 1800 کو فورٹ ولیم کالج کے قیام سے ہی اردو میں جدید نثر نگاری کا آغاز ہوتا ہے۔ چونکہ اسی کالج کے اردو نثر نویسوں کا تحقیقی وتنقیدی تذکرہ 'ارباب نثر اردو' کے نام سے سید محمد نے تصنیف کیا تھا جس کو رحیل صدیقی نے مرتب کیا ہے۔ یہ کتاب سید محمد کے دوران طالب علمی کی تحریر کردہ ہے جسے میدان تحقیق میں ایک نمایاں مقام حاصل ہے کیونکہ فورٹ ولیم کالج کے بارے میں تاریخی وتحقیقی مواد محققین نے اسی کتاب کو بنیاد بنا کر حاصل کیا ہے۔ اس کالج پر جتنی بھی مشہور کتابیں 'ارباب نثر اردو' کے بعد منظر عام پر

آئیں ان میں محمد یحییٰ، احسن مارہروی، رام بابو سکسینہ، حامد حسن قادری، گیان چند جین، پروفیسر وقار عظیم، جاوید نہال، عبیدہ بیگم، سمیع اللہ اور صدیقی صدیقی وغیرہ مصنفین کی خدمات قابل ذکر ہیں مگر اساسی حیثیت صرف ارباب نثر اردو کو ہی حاصل ہے کیونکہ اس کا رخ پر بھی ایک ابتدائی کام ہے جس کی پہلی اشاعت مکتبہ ابراہیمیہ حیدرآباد سے 1927 میں ہوئی اور دوسری اشاعت اسی مکتبے سے 1937 میں جس میں مصنف نے ترمیم واضافے کے ساتھ شائع کیا اور جو معلومات پہلی اشاعت کے بعد موصول ہوتی رہیں ان سب کو مصنف نے اپنی اپنی جگہ بڑھا دیا ہے بعض ابواب میں رد وبدل بھی کیا گیا ہے۔ مصنف نے تمام ایڈیشنوں کا تقابلی مطالعہ کر کے 1973 کے ایڈیشن کو بنیاد بنا کر زیر تبصرہ نسخہ ترتیب دیا ہے جس کے متن کی تصحیح کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔ زیر تبصرہ کتاب 'ارباب نثر اردو' بظاہر تین ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلا اردو نثر فورٹ ولیم کالج سے پہلے، جو صرف پانچ صفحات پر مشتمل ہے، جس میں ابتدا لاشمال اور دکن کی ابتدائی نثری تخلیقات کا ذکر ہے مگر اس میں بھی اردو کے آغاز کے سلسلے میں بہت سی اہم باتوں کو نظر انداز کر دیا گیا ہے مثلاً اس باب میں صوفیا کرام کے ساتھ اس عہد کے قلمکاروں کی اردو خدمات کو نظر انداز کر دیا گیا۔ مثلاً بندہ نواز گیسو دراز، سید عبداللہ حسینی، برہان الدین جانم، امین الدین اعلیٰ، شاہ راجو، میراں جی خدا نما، مخدوم شاہ حسینی، عبدل متھنی، رستمی، ملک خوشنود حسن شوقی، صنعتی، ملا وجہی، نصرتی، غواصی اور قلی قطب شاہ گولکنڈہ اور بیجاپور وغیرہ سلطنتوں کے علاوہ شمالی ہند کے اردو نثر نگاروں میں میسوی خاں بہادر، شاہ عالم ثانی، میر عطا حسین خاں تحسین، غلام علی عشرت، انشاء اللہ خاں انشا، وغیرہ کا ذکر ضروری تھا کیونکہ ان کی تخلیقات سے اردو نثر فورٹ ولیم کالج سے پہلے ارتقائی منازل طے کر رہی تھی جو کالج کے قیام کے بعد یکسر تبدیل ہوگئی۔ اس کتاب کا دوسرا باب فورٹ ولیم کالج ہے یہ بھی پانچ صفحات پر مشتمل ہے جس میں کالج کی تاریخ اور اس کے اغراض ومقاصد کا اجمالی خاکہ پیش کیا ہے چونکہ دوسرے ایڈیشن تک کالج کی بہت سی معلومات پردۂ خفا میں رہ گئیں تھیں اور ان تک مصنف کی رسائی نہیں ہو پائی تھی اس وجہ سے بہت ساری اہم باتیں رہ گئیں تھیں مرتب نے ان کو مقدمے میں اجاگر کر دیا ہے اور کالج کے قیام کی صحیح تاریخ مختلف نقد اور غیر نقد روایتوں سے موازنہ کر کے پیش کر دیا ہے۔ اس کے علاوہ مرتب نے مقدمے میں کالج کے نصاب، اہم عہدوں پر تقرری، ہندوستانی شعبے کے عہدے اور ان کی تنخواہ وغیرہ کا ذکر تفصیل سے کیا ہے اور ساتھ ہی اس کتاب کی تیاری میں جن کتابوں سے استفادہ کیا گیا ہے اس کی تفصیل بھی ہے۔ اس کے تیسرے باب میں فورٹ ولیم کالج کے مصنفین ڈاکٹر جان گلکرسٹ، ٹاس روبک اور جوزف ٹیلر، میر امن، حیدر بخش حیدری، میر شیر علی افسوس، میر بہادر علی حسینی، مرزا علی لطف، مولوی امانت اللہ، مظہر علی خاں ولا، مرزا جان طپش، میر کاظم علی جوان، حفیظ الدین احمد، خلیل علی خاں اشک، مولوی اکرام علی، منشی بینی نارائن جہاں، میر عبداللہ مسکین، للولال جی، مرزا محمد فطرت، میر معین الدین فیض اور حمید الدین بہاری وغیرہ کی اردو کی گرانقدر خدمات اور جدید نثر کے فروغ میں ان کی تصنیفات، تالیفات اور تراجم کی اہمیت وافادیت کا اقرار کرتے ہوئے اس کا تفصیلی تحقیقی وتنقیدی جائزہ پیش کیا گیا ہے اور ساتھ ہی اس کالج کے مولفین کی تالیفات کی تفصیلات بھی ہیں۔ اس کے علاوہ حواشی میں مذکورہ مصنفین کے بارے میں جن جن کتابوں سے مدد لی گئی ہے اس کی تفصلات بھی ہیں اور الگ سے کالج کے تقریباً 82 مصنفین اور 123 اردو تصانیف کا خاکہ کے ساتھ 17، صفحات پر مشتمل ایک اشاریہ بھی شامل ہے۔ اس طرح سے یہ کتاب جہاں اردو نثر کی تاریخ مرتب کرنے والے محققین کے لیے بنیادی اہمیت کی حامل ہے وہیں یہ طلبہ واساتذہ کے درس وتدریس میں بھی معاون ومددگار ثابت ہوگی۔ یہ کتاب دیدہ زیب تو ہے ہی اس کی قیمت بھی بہت مناسب ہے اور بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں ٹائپنگ کی غلطیاں ہیں ہی نہیں۔ اس لیے امید قوی ہے کہ یہ کتاب ادبی وغیر ادبی دونوں حلقوں میں مقبول ہو کر مزید اردو کے فروغ کا باعث بنے گی۔



ابوالکلام آزاد: شخصی پہلو

مصنف: فیروز بخت احمد

صفحات: 123، قیمت: 85 روپے

ناشر: ہیجل بک ٹرسٹ، انڈیا

مبصر: توقیر راہی، F-176، سیکنڈ فلور، شاہین باغ، نئی دہلی

زیر تبصرہ کتاب آزاد شناسی کی جانب ایک اہم پیش رفت ہے۔ اس کتاب میں مولانا ابوالکلام آزاد کی ذاتی زندگی کے رموز کو نہایت احسن طریقے سے پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

یوں تو مولانا ابوالکلام آزاد پر بہت سی کتابیں خصوصاً اُن کی سیاسی تعلیمی زندگی و دیگر عنوانات سے موسوم تصنیف ہو چکی ہیں، لیکن مذکورہ کتاب کی خاص بات یہ ہے کہ یہ خانوادۂ آزاد کے چشم وچراغ فیروز بخت احمد کی کاوش ہے۔ دوسری بات یہ کہ امام الہند حضرت مولانا ابوالکلام آزاد پر کافی عرصے بعد ایک ایسی کتاب منظر عام پر آئی ہے جس میں جدت ہے اور صحیح معنوں میں آزاد کی شخصیت اور اہم خاندانی نکات پر روشنی ڈالی گئی ہے اور مولانا آزاد کی زندگی کے اُن پہلوؤں کو اُجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو ابھی تک عام لوگوں کی نظروں سے اوجھل تھے۔ مولانا کی رحلت کے بعد اُن کے اثاثہ جات کا کیا ہوا، حکومت ہند کی جانب سے مولانا کی خدمات کے اعتراف میں کیا اقدامات کیے گئے کچھ ایسے عنوانات ہیں جن پر تفصیل سے بحث کی گئی ہے۔ جیسے 'خاندان اور افراد' 'مولانا آزاد اور زلیخا بیگم کی قربانیاں'، 'مولانا ابوالکلام آزاد کی بہنوں کی علمی ودینی لیاقت'، 'اگست کراتی میں مولانا آزاد کا کلیدی کردار'، 'ایک گھر مولانا آزاد کے لیے'، 'مولانا ابوالکلام آزاد اور خواتین' وغیرہ۔

انڈیا ونز فریڈم کے تعلق سے اُن کی وصیت نیز 'بھارت رتن' سے سرفرازی کے واقعات کو بخوبی احاطہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مزار آزاد کی موجودہ حالت کو بھی اس کتاب میں سمیٹنے کی کوشش کی گئی ہے۔ زبان سلیس اور صاف ستھری ہے تاکہ عام قارئین کی سمجھ میں آسکے حتی المقدور کوشش کی گئی ہے کہ عنوانات کے ساتھ انصاف کیا جائے۔

یہ کتاب محض اُن کی زندگی کی ہی آئینہ دار نہیں ہے بلکہ اُن کے افکار وخیالات کی جانب ایک اہم قدم بھی ہے۔

کتاب میں شامل بھی 18 مضامین میں تقریباً کچھ نہ کچھ ایسی معلومات ہیں جو قارئین کے لیے بلاشبہ دلچسپی کا سبب ہیں۔ مثال کے طور پر، 'مولانا آزاد اور زلیخا بیگم کی قربانیاں' ایک ایسا باب ہے جس میں فیروز بخت نے آزاد کی شریک حیات کے ذریعے دی گئی قربانیوں کو قلم بند کیا ہے۔ مثلاً جب مولانا کو گرفتار کر کے احمد نگر قلعہ کے لیے بھیجا جا رہا تھا تو اُن کی شریک حیات، زُلیخا بیگم دروازے تک اُن کو چھوڑنے آئیں۔ وہ سخت بیمار تھیں۔ مولانا چاہتے ہوئے بھی اُن کی تیمارداری کے لیے گھر پر نہیں رُک سکتے تھے کیونکہ انھیں پنڈت نہرو وجہاتما گاندھی کے ساتھ احمد نگر قلعہ کی جیل میں قید کیا جانا تھا۔

فاضل مصنف نے 'مولانا ابوالکلام آزاد کی بہنوں کی علمی ودینی لیاقت' سے منسوب عنوان میں لکھا ہے کہ مولانا آزاد کے بہن بھائی غیر معمولی ادبی وعلمی بصیرت کے حامل تھے مگر مولانا کی عالمانہ فضیلت کے ہوتے وہ اُن ستاروں کی مانند گم سے رہے جیسے سورج کے نکلنے سے اُس کی روشنی ہر جگہ وہر چیز پر غالب آجاتی ہے۔ مولانا آزاد کے ایک بڑے بھائی مصنف کے حقیقی دادا بھی تھے یعنی مولانا غلام یٰسین ابوالنصر آہ، خود ایک معروف عالم

3/21/2018 P74.jpg (1758×2405)

وفاضل تھے۔ مولانا آزاد کی تینوں بہنیں یعنی خدیجہ بیگم، فاطمہ بیگم اور حنیفہ بیگم نے بھی علمی میدان میں عزت و نیک نامی کمائی تھی۔ خصوصاً فاطمہ بیگم آرزو اور حنیفہ بیگم آبرو نے شعر وسخن سے شغف کے ساتھ ہی خواتین وطن کی بیداری، معاشرتی اِصلاح، جدوجہد آزادی اور تعلیم نسواں کے سلسلے میں فعال کردار ادا کیے ہیں۔

'خاندان اور افراد' کے تحت مصنف نے خاندانِ آزاد پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے اور شیخ جمال الدین بہلول دہلوی سے دورِ حاضر تک، اُن کے خاندانی افراد کا احاطہ کیا ہے۔ اِسی طرح عنوان، 'مولانا آزاد کا مزار' میں اُنھوں نے اپنی اُس جدوجہد کا تذکرہ کیا ہے جس کے ذریعے اُنھوں نے 1958 سے مقفل مزارِ آزاد کا تالا کھلوانے کے لیے دہلی ہائی کورٹ میں ایک مقدمہ برائے فلاحِ عامہ دائر کیا۔ اِس میں اُنھیں کامیابی حاصل ہوئی۔ یہی نہیں، اُنھوں نے مزار کے باہر اُردو، ہندی و انگریزی میں حیاتِ آزاد سے متعلق قدآدم تختیاں بھی عدالت کے تعاون سے لگوائیں۔ اُنھوں نے اِس امر کی جانب بھی اِشارہ کیا ہے کہ وقتاً فوقتاً اِسکولوں و کالجوں کے طالب علموں کا مزارِ آزاد کی زیارت سے متعلق منصوبے بھی سرکار کو وضع کرنا چاہیے۔

فیروز بخت نے مولانا آزاد اور خواتین سے متعلق ایک اہم عنوان، 'مولانا ابوالکلام آزادؒ اور خواتین' بھی قلم بند کیا ہے۔ اِس عنوان میں مولانا آزاد کے خواتین کے تئیں نظریات کو واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

مختصر یہ ہے کہ یہ کتاب اِس امر کی عکاس ہے کہ محی الدین مولانا ابوالکلام آزاد ہندوستان کی اُن عبقری شخصیات میں سے ہیں جنھوں نے اِس سرزمین کی آبیاری اپنے خونِ جگر سے کی۔ زیرِ تبصرہ کتاب بلاشبہ حیاتِ آزاد سے متعلق ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہاں شاید یہ کہا جائے تو بیجا نہیں ہوگا کہ مولانا آزاد کی شخصیت گوناگوں پہلوؤں کو کم صفحات کی کتاب میں اس طرح سمیٹا گیا ہے جیسا کہ 'دریا کو کوزہ' میں اور اسلوب ایسا جیسا کہ دریا ہولے ہولے بہتا ہے۔

آزادی کے بعد اردو شاعری میں تانیثی حسیت



مصنفہ: ڈاکٹر وسیم بیگم
صفحات: 620، قیمت: 600 روپے
ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی
مبصر: ڈاکٹر پرویز شہریار، ایڈیٹر این سی ای آر ٹی، IV/48، این آئی ای کیمپس، نئی دہلی 16

ڈاکٹر وسیم بیگم اردو شاعری پر مسلسل تحقیقی کام کر رہی ہیں۔ 'بیسویں صدی میں اردو غزل' اور 'آزادی کے بعد اردو غزل' اُن کے قابل ذکر تحقیقی کام ہیں جنھیں ریفرنس کے طور پر برسوں یاد رکھا جائے گا۔ اس کے علاوہ 'مصحفی اور بحرالمحبت' نیز 'اردو شاعری کا انتخاب' وغیرہ ایسے اہم تحقیقی کام ہیں جو مصنفہ کے کاموں کو اعتبار بخشتے ہیں۔

اس تناظر میں دیکھا جائے تو ان کی تازہ تازہ منظر عام پر آئی تحقیقی کتاب 'آزادی کے بعد اردو شاعری میں تانیثی حسیت' قارئین کی توجہ اپنی طرف تیزی سے مبذول کر رہی ہے۔ ویمن امپاورمنٹ کے اس دور میں ایک عورت تحقیق کے ذریعے تانیثی حسیت بالخصوص شاعرات کی شاعری کے حوالے سے ایک انتہائی اہم اور ناگزیر مطالعہ کتاب ثابت ہو رہی ہے۔

مصنفہ نے تحقیق کے طریق کار کی روایت کو وقار بخشتے ہوئے کتاب کے آغاز میں 'تانیثیت کیا ہے اور اردو میں تانیثیت کے مسائل' کے موضوع پر اپنے مضمون میں سیر حاصل بحث کی ہے۔ تانیثیت کے ضمن میں مطالعہ نہ رکھنے والا قاری بھی اس سے متعارف ہو کر کتاب کے Discourse میں بآسانی شامل ہو سکتا ہے۔

وسیم بیگم نے اپنی اس ہفت بابی ضخیم کتاب میں بیسویں صدی سے اب تک کی تمام اہم اور ممتاز شاعرات کے کالم میں موجود تانیثی حسیت کو بڑی عرق ریزی سے تلاش کرنے کی سعی کی ہے۔ ان کی تحقیق سے متعلق محنت شاقہ اور جگر سوزی کا اندازہ ان کی اس کتاب میں شامل موضوعاتی زمرہ بندی سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ (1) آزادی سے پہلے خواتین شاعرات کی اردو شاعری (2) ترقی پسند تحریک کے دوران نظمیہ شاعری میں نسوانی آزادی کا احساس (3) جدیدیت کے آغاز کے ساتھ خواتین شعرا کا آزادیٔ اظہار پر اصرار (4) مابعد جدید خواتین شعرا کا سماجی قیود و رسوم کے خلاف پُرزور احتجاج (5) بیرونی ممالک میں بسی ہوئی خواتین شعرا کی نئی آوازیں وغیرہ۔

وسیم بیگم کا خیال ہے کہ 'دنیا کی نصف آبادی' عورت پر مشتمل ہے اس کے باوجود مردوں کی طرح عورت کو اپنے خیالات، جذبات اور احساسات کے اظہار کی آزادی حاصل نہیں ہے۔ آخر ایسا کیوں ہے؟ عورت کو جیتا جاگتا انسان سمجھنے کے بجائے اُسے ایک Commodity کیوں سمجھا جاتا ہے؟ وہ ایسے سوالات اس لیے بھی کھڑے کر رہی ہیں کیونکہ ان کا ماننا ہے کہ:

"Feminism is an awareness of women's oppression and exploitation in society at the place of work, within the family and conscious action to charge this situation ."

وسیم بیگم نے اس کتاب میں چند بہت ہی چبھتے ہوئے سوالات قائم کیے ہیں۔ یہ سوالات عورت اپنی خود کی ذات سے بھی پوچھتی ہے۔ اس کا یہ سوال سماج سے بھی ہے اور پوری کائنات سے بھی ہے۔ اس میں تجسس، دریافت اور احتجاج کی بھی لہریں موجزن ہیں:

''کیا عورت کے وجود کے بغیر مرد اکیلا اس دنیا کی افزائش کر سکتا ہے؟ ... کیا عورت مرد سے کسی بھی کام میں کم ہے؟ پھر اس کو اپنے خیالات اور جذبات کے اظہار کی اجازت کیوں نہیں ہے؟ ہمیشہ یہ سماج عورت ہی کو کیوں غلط ثابت کرتا ہے؟ ... لڑکی ہی کو کیوں رحم مادر میں قتل کر دیا جاتا ہے۔''

قابل مصنفہ جب اس نوعیت کا سوال کرتی ہیں تو وہ دراصل پوری اردو شاعری کی اُن شاعرات کی سوچ اور رجحان کی ترجمانی کر رہی ہوتی ہیں۔ شاعرات نے جابجا اپنی غزلوں اور نظموں میں احتجاج کے اونچے سُر میں اپنی شکایات درج کرائی ہیں۔ کتاب اس نوع کے مکالمات سے بھری پڑی ہے۔ یوں تو نسوانی حسیت کی تحریک مغربی ممالک میں انیسویں صدی میں شروع ہو گئی تھی۔ لیکن مشرقی ممالک بالخصوص برصغیر ہند و پاک میں اس کا آغاز بیسویں صدی میں ہوا۔ ڈاکٹر وسیم بیگم نے آزادی کے بعد کی ایسی شاعرات کے کلام کا بہت ہی محنت اور ایماندارانہ جائزہ لیا ہے۔ ان خواتین شعرا میں بعض ایک کے احتجاج کی لے تیز بھی ہے لیکن منجملہ سبھوں نے اپنی تانیثی حسیت کا بطور خاص اور برملا اظہار کیا ہے ان شاعرات میں ساجدہ زیدی، زاہدہ زیدی، ادا جعفری، فہمیدہ ریاض، کشور ناہید، شفیق فاطمہ شعریٰ، زہرہ نگاہ، پروین شاکر، رفیعہ شبنم عابدی، نور جہاں ثروت، شائستہ یوسف، سیدہ نسرین نقاش، شبنم عشائی، عذرا پروین، صادقہ نواب سحر، ترنم ریاض، حمیرا رحمٰن، فاطمہ حسن، نسیم سید، مونا شہاب، ذکیہ غزل اور عظمیٰ صبوحی سحر کے نام تخصیص کے ساتھ قابل ذکر ہیں جن کے ایک سے زائد مجموعہ کلام منظر عام پر آچکے ہیں۔ ان کے کلام نے اردو میں تانیثی حسیت کی شاعری کو اعتبار بخشا ہے اور مرد اساس سماج پر قدغن بھی لگائے ہیں۔

ایسی اور بھی شاعرات ہیں جو اپنی بات منوانے کی ضد میں جدوجہد کے اسٹیج پر ہیں لیکن اچھی بات یہ ہے کہ مرد اساس سماج کے خلاف جنگ رفتہ رفتہ اپنے عروج کی جانب

http://urducouncil.nic.in/Urdu-Duniya/Urdu-Duniya-June-2012/P74.jpg 1/1

گامزن ہے اور ایک تابناک مستقبل کے خواب کی مختصر بھی ہیں۔

مجھے یقین ہے کہ وسیم بیگم کا یہ اہم تحقیقی کام اور اس کام کے ساتھ جس مشن کا انھوں نے آغاز کردیا ہے وہ صدا بہ صحرا ثابت نہیں ہوگا بلکہ اس کی پذیرائی ادبی حلقوں میں یوں بھی ہوگی کہ معاشرہ خود بھی اس مخصوص نوعیت کی سوچ سے خود کو نجات دلانا چاہتا ہے۔ لہٰذا اس کا پرجوش استقبال کیا جائے گا۔

ادبی معلوماتی پہیلیاں



مصنف: ڈاکٹر شمیم احمد صدیقی نگینوی
صفحات: 120، قیمت: 74 روپے
ناشر: نسیم منزل، مدرج گنج، سیتاپور روڈ، لکھنؤ 20
مبصر: ڈاکٹر وسیم اقبال، محلہ: قاضی سرائے اوسل، نگینہ ضلع بجنور

یہ ایک حقیقت ہے کہ اردو زبان وادب کی ترویج میں سائنس دانوں، ڈاکٹروں اور انجینئروں کا بھی خاصہ ہاتھ رہا ہے۔ زیر تبصرہ کتاب کے مصنف ڈاکٹر شمیم احمد صدیقی ایک سائنس داں ہیں انھوں نے علم کیمیا میں ایم ایس سی پی ایچ ڈی اور کیمیاوی تحقیقات سے متعلق ملازمت کرنے کے ساتھ بچوں اور بڑوں میں اردو زبان کے فروغ کے لیے کئی ایسے تخلیقی کام کیے ہیں جن کو عابد سہیل جیسے صحافی وادیب اہم کارناموں کے زمرے میں رکھتے ہیں۔ پانچ سو پہیلیوں پر مشتمل موجودہ کتاب بھی اُن کے تحقیقاتی ذہن کی انوکھی مثال ہے۔ انھوں نے ہندوستان کی تاریخ، جغرافیہ، تمدن اور روزمرہ کی ضرورت سے متعلق پچاس موضوعات کے تحت دس دس پہیلیوں کے سیٹ اس انداز سے تیار کیے ہیں کہ یہ کتاب اردو کی ثقہ پڑھنے والے بچوں اور بڑوں کا نہ صرف دل بہلانے کا اچھا ذریعہ ہے بلکہ اردو زبان کے تئیں شغف پیدا کرنے، عام معلومات میں بے بہا اضافہ کرنے کے ساتھ اردو اور دیگر زبانوں کے نئے الفاظ سے متعارف کرانے کا بھی ذریعہ ہے۔ ہم اپنے احساسات کی تائید کے لیے کتاب کی چند پہیلیاں نقل کرتے ہیں۔ مشہور ہندوستانی خواتین سے متعلق ایک پہیلی اس طرح ہے۔

''ہندوستان کی خاتون وزیراعظم شریمتی اندرا گاندھی کا نام اُن کی شادی سے قبل کیا تھا یہ معلوم کرنے کے لیے آپ کو دو عددی لے کر پہیلی کو پردہ کی 'د' کی جگہ رکھنا ہے اور دوسری کو درشن کے بعد جوڑنا ہے۔''

عین ممکن ہے کہ معمولی اُردو جاننے والا قاری لفظ 'خاتون' اور 'وزیراعظم' کے معنی نہ جانتا ہو لیکن اس چٹکلے کو پڑھتے ہی ان دونوں الفاظ کے معنی سمجھ میں آجائیں گے۔ پہیلی کا جواب پر یہ دشواری یہ آسانی حل جائے گا لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ شریمتی اندرا گاندھی کا یہ نام ہندوستان کے پڑھے لکھے طبقے میں سے بھی تھوڑے لوگوں کو ہی معلوم ہوگا۔

بلاشبہ اس کتاب کی پہیلیوں کو مرتب کرنے میں ڈاکٹر شمیم نے خاصی دماغ سوزی کی ہے۔ انھوں نے انسانی نفسیات کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہر پہیلی کے ساتھ ایسے اشارے دیے ہیں کہ تھوڑی بہت دماغی ورزش کرنے کے بعد پہیلی کا حل تلاش کیا جاسکتا ہے۔

مصنف یہ بھوئی کرنے میں حق بجانب ہے کہ اس کتاب کی پہیلیاں اردو کے علاوہ دیگر زبانوں کے الفاظ سکھانے کا ذریعہ بھی ہیں مثلاً پرندوں سے متعلق یہ پہیلی ملاحظہ فرمائیں:

''اس پرندے کا نام بتائیں جو بڑے پر ہونے کے باوجود اڑ نہیں پاتا۔ جب وہ زمین پر دوڑ لگاتا ہے تو ایک تیز رفتار سائیکل سوار کو پیچھے چھوڑ دیتا ہے۔ عوام میں وہ اپنے دو لفظی فارسی نام سے ہی مشہور ہے جس کا اردو میں مطلب ہے 'اونٹ جیسا پرندہ' اس پرندے کے نام کا پہلا حرف 'ش' اور آخری حرف 'غ' ہے۔'' یہ تو ظاہر ہے کہ بڑے پروں والا پرندہ جس کے نام کا پہلا حرف 'ش' اور آخری حرف 'غ' ہے سوائے شُتر مرغ کے دوسرا کوئی پرندہ نہیں ہوسکتا اور تھوڑا بہت دماغ پر زور دینے کے بعد قاری اس جواب کو پالے گا لیکن اپنے قاری کو فاضل مصنف نے یہ جانکاری بھی دی ہے کہ پرندے کا یہ نام اصلاً فارسی زبان سے لیا گیا ہے اور یہ کہ فارسی میں اونٹ کو شُتر اور پرندے کو مرغ کہتے ہیں۔ اس پہیلی میں یہ بات بھی واضح کی گئی ہے کہ شتر مرغ خاصی تیز رفتار سے دوڑ سکتا ہے۔ اسی طرح ڈاکٹر شمیم نے ان پہیلیوں کے ذریعے ہندی، انگریزی اور عربی زبان کے بعض الفاظ سے متعارف کرایا ہے۔

کتاب میں شامل تمام پانچ سو پہیلیوں کے جوابات آخری صفحات میں دیے گئے ہیں لیکن مرتب نے 'اپنی بات' کے تحت قاری کو یہ مشورہ دیا ہے کہ وہ جواب دیکھنے میں جلدی نہ کریں بلکہ قدرے دماغی ورزش کرکے ازخود جواب تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کریں۔

کتاب کے ٹائٹل کور پر تاج محل کی تصویر غالباً اس لیے دی گئی ہے کیونکہ تاج محل سے متعلق ایک پہیلی بھی کتاب میں شامل ہے۔ کاغذ، چھپائی اور جزبندی سب ہی معقول ہیں۔ کتاب کی غلطیاں ڈھونڈھنے پر بھی ہاتھ نہیں آئیں۔ بچوں اور کمزور نظر والوں کی رعایت میں حروف کا سائز بھی قدرے بڑا رکھا گیا ہے۔ مرتب نے زیادہ سے زیادہ افراد کو فیض پہنچانے کی غرض سے صوبۂ یوپی کے علاوہ دیگر صوبوں کے اہم مقامات کے پتہ بھی درج کیے ہیں جہاں یہ کتاب دستیاب ہے۔

پرواز قلم



مصنفہ: ڈاکٹر زیبا زینت
صفحات: 104، قیمت: 150 روپے
ناشر: سکریٹری انجمن فروغ اردو، پے پور (راجستھان)
مبصر: محمد زبیر خان (سعیدی) شاہین باغ، نئی دہلی 110025

'پرواز قلم' ڈاکٹر زیبا زینت کے منتخب علمی، ادبی، اسلامی، ثقافتی اور تاریخی مضامین پر مشتمل مجموعہ ہے۔ اس مجموعے میں کل 14 مختلف النوع مضامین ہیں اور تمام مضامین اس لیے اور زیادہ قابل قدر اور محترم ہیں کہ ان کی اشاعت ہندوستان کے مختلف باوقار جرائد اور رسائل میں ہوچکی ہے۔

پرواز قلم کا مقدمہ ڈاکٹر ابوالفیض عثمانی سابق پرنسپل گورنمنٹ پی جی کالج ٹونک کا تحریر کردہ ہے۔ بقول عثمانی صاحب 'راجستھان کے موجودہ ابھرتے ہوئے نوجوان ادیبوں اور شاعروں میں ڈاکٹر زیبا زینت کا نام نمایاں نظر آنے لگا ہے۔ وہ ان کے تابناک ادبی مستقبل کی نشان دہی کرتا ہے'' میں عثمانی صاحب کے اس قول سے صد فیصد متفق ہوں ان کے متنوع مضامین پڑھنے سے بخوبی اس صلاحیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ مجموعے کا نام 'پرواز قلم' مضامین کے موضوعات سے بالکل موافق ہے۔

زیر نظر مجموعہ کے چند مضامین اپنے موضوع اور فن کے اعتبار سے کافی انفرادیت کے حامل ہیں۔ 'حسن انسانیت دوراہ وحدت اسلامی' اور 'اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد' کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ مصنفہ کی تاریخ اسلام بالخصوص سیرت النبیؐ پر گہری نظر ہے۔ 'تحریک آزادی ہند میں اردو صحافت کی خدمات' اور 'جنگ آزادی کی تحریک' سے متعلق مضامین کو پڑھ کر یہ بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ مصنفہ تاریخ پر قابل قدر نگاہ رکھتی ہیں۔ مسلم مجاہدا کی قربانیوں کا ذکر کافی اہم ہے اور اس سلسلے میں محترمہ کے جو فہرست فراہم کی ہے وہ بھی خصوصیت کی حامل ہے۔

خواجہ غریب نواز، سرسید کے ابوالکلام آزاد اور علامہ اقبال یہ وہ نام ہیں جن پر لکھنے کی جسارت کرنے سے قبل خود کو آئینے میں دیکھنا پڑتا ہے، مصنفہ نے نہ صرف یہ جسارت کی

ہے بلکہ حق کی بھرپور ادائیگی بھی کی ہے۔ خواجہ معین الدین چشتیؒ کے مذہبی اور روحانی جنون کی قدریں بھی شاملِ مضمون ہیں اور سرسید علیہ الرحمہ اور ان کے رفقا کے کارہائے زریں کو بھی بخوبی نمایاں کیا ہے۔ اختصار اور جامعیت دونوں کا حسین امتزاج محترمہ کے قلم میں نظر آتا ہے۔ آگے تحریکِ آزادیِ ہند میں اتحاد کے علمبردار مولانا ابوالکلام آزاد کا تذکرہ اور شاعرِ مشرق، علامہ اقبال کی شاعری میں خواتین کا تذکرہ۔ ان کو محترمہ نے جس انداز میں پیش کیا ہے وہ بھی قابلِ تحسین ہے۔ اسلامی تاریخ کے نسائی کردار فاطمہ بنت عبداللہ پر علامہ اقبال کی تحریر کا حوالہ بھی موجود ہے۔ واضح رہے کہ یہ وہی فاطمہ ہیں جو طرابلس کی جنگ میں غازیوں کو پانی پلاتے ہوئے شہید ہو جاتی ہیں۔

اور پھر منشی پریم چند کی عدیم المثال ناول نگاری کا تذکرہ بھی خوب ہے، پروین شاکر کا رنگ خوشبو اور احمد فراز کے جذبات کی مکاکی کی پذیرائی بھی مصنفہ نے جامعیت کے ساتھ بیان کی ہے۔ اس کے علاوہ راجستھان کی ادبی بالخصوص شعری تاریخ سے متعلق رسائل و جرائد میں شائع شدہ مضامین اور راجستھان سے متعلق مطبوعہ تخلیقات کے حوالوں سے مصنفہ نے راجستھان کی مطبوعہ ادبی تاریخ کے منتشر اجزا کی جس طرح نشاندہی کی ہے اس کے مطالعے سے پوری تصویر نظر کے سامنے آجاتی ہے۔

اس مجموعے کا سب سے اہم اور نادر عنصر اس کے مضامین کی ترتیب ہے۔ ابتدا محسنِ انسانیت سے پھر کربلا کا تذکرہ اور پھر خواجہ غریب نواز۔ درمیانی مضامین میں سرسید، ابوالکلام آزاد اور علامہ اقبال کا تذکرہ۔ پھر تحریکِ آزادی میں صحافتی خدمات کا تذکرہ، اس کے بعد ادبی نگارشات پر توجہ مبذول کی گئی ہے جہاں منشی پریم چند، پروین شاکر، اختر شیرانی اور شاعر جذبات احمد فراز پر اکتفا کیا گیا ہے۔ آخر کے مضامین میں حالاتِ حاضرہ اور اردو زبان کے تقاضے اور مسائل پر گفتگو کی ہے اور پھر شاہکار مضمون راجستھان کی مطبوعہ ادبی تاریخ کے منتشر اجزا پر اس مجموعے کا احاطہ کیا گیا ہے۔

راجستھان کی ادبی تاریخ اور بالخصوص شعری تاریخ سے متعلق رسائل و جرائد اور ادبی تقریبات کی روداد دل میں شائع شدہ مضامین و مقالات اور مطبوعہ شعری گلدستوں کے علاوہ مطبوعہ علاقائی تذکروں اور راجستھان سے متعلق کتابوں اور پی ایچ ڈی کے مطبوعہ مقالات کے حوالوں سے محترمہ نے راجستھان کی مطبوعہ ادبی تاریخ کے منتشر اجزا کی اس طرح نشاندہی کی ہے کہ اس کی پوری تصویر نظر کے سامنے آجاتی ہے لیکن اس کو مزید تحقیقی مواد کے اضافے کے ساتھ از سرِ نو مرتب کرنے کی ضرورت ہے۔

قارئین کے لیے یہ مضامین مختلف النوع ضرور ہیں لیکن محترمہ نے جس انداز میں اختصار کے ساتھ بحسن خوبی ان کا حق ادا کیا ہے طلبا بالخصوص نوجوان نسل کو یہ ضرور پسند آئیں گے۔

طباعت اور پروف کی غلطیوں کو میں نے اس لیے نظر انداز کیا ہے کہ شاید یہ علاقائی مجبوری ہے لیکن مصنفہ مستقبل میں اس کا اعادہ نہ کریں تو قارئین کو ہر لحاظ سے ایک بہتر تصنیف پڑھنے کو ملے گی۔ امید ہے ادبی حلقہ اس کوشش کو نہ صرف پسند کرے گا بلکہ مصنفہ کو داد و تحسن سے بھی نوازے گا۔



گردشِ دوراں

مصنف: حسن ساہو

صفحات: 299، قیمت: 350 روپے

ناشر: میزان پبلشرز، سرینگر کشمیر

مبصر: ریحانہ فاطمہ، F-148، شاہین باغ، نئی دہلی 25

اردو کے ادبی منظرنامے پر روزانہ مختلف موضوعات پر کتابیں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ ان میں بعض کتابیں بھی ایسی ہوتی ہیں جو قارئین کو اپنی جانب متوجہ کرتی ہیں۔ اردو کے افسانوی ادب پر بھی کتابیں کثرت سے شائع ہو رہی ہیں جن میں عصری مسائل اور انسانی زندگی کے گوناگوں پہلوؤں کو موضوعِ گفتگو بنایا جا رہا ہے۔ کشمیر سے کنیا کماری تک ایسے افسانوں کا ایک طویل سلسلہ ہے۔ اس سلسلے کی ایک کڑی ہندوستان کی ریاست اور جنت ارضی سے بلند ہونے والی آواز ہے جس نے قارئین کو اپنی جانب متوجہ کیا ہے۔ یہ ریاست گزشتہ دو دہے سے عدم استحکام کا شکار ہے لیکن ان حالات میں بھی وہاں کے ادیبوں نے قلم کو جاری و ساری رکھا۔

زیرِ تبصرہ کتاب گردشِ دوراں جناب حسن ساہو کے افسانوں کا مجموعہ ہے۔ 299 صفحات کی اس کتاب میں 27 افسانے اور 36 افسانچے شامل ہیں۔ حسن ساہو کشمیر کے ایک ممتاز ترقی پسند افسانہ نگار ہیں۔ آپ کے تمام افسانوں میں حقیقت نگاری کا فن موجود ہے۔ وہ ایک منجھے ہوئے افسانہ نگار ہیں اور صحافی بھی ہیں۔ میں نے تقریباً ان کی اس کتاب میں شامل سبھی افسانوں اور افسانچوں کا دلچسپی سے مطالعہ کیا ہے۔ اس کتاب میں ان کے جتنے بھی افسانے ہیں وہ کسی نہ کسی انسانی قدروں کے اردگرد گھومتے نظر آتے ہیں۔ مصنف نے صحافت اور ادب دونوں میدانوں میں قلم آزمایا ہے۔ اس کتاب کے بہت سے افسانے پڑھنے کے بعد مجھے محسوس ہوتا ہے کہ حسن ساہو نے ایک عام قاری کے لیے قلم اٹھایا ہے اور لگتا ہے کہ اس میں بہت سے واقعات انھوں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھے ہیں اور سماج میں پھیلی ہوئی مکاری عیاری اور جبر و ظلم کی وارداتوں کو انھوں نے بہت قریب سے دیکھا اور محسوس کیا ہے۔ پھر اسی کو اپنے افسانوں کا موضوع بنا کر پیش کیا۔

جیسے 'مندر سے مسجد تک' کو ہی لیجیے۔ انھوں نے ایک مقام پر بیساکھی بابا کے جلوس کو کیسے قلم بند کیا ہے: ''صاحب سب مذاہب و عقیدوں سے بڑھ کر بھی ایک عقیدہ ہے۔ ایک مذہب ہے وہ ہے انسانیت کا جس نے انسانیت کی راہ کو اپنایا۔ اس نے داتا اور جگ کے مالک کی خوشنودی حاصل کر لی۔''

یہ سب افسانے ہی نہیں بلکہ سچے واقعات ہیں۔ گردشِ دوراں کے افسانے میں زمانے کی گردشوں کو پیش کیا گیا ہے۔ چودھری سمیع اللہ کا خوش حال گھرانہ کیسے انھیں کہاں سے کہاں لے جاتا ہے۔ اس افسانے کے Tible میں شاید کمپیوٹر کی ایک چھوٹی غلطی ہوئی ہے۔ دوراں کی جگہ رواں لکھا گیا ہے۔ 'اندھا کنواں' کے بارے میں لوگوں کے تاثرات پڑھ کر میرا رگِ تجسس جاگ اٹھا ہے کہ افسانہ ضرور پڑھا جائے۔ حقیقت میں افسانے کی خوبی یہ ہونی چاہیے کہ وہ افسانہ نہ لگے بلکہ سچے واقعات معلوم ہوں۔

حسن ساہو نے ان افسانوں میں زبان بہت آسان عام فہم استعمال کی ہے۔ وہ اپنی گونا گوں مصروفیات کے باوجود ان افسانوں اور افسانچوں کو نکھارا کیا۔ وہ اور ان کی کہانیوں میں خوبصورت اور برمحل الفاظ محاوروں کا استعمال خوب نظر آتا ہے۔ ان کے افسانوں میں ایک خوبی یہ ہے کہ جیسے جیسے قاری آگے بڑھتا ہے اس کا تجسس بڑھتا جاتا ہے۔

مصنف کے افسانے پڑھنے سے محسوس ہوتا ہے کہ وہ اتنے ماہر افسانہ نگار کیسے بنے۔ ضرور انھیں کسی واقعے نے مجبور کر دیا ہے یا کوئی سوچ تڑپا دیتی ہے جس کے سامنے وہ قلم اٹھانے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ ان کی کہانیوں کے کردار ہمارے آس پاس رہنے والے لوگ ہی ہوتے ہیں۔ حسن ساہو کیری نگر سے نکلنے والا ہفتہ وار دوراں اور روزنامہ گردش کے ایڈیٹر Journalist ہیں۔ وہ حال ہی میں اڈیٹرس کانفرنس کے ممبر، کشمیر پریس کے ممبر، آل انڈیا انجمن کمیٹی کے ممبر، یادگار رستی کمیٹی کے جنرل سکریٹری وغیرہ ہیں۔ ساہو صاحب کے بہت سے پبلی کیشنز بھی شائع ہو چکے ہیں۔ حسن ساہو حقیقت میں مبارکباد کے مستحق ہیں۔ ◘

اردو دنیا ٹیلی ایڈیشن

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان اور ای ٹی وی اردو چینل کے پروگرام اردو دنیا نے اپنی نشریات کا آغاز ہوئے ایک سال سے زیادہ کا عرصہ ہوگیا ہے۔ پروگرام کے دوران ناظرین کی تعداد میں لگاتار اضافہ ہوا ہے۔ جنوری 2011 سے اب تک کل 56 اپی سوڈ پیش کیے گئے ہیں۔ اس میں کونسل کی علمی، ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ کونسل کے اردو عربی مراکز کی سرگرمیوں کو بھی ملک و بیرون ملک کے اردو ناظرین کے لیے نشر کیا جاتا ہے۔ کونسل کی کتابوں پر تبصرے، اردو کی اہم اور مقتدر شخصیات اور ادبا کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر بھی تفصیلی جائزے پیش کیے جاتے ہیں۔ ہندوستان کا پہلا اردو ٹی وی چینل ای ٹی وی اردو گزشتہ دس برسوں سے ٹیلی ویژن نشریات کی خدمات دیتا رہا ہے اور جنوری 2011 میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کی ادبی و ثقافتی سرگرمیاں بھی ٹیلی ویژن نشریات کا اہم حصہ بن گئی ہیں۔ ہفتہ وار اردو دنیا سنیچر کی شام آٹھ بجے اور اتوار کی صبح ساڑھے دس بجے نشر کیا جاتا ہے۔ ملک میں اردو کے تئیں بیداری اور حکومت کی پالیسیوں کو اردو عوام تک پہنچانے کے لیے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے ٹیلی ایڈیشن کا آغاز کیا جس کے مثبت نتائج برآمد ہو رہے ہیں۔ 'اردو دنیا ٹیلی ایڈیشن' پروگرام کا آغاز ہر ہفتے قومی اردو کونسل سے متعلق خبرنامے سے ہوتا ہے اور اردو کی ترقی و ترویج سے دلچسپی رکھنے والے ناظرین کے ان سوالات کا جواب قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان دہلی کے ذمہ داران کے ذریعے دیا جاتا ہے جن کا تعلق قومی اردو کونسل کی اسکیموں اور ان کے نفاذ سے ہوتا ہے 'اردو دنیا ٹیلی ایڈیشن' کے ناظرین کی دلچسپی کے لیے ہر اپی سوڈ میں اردو اور فلموں کے تعلق سے ایک سوال بھی کیا جاتا ہے اور اس کا صحیح جواب دینے والوں کا نام اگلے اپی سوڈ میں دکھایا جاتا ہے۔ اسی طرح 'اردو دنیا' کے ہر اپی سوڈ میں جہاں اردو زبان و ادب میں گراں قدر خدمات انجام دینے والی کسی ایک اہم شخصیت کا تعارف پیش کرنے کے ساتھ ساتھ اس کے ادبی سفر پر تفصیلی رپورٹ پیش کی جاتی ہے وہیں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان دہلی کے زیر اہتمام شائع ہونے والی اہم کتابوں کا جائزہ بھی اردو ناظرین کے لیے پیش کیا جاتا ہے۔ ناظرین اپنے تاثرات بھیجنے کے لیے ان ای میل آئی ڈیز کا بھی استعمال کر سکتے ہیں: urducouncil@gmail.com, urduduniya@etv.co.in

جون 2012 کی نشریات

2 جون 2012 بروز ہفتہ

جون کے پہلے ہفتے میں رات ساڑھے آٹھ بجے اردو دنیا میں پیش کیے جانے والے پروگرام میں صوبہ آندھرا پردیش کے ضلع کڑپا میں این سی پی یو ایل دہلی کے تعاون سے بخاری ایجوکیشن سوسائٹی کے زیر اہتمام چلنے والے کمپیوٹر ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ کی کارکردگی پر خاص رپورٹ پیش کی جائے گی۔ اسی پروگرام میں ڈائریکٹر جنرل دوردرشن نیوز، جناب ایس ایم خان سے گفتگو بھی کی جائے گی۔ وہ 1982 بیچ کے آئی آئی ایس آفیسر ہیں۔ اس سے پہلے وہ اے پی جے عبدالکلام کے پریس سیکریٹری بھی رہ چکے ہیں۔ انھوں نے سی بی آئی کے ساتھ بھی کام کیا ہے۔


ایس ایم خان

9 جون 2012 بروز ہفتہ

اس رات کے اپی سوڈ میں صوبہ اڑیسہ کے ضلع بھدرک میں این سی پی یو ایل کے اشتراک سے چلنے والے غوثیہ کمپیوٹر سینٹر کی کارکردگی پر خاص رپورٹ پیش کی جائے گی۔ اسی اپی سوڈ میں ممتاز ادیب اور مغربی بنگال اردو اکادمی کے نائب چیئرمین منان شاہ القادری کے فکر و فن پر ایک خاص رپورٹ پیش کی جائے گی۔ منان شاہ القادری کی مختلف موضوعات پر نصف درجن کتابیں شائع ہو کر منظر عام پر آچکی ہیں۔


منان شاہ القادری

16 جون 2012 بروز ہفتہ

اس رات 'اردو دنیا' کے خاص اپی سوڈ میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کے اشتراک سے جموں و کشمیر کے ضلع باندی پور میں چلنے والے انفوٹیک کمپیوٹر ایجوکیشن سینٹر کی کارکردگی پر خاص رپورٹ پیش کی جائے گی۔ اسی اپی سوڈ میں صوبہ اتر پردیش کے ضلع بلرام پور کے مشہور استاد شاعر بیکل اتساہی کے فکر و فن پر خاص رپورٹ پیش کی جائے گی۔ بیکل اتساہی راجیہ سبھا کے رکن بھی رہ چکے ہیں۔


بیکل اُتساہی

23 جون 2012 بروز ہفتہ

اس رات کے اپی سوڈ میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کے اشتراک سے صوبہ اتراکھنڈ کے ضلع نینی تال کے، ہلدوانی میں چلنے والے یونیورسل ویژن کمپیوٹر سینٹر کی کارکردگی پر رپورٹ پیش کی جائے گی۔ اسی اپی سوڈ میں دہلی کے ممتاز افسانہ نگار ایس ایم اشرف کے ادبی سفر پر خاص رپورٹ پیش کی جائے گی۔


ایس ایم اشرف

30 جون 2012 بروز ہفتہ

اس اپی سوڈ میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کے اشتراک سے صوبہ مغربی بنگال کے مرشد آباد میں پالسا پلی انین سمتی کے زیر اہتمام چلنے والے کمپیوٹر سینٹر کی کارکردگی پر رپورٹ پیش کی جائے گی۔ اس کے علاوہ سول سروسیز کے امتحانات میں کامیاب ہونے والے مسلم طلبا پر اور اردو کے ذریعے کامیاب ہونے والے امیدواروں پر اظہار خیال کیا جائے گا۔ اس کے علاوہ ان طلبا کی کارکردگی پر بھی خاص رپورٹ پیش کی جائے گی جنھوں نے اردو کے ذریعے سول سروسز کے امتحانات میں کامیابی حاصل کی ہے۔



یوسف عامر

مصر کی پانچ یونیورسٹیوں میں اردو کی تعلیم

آج اردو زبان ساری دنیا میں پھیلتی جارہی ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ یہ بہت فراخ دل زبان ہے۔ اس میں دنیا کی تمام زبانوں کے الفاظ واصطلاحات کثرت سے استعمال ہوتے ہیں۔ اردو زبان کا مزاج جمہوری ہے۔ وسیع المشربی اس زبان کا طرہ امتیاز ہے۔ اس میں وافر مواد کی وجہ سے موجودہ زمانے میں عرب ممالک، امریکا اور سارے یورپی ممالک مثلاً فرانس، انگلستان، جرمنی اور کناڈا، افریقہ اور ایشیا میں پڑھائی جاتی ہے۔

مصر پہلا عرب ملک ہے جس میں سب سے پہلے اس زبان کی تعلیم وتدریس کا سلسلہ شروع ہوا۔ اس لیے کہ یہ زبان مواد اور علمی میراث کے لحاظ سے بہت امیر ہے۔ جیسا کہ سب کو معلوم ہے کہ کوئی بھی زبان دو وجوہ سے پڑھی اور پڑھائی جاتی ہے: اول معاش یعنی اس زبان کے بولنے والوں کی معاشی صورت حال کیا ہے۔ دوم اس زبان میں کتنا علمی مواد موجود ہے۔ مصر میں اردو زبان موخرالذکر سبب سے پڑھائی جاتی ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ مسلمانوں کی تہذیب، تاریخ، افکار اور روایات سے متعلق جتنا وقیع اور وافر مواد اردو زبان میں ملتا ہے دوسری زبانوں کے مقابلے میں کم نہیں ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ مصریوں کے نزدیک اسلامی تاریخ اور تہذیب وثقافت کی تشکیل چار زبانوں میں ہوئی۔ عربی، فارسی، ترکی اور اردو۔ عربی عرب ممالک کی قومی، تہذیبی اور سرکاری زبان ہے اس لیے مصری یونیورسٹیوں میں دوسری تین زبانوں کی تعلیم وتدریس پر بڑی اہمیت دی گئی یہاں ایک اور قابل ذکر بات ہے کہ اردو زبان کے بولنے والوں کی تعداد دنیا بھر کے مسلمانوں کی نصف تعداد سے زیادہ ہے۔

آج کل اردو زبان مصر کی پانچ یونیورسٹیوں میں پڑھائی جاتی ہے۔ قاہرہ میں ازہر یونیورسٹی، قاہرہ یونیورسٹی اور عین شمس یونیورسٹی میں، اور قاہرہ سے باہر اسکندریہ یونیورسٹی اور منصورہ یونیورسٹی میں۔ ان تمام یونیورسٹیوں میں اردو زبان وادب کی اعلیٰ ترین ڈگری یعنی ڈاکٹریٹ تک تعلیم دی جاتی ہے۔

مصر میں اردو کی تدریس میں قاہرہ یونیورسٹی کو



اولیت کا شرف حاصل ہے۔ یہاں بیسویں صدی کی پانچویں دہائی میں اردو زبان فیکلٹی آف آرٹس کی مشرقی زبانوں کے شعبے کا ایک جزو بن گئی ہے۔ اس شعبے میں پڑھنے والے طالب علم عربی زبان کے ساتھ ساتھ تین زبانیں اور پڑھتے ہیں۔ اسلامی زبانوں کے شعبے میں فارسی زبان لازمی ہے۔ اردو اور ترکی اختیاری ہیں۔ اردو زبان اختیار کرنے والا طالب علم ہفتے میں چھ گھنٹے اردو زبان اور اس سے متعلقہ موضوعات پڑھتا ہے۔ اردو زبان کی اس سہ سالہ تعلیم سے طالب علم میں اس قدر استعداد پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ باآسانی ادبی کتابوں کو چاہے وہ نثر میں ہوں یا نظم میں عربی زبان کا جامہ پہنا سکتا ہے۔

بے شک 'جامعہ ازہر' دنیا بھر کی سب سے پرانی یونیورسٹی ہے اس میں دینی تعلیم وتدریس کا سلسلہ 363 ہجری میں شروع ہوا۔ پھر 1960 سے دینی اور اسلامی علوم کی تدریس کے ساتھ ساتھ سائنس اور دوسرے جدید علوم کی تدریس شروع ہوئی اور چونکہ اردو زبان ایک سیکولر اور مشترکہ زبان ہوتے ہوئے بھی اسلامی دنیا کی بڑی زبانوں میں سے ایک ہے، اس لیے 1962 میں اردو کی اہمیت اور ضرورت کو محسوس کر کے جامعہ ازہر کے فیکلٹی آف 'اصول الدین' کے شعبہ دعوت وارشاد میں اردو کی تدریس شروع ہوئی، پھر 1979 میں جامعہ ازہر ہی کے فیکلٹی آف لینگویجز اینڈ ٹرانسلیشن میں اردو زبان کا ایک باقاعدہ شعبہ قائم ہوا۔ مصر میں صرف اردو زبان پڑھانے کا مستقل ادارہ ''کلیۃ اللغات والترجمۃ جامعۃ الأزہر Faculty of Languages & Translation, Al Azhar کا شعبہ اردو ہے۔ اس شعبے کی اصل تدریسی زبان اردو



قاہرہ یونیورسٹی



ہے۔علاوہ ازیں شعبے کا تدریسی نظام مصر کی دوسری یونیورسٹیوں سے مختلف ہے۔ یہاں طالب علم ثانوی تعلیم کے بعد چار سال تک اردو زبان اور اس سے متعلقہ مضامین پڑھتا ہے۔انگریزی کے ساتھ ساتھ فارسی زبان بھی ثانوی حیثیت سے پڑھائی جاتی ہے۔

خلاصہ ہے کہ موجودہ مصری ثقافت کی تشکیل میں اردو زبان کی بڑی حیثیت ہے۔ فی الحال عرب ممالک میں جتنے برصغیر کے لوگ بستے ہیں سب کے سب آپس میں اردو میں بولتے ہیں چاہے ان کی مادری زبان ہندی ہو یا پنجابی، سندھی یا بنگالی، کشمیری ہو یا ملیالم وغیرہ۔

'اخبار اردو' کے مراسلہ نگار سعید اے شیخ نے لکھا کہ چار سال قبل سعودی عرب جانے کا اتفاق ہوا۔ مدینہ منورہ میں مسجد نبوی کے قریب ہی بہت وسیع کھجور مارکیٹ ہے۔دکانیں تو سعودیوں کی ہیں مگر انھوں نے سیل کے لیے بنگلہ دیشی اور انڈونیشی ملازم رکھے ہوئے ہیں۔ مجھے یہ دیکھ کر خوش گوار حیرت ہوئی کہ یہ دونوں ملازم آپس میں اردو میں گفتگو کر رہے تھے حالانکہ نہ تو بنگلہ دیشی کی مادری زبان اردو تھی اور نہ ہی انڈونیشی کی مادری زبان اردو تھی مگر دونوں اردو میں گفتگو کر رہے تھے۔''

دراصل علم وادب سے محبت اپنی جگہ، مگر روٹی روزگار کا مسئلہ بھی اہمیت رکھتا ہے۔ظاہر ہے یہاں اردو میں ایم اے اور پی ایچ ڈی کرنے والوں کی مادری زبان عربی ہے لیکن جب وہ عربی کے بجائے اردو میں اعلیٰ ڈگریاں حاصل کرتے ہیں تو اپنے روزگار کے لیے یونیورسٹیوں میں اعلیٰ ڈگریوں کے حصول کے بعد یونیورسٹیوں، ریڈیو، ٹیلی ویژن، صحافت، مصر کے محکمہ آثار قدیمہ، محکمہ ثقافت، ترجمہ اور سیر وسیاحت وغیرہ کے شعبوں میں ملازمتیں حاصل کرتے ہیں، لیکن بہت کم تعداد میں۔

اس کے علاوہ مصر میں اردو زبان وادب اور معاشرے پر سیمینار ہوتے ہیں۔لیکن اس پر امید افزا پس منظر کے باوجود واقعہ یہ بھی ہے کہ عام مصری معاشرے میں اردو بول چال کا کوئی رواج نہیں ہے۔صرف بازاروں میں محدود تعداد اور مخصوص حلقوں میں اردو سمجھنے والے پائے جاتے ہیں یا برصغیر کے لوگ ہیں جو مصر میں رہتے ہیں۔ اس طرح اردو کتابیں آپ کو کسی کتب فروش کے ہاں نہیں مل پائیں گی۔پاکستان اور ہندوستان سے اردو کتابیں حاصل کرنی پڑتی ہیں۔ مذکورہ بالا یونیورسٹیوں کی لائبریریوں کے سوا کسی لائبریری میں اردو کتابیں شاذ ونادر ہی ہیں۔ان پانچ یونیورسٹیوں کی لائبریریوں میں بھی اردو کتابوں کی تعداد اطمینان بخش نہیں ہے۔اخبارات اور رسائل کا حال تو اور بھی یوں ہی سا ہے۔سوائے انڈین کلچرل ہاؤس کے جہاں 'آج کل' اور دو ایک رسائل آتے ہیں اور کہیں رسائل نظر نہیں آتے۔ پاکستانی سفارت خانے میں اردو اخبارات اور رسائل ملتے ہیں لیکن بہت ہی کم۔

یہ ایک مسلم حقیقت ہے کہ مسلمانوں کی تہذیب، تاریخ، افکار اور روایات سے متعلق جتنا بڑا ذخیرہ اردو میں ملتا ہے وہ عربی اور فارسی کے مقابلے میں کم نہیں ہے۔اردو نے عربی اور فارسی کے سرچشموں سے اکتساب کیا تھا اور کرتی رہے گی لیکن اپنے ارتقائی سفر میں موضوعات اور مضامین کے تنوع کے اعتبار سے آج اردو بہت آگے جا چکی ہے ترقی کی اس رفتار کا اندازہ برصغیر ہند وپاک سے آگے مشرق اور مغرب کے بہت سے ملکوں میں اردو کی صورت حال سے لگایا جا سکتا ہے۔آج ساری دنیا میں اردو کی پذیرائی اور حوصلہ افزائی ہو رہی ہے ایک خوش آئند بات ہے۔■

بشکریہ: دستاویز اردو، راشٹریہ سہارا، دہلی

Prof. Dr. Yousuf Aamir/Urdu Dept. Azhar University, Qahira



امریکہ

اے آر رحمٰن کو ڈاکٹریٹ کی ڈگری

ڈیٹن: آسکر انعام یافتہ موسیقار اے آر رحمٰن کو پہلی بار امریکہ کی میامی یونیورسٹی نے ڈاکٹریٹ کی ڈگری سے نوازا ہے۔ یونیورسٹی کی 173 ویں سالانہ تقریب کے دوران موسیقی کے شعبے میں نمایاں خدمات کے اعتراف میں عالمی شہرت یافتہ موسیقار اے آر رحمان کو ڈاکٹریٹ کی ڈگری سے نوازا گیا۔ یہ تقریب اوہیو صوبہ کے آکسفورڈ میں اگیمر اسٹیڈیم میں منعقد کی گئی۔اے آر رحمٰن کو چوتھی بار ڈاکٹریٹ کی ڈگری ملی ہے۔اس سے قبل رحمٰن کو یہ اعزاز علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، انا یونیورسٹی اور برطانیہ کی مڈلیکس یونیورسٹی سے مل چکا ہے۔ رحمٰن نے اس موقعے پر اپنے خطاب میں کہا کہ ''میں ان سبھی لوگوں کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں جن کا میری زندگی میں اہم کردار رہا ہے۔ میرے والد اور میری ماں نے مجھے اچھی اقدار سے نوازا۔ فلم ساز منی رتنم کا بھی میں شکریہ ادا کروں گا جنھوں نے اپنی فلم 'روجا' میں مجھے بریک دے کر عالمی سنیما کے لیے دروازے کھولے''۔ رحمٰن نے کئی ہٹ فلموں جیسے بامبے، دل سے، تال، لگان، جودھا اکبر، دہلی 6، اور راک اسٹار میں موسیقی دی ہے۔ حال ہی میں رحمٰن رونالڈ اسٹون لیمڈ مائک جیگر، جوس اسٹون، ڈیبیجین مارلے اور ڈیوا اسٹیورٹ کے ساتھ ان کے تین الاقوامی بینڈ سپر ہیوی کے لیے کام کر چکے ہیں۔

روزنامہ راشٹریہ سہارا دہلی، 10 مئی 2012



جاپان

'اردو نیٹ جاپان' کا تین سالہ سفر

فخر دھلی: جاپان سے شائع ہونے والے اردو روزنامہ 'اردو نیٹ جاپان' کی تیسری سالگرہ کی تقریب کیمپئی روم اسکول آف لینگویج لٹریچر اینڈ کلچر اسٹڈیز جواہر لعل نہرو یونیورسٹی میں منائی گئی۔تقریب کی صدارت پروفیسر کرشنا سوامی لچی متوا اور قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر خواجہ اکرام نے کی۔ نظامت شعیب رضا فاطمی نے انجام دی۔''اردو کا سامیر میڈیا اور اردو نیٹ جاپان کا تین

سالہ سفر کے عنوان سے منعقد اس مذاکرے میں دانشورانِ علم و ادب، اساتذہ اور طلبا و طالبات نے شرکت کی۔ استقبالیہ کلمات ادا کرتے ہوئے ڈاکٹر خواجہ اکرام نے اردو نیٹ جاپان کا تعارف پیش کیا۔ انھوں نے آن لائن اردو صحافت کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے اردو نیٹ جاپان کے مدیر اعلیٰ ڈاکٹر ناصر ناکاگاوا کی خدمات کا جائزہ لیا اور کہا کہ سائبر میڈیا کا اسلوب موجودہ زمانے میں زیادہ توجہ کا مستحق ہے۔ اظہار خیال کرنے والوں میں ڈاکٹر افضل مصباحی، پروفیسر معین الدین، ڈاکٹر آصف زہری، ڈاکٹر سید اختر حسین کے علاوہ دی سنڈے انڈین (اردو) کے اسسٹنٹ ایڈیٹر محمد آصف ریاض نے اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ آج کے پرآشوب دور میں سائبر میڈیا کے توسط سے امن و محبت کے پیغام کو عام کیا جاسکتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ اردو نیٹ جاپان محبت و امن کا پیامبر ہے اور شعیب رضا فاطمی نے اردو نیٹ جاپان کے چیف ایڈیٹر ڈاکٹر ناصر ناکاگاوا کا برقی پیغام پڑھ کر سنایا۔ پروگرام کے اختتام پر اردو نیٹ جاپان کے بیورو چیف کامران غنی نے مہمان گرامی اور سامعین کرام کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ جدید میل دہلی، 9 مئی 2012



کناڈا

کناڈا میں یادگار عالمی مشاعرہ اور اردو ویب سائٹ کا افتتاح

مسی ساگا: گہوارہ ادب کناڈا کے زیر اہتمام مسی ساگا کے پورٹ کیڈٹ آڈیٹوریم میں منعقدہ عالمی مشاعرے نے شمالی امریکہ میں علمی و ادبی محافل کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ مانا جارہا ہے۔ اس کی صدارت ہندوستان سے تشریف لائے پروفیسر وسیم بریلوی نے کی جبکہ مہمانان خصوصی معروف شعرا منظر بھوپالی اور اقبال اشعر تھے۔ شمالی امریکہ کے معروف شعرائے کرام ڈاکٹر تقی عابدی، اشفاق حسین، ستیہ پال آنند، عرفان ستار، ذکیہ غزل، تسلیم الٰہی زلفی، ولی عالم شاہین، رشید ندیم، معنیف اشعر، شکیلہ رفیق، فیصل عظیم، درخشاں صدیقی، سیما نقوی، طارق حسین، ردا فاطمہ، اثر اکبرآبادی، صفیہ مریم، سلیمان اطہر، اسوادرقی، مظہر رفیع، انور کمال رضوی و عقیل حیدر نے بھی اپنا خوبصورت کلام سنایا۔ نظامت گہوارہ ادب کناڈا کے سرپرست اور مشہور شاعر ولی عالم شاہین اور سید محمد عباس نے انجام دی۔ صدر محفل پروفیسر وسیم بریلوی نے کہا کہ میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں برصغیر میں ایم کیو ایم وہ سیاسی تحریک ہے جو سیاسی نظریات کے پرچار کے ساتھ ساتھ اردو زبان، ثقافت و تہذیب کو دنیا کے کونے کونے تک پہنچانے اور فروغ دینے کی کوششوں میں ہمہ وقت مصروف عمل ہے اور اس کے لیے اس نے اپنا ایک ادبی ونگ بنا رکھا۔ مشاعرے میں ڈاکٹر تقی عابدی کی کتاب 'فیض فہمی' کی رونمائی بھی پروفیسر وسیم بریلوی نے کی جب کہ ولی عالم شاہین نے تعارفی کلمات ادا کیے۔ اس محفل میں گہوارہ ادب کناڈا نے اپنی اردو ویب سائیٹ کا افتتاح کرتے ہوئے شرکائے محفل کو اس کے مندرجات سے آگاہ کیا جسے حاضرین نے اردو ادب کی ترویج میں انتہائی اہم پیش رفت قرار دیا۔ تقریب کے اختتام پر حاضرین محفل کی بڑی تعداد نے گہوارہ ادب کناڈا اور ایم کیو ایم کناڈا کے ذمے داران کو اس عالیشان مشاعرہ کے انعقاد پر مبارکباد دی اور اس منظم اور آئندہ بھی گہوارہ ادب کی تقریبات میں اپنی شرکت کو یقینی بنانے کے عزم کا اعادہ کیا گیا۔

پریس ریلیز، کناڈا، مئی 2012

آٹووا میں گہوارہ ادب کا مشاعرہ

آٹووا: گزشتہ اتوار 6 مئی کی شام کناڈا کی راجدھانی آٹووا میں گہوارہ ادب کناڈا کے زیر اہتمام ایک مشاعرے کا انعقاد کیا گیا جس میں مہمان شعرائے کرام وسیم بریلوی منظر بھوپالی اور اقبال اشعر کے علاوہ شمالی امریکہ کے معروف شعرا محمد طارق غازی، ولی عالم شاہین، ڈاکٹر شمیم آزر، ڈاکٹر مطلوب حسین، عرشیہ رؤف، اکرم بٹ، ضمیر عاجز اور دیگر شعرا نے اپنے کلام سے محظوظ کیا۔ مشاعرے کی صدارت پروفیسر وسیم بریلوی نے کی جبکہ اردو ادب کی معروف شخصیت محمد طارق غازی مہمان خصوصی کے طور پر شریک محفل ہوئے۔ نظامت انیس فاروقی و ثروت نجمی نے انجام دی۔ حاضرین محفل دیر گئے تک اس خوب صورت ادبی محفل کا لطف اٹھاتے رہے۔

پریس ریلیز، کناڈا 6 مئی 2012



مسی ساگا، کناڈا میں منعقدہ عالمی مشاعرے میں شریک ہونے والے شعرا اور سامعین کی تصویروں کا کولاژ



خواجہ محمد اکرام الدین 'اردو نیٹ جاپان' کی تقریب سے خطاب کرتے ہوئے

اشتہار

राष्ट्रीय उर्दू भाषा विकास परिषद्

قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان

NATIONAL COUNCIL FOR PROMOTION OF URDU LANGUAGE

Department of Higher Education,
Ministry of Human Resource Development, Govt. of India
Farogh-e-Urdu Bhawan,FC-33/9,Institutional Area,Jasola,New Delhi-110 025
Ph.:011-49539000, Fax:49539099

Admission Notice

NIELIT Certificate Course on Computer Concept - CCC

Diploma in "Computer Applications, Business Accounting and Multilingual DTP"- CABA-MDTP

Joint Certification by NCPUL & NIELIT Chandigarh

NCPUL
Ministry of HRD
Govt. of India

Important Dates for the session July 2012-13

Submission of Registration form at the centre	:	31st May 2012
Interview	:	4th to 6th June 2012
Display of final list	:	8th June 2012
Payment of fees	:	11th June 2012
Receipt of list of candidates with fee at NCPUL	:	18th June 2012
Commencement of Classes	:	2nd July 2012

NIELIT
Chandigarh
Centre
Ministry of IT, G.O.I

Course Contents:

Module I: IT Tools and Business Systems. **Module II :** Internet Technology and Web Design. **Module III:** Financial Accounting Using Tally & Personality Development. **Module IV** : Introduction to ICT Resources. **Module V :** Multilingual DTP. **Module VI :** Programming and Problem Solving Through 'C' Language. **Module VII :** Practical & Project Work.

اہلیت: CABA-MDTP اور CCC کورس میں داخلہ کے لیے امیدوار کسی بھی منظور شدہ بورڈ سے میٹرک پاس کے مساوی امتحان پاس ہوں جبکہ "O" لیول میں داخلے کے لیے 2+10 یا اس کے مساوی امتحان پاس ہونا ضروری ہے۔ 'O' لیول کورس میں داخلہ 'O' لیول کے لیے منظور شدہ مراکز میں ہی لیے جاسکتے ہیں۔

کورس کی میعاد : کورس کی میعاد ایک سال ہے۔ نشستوں کی تعداد 40 ہوگی۔

فیس : داخل شدہ طلبا/طالبات کو -/250 روپے ماہانہ فیس ادا کرنی ہوگی۔ "اے کلاس" شہر کے لیے یہ رقم -/500 روپے ماہانہ ہوگی۔ منظور شدہ سینٹرز کو کتنا فیس لینے کے مجاز ہوں گے۔

قومی اردو کونسل نے انگریزی اور ہندی میڈیم میں فاصلاتی نظام تعلیم کے ذریعے اردو کا ایک سالہ ڈپلوما کورس شروع کیا ہے۔ سبھی طلبا کے لیے یہ کورس لازمی ہے۔

پراسپکٹس کے لیے اپنے نزدیکی کمپیوٹر سینٹر سے رابطہ کریں جن کی فہرست مع تفصیل قومی اردو کونسل کے ویب سائٹ www.urducouncil.nic.in پر دیکھی جاسکتی ہے۔

(ڈائرکٹر)

قومی اردو کونسل کی سرگرمیاں

خبر نامہ

اردو زبان وادب کو علاقائی زبانوں سے جوڑنا چاہیے: پروفیسر وسیم بریلوی

قومی اردو کونسل ایک شاندار سا ئبر لائبریری تشکیل دیے گی : ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین

نئی دھلی: قومی اردو کونسل نے تاریخ ادب اردو کو جامع انداز میں جدید تحقیق کے تناظر میں پیش کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔اس سلسلے میں ایک مشاورتی کمیٹی قائم کی جائے گی جس کی تجاویز کی روشنی میں کونسل اردو ادب کی تاریخ تیار کرائے گی۔اس کے علاوہ ایسے شعراء ادبا جن کے بارے میں زیادہ معلومات دستیاب نہیں ہیں ان سے متعلق مونوگراف تیار کرانے پر بھی اتفاق کیا گیا۔یہ فیصلے 29 اپریل 2012 کو قومی اردو کونسل کے کانفرنس روم میں تاریخ ادب اردو اور اردو انسائیکلوپیڈیا کے موضوع پر منعقدہ ایک اہم میٹنگ میں کیے گئے۔قومی اردو کونسل کے وائس چیئرمین پروفیسر وسیم بریلوی نے سب سے پہلے اس میٹنگ کے تمام ممبران اور حاضرین کا استقبال کیا اور میٹنگ کی غرض و غایت بیان کی۔کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین نے گزشتہ میٹنگ کی تفصیلات رکھی اور میٹنگ کے ایجنڈوں پر روشنی ڈالی۔تاریخ ادب اردو کے پروجیکٹ کی پیش رفت کا جائزہ لینے کے لیے ایک میٹنگ 2 جولائی 2011 کو شمس الرحمن فاروقی کی صدارت میں منعقد کی گئی تھی جس میں تاریخ ادب اردو (نثر اور شاعری) کے کام کو آگے بڑھانے سے متعلق اہم فیصلے کیے گئے تھے۔ان فیصلوں اور اقدامات کو سراہا گیا۔ابھی تک کیے گئے کاموں کا جائزہ لیا گیا اور پروفیسر ظفر احمد صدیقی نے تاریخ ادب اردو کی جلد 6 اور 7 کے بارے میں کافی تفصیل سے گفتگو کی اور اس سال مکمل کر کے کتاب جمع کرنے کا یقین دلایا۔کونسل میں ریسرچ اسسٹنٹ عبدالمعید نے گزشتہ تین سو برسوں میں شائع شدہ اہم کتابوں کو دوبارہ شائع کرنے کے کونسل کے پروجیکٹ کا تعارف پیش کیا۔میٹنگ کے ممبران نے کچھ نئی تجاویز پیش کیں جن پر تبادلہ خیال کیا گیا اور ان تجاویز کو حتمی شکل دینے کے لیے ایک مشاورتی کمیٹی کی تشکیل پر اتفاق کیا گیا۔مشاورتی کمیٹی تاریخ ادب اردو کے تمام ادوار کا تعین کرے گی اور اس بات پر بھی غور وخوض کرے گی کہ یہ کام جلد سے جلد کس طرح انجام دیا جائے گا۔ کونسل اہم شعراء ادبا کا مونوگراف بھی تیار کرانے کا ارادہ رکھتی ہے، یہ مونوگراف خاص طور سے ایسے شاعروں



ادیبوں کے ہوں گے جنھوں نے اردو ادب کی ترویج و اشاعت میں اہم خدمات انجام دی ہیں لیکن آج وہ غیر معروف ہیں۔اردو انسائیکلوپیڈیا میں ترمیم واضافے کی تجویز پر بھی گفتگو کی گئی۔جدید اور عصری تقاضوں کے مدنظر اس میں اضافہ کرنے پر زور دیا گیا۔اس بات پر بھی رضامندی ظاہر کی گئی کہ اردو انسائیکلوپیڈیا کے حوالے سے ان لوگوں کی خدمات بھی شامل کی جائیں جو ان سے وابستہ رہے ہیں اور نئی نسل کو بھی جوڑنے کی کوشش کی جائے۔ پروجیکٹ پر کام کرنے والے اسکالروں کے اعزازیے میں اضافہ کرنے کی تجویز بھی کونسل کے زیر غور ہے۔پروفیسر وسیم بریلوی نے بتایا کہ قومی اردو کونسل دیگر علاقائی زبانوں کے ادب کو اردو میں اور اردو ادب کو دیگر علاقائی زبانوں میں منتقل کرنے کا ایک منصوبہ رکھتی ہے اور میٹنگ کے ممبران اگر چاہیں تو اس پر عملی اقدامات کیے جاسکتے ہیں۔ڈائرکٹر ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین نے تمام تجاویز کو بغور سنا اور ان پر جلد سے جلد عمل کرنے کا یقین دلایا اور کہا کہ قومی اردو کونسل جدید تقاضوں کے پیش نظر کتابیں تیار کرائے گی۔انھوں نے علامہ اقبال سائبر لائبریری کی طرز پر کونسل کی جانب سے ایک عظیم الشان سائبر لائبریری قائم کرنے کی بات کہی اور یقین دلایا کہ کونسل آنے والے دنوں میں مزید فعال ہوگی اور دنیا کے تمام حصوں سے شائع ہوئی اردو کی اہم کتابوں کو کونسل اپنی لائبریری میں شامل کرے گی تاکہ کوئی بھی اردو داں کسی بھی مقام سے با آسانی ان کتابوں کو پڑھ سکے اور ان سے فائدہ اٹھا سکے۔انھوں نے تمام پروجیکٹوں کو جلد از جلد مکمل کر لینے کا بھی یقین دلایا۔میٹنگ کے آخر میں پروفیسر وسیم بریلوی نے شرکا کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ کونسل دور دراز کے علاقوں میں اردو کے ادیبوں شاعروں کی ادبی خدمات کو منظر عام پر لائے گی۔ میٹنگ میں کونسل کے لٹریچر پینل کے ممبران پروفیسر ظفر احمد صدیقی پروفیسر عبدالحق پروفیسر فضیل احمد قادری، پروفیسر مختار شمیم پروفیسر ارتضیٰ کریم پروفیسر صاحب علی ڈاکٹر انور پاشا نے حصہ لیا۔کونسل کے پرنسپل پبلیکیشن آفیسر نسیم احمد اسسٹنٹ ڈائرکٹر اکیڈمک شیخ کوثر پروفی ریسرچ آفیسر مسرت جہاں ایس ایم خرم اسسٹنٹ ایڈیٹر ڈاکٹر عبدالحئی ریسرچ اسسٹنٹ ٹی اے راہی بھی اس موقعے پر موجود تھے۔

پریس نوٹ، راجیش کامل، قومی اردو کونسل، 29 اپریل 2012

3/21/2018 P83.jpg (1767×2370)

اردو کے سب سے بڑے ادارے کو مزید فعال بنانے کے لیے تمام اردو والوں کا تعاون درکار: پروفیسر وسیم بریلوی

قومی اردو کونسل کے کاموں میں مزید شفافیت لائی جائے گی: ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین

نئی دھلی: قومی اردو کونسل برائے فروغ اردو زبان کے صدر دفتر فروغ اردو بھون کے کانفرنس روم میں 30 اپریل 2012 کو اردو ادب پینل کی ایک اہم میٹنگ پروفیسر گوپی چند نارنگ کی صدارت میں منعقد کی گئی۔ کونسل کے پرنسپل پبلی کیشن آفیسر نسیم احمد نے گزشتہ میٹنگ کی روداد پر روشنی ڈالی اور منظور شدہ تجاویز کا ذکر کیا۔ اس میٹنگ میں مختلف پروجیکٹوں اور کتابوں کی اشاعت کو منظوری دی گئی تھی ان پر جاری کاموں کا جائزہ لینے اور نئے پروجیکٹوں کو منظوری دینے کے لیے آج کی میٹنگ کافی اہمیت کی حامل تھی۔ میٹنگ کے آغاز میں قومی اردو کونسل کے وائس چیئرمین پروفیسر وسیم بریلوی نے تمام ممبران اور شرکا کا استقبال کیا اور قومی اردو کونسل کی کارکردگیوں پر مختصراً روشنی ڈالی۔ انھوں نے کہا کہ قومی اردو کونسل پر ساری دنیا کی نظر ہے اور یہ ایک ایسا ادارہ ہے جو اردو دنیا میں آج کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے اور ہمیں ادب نوازوں کا تعاون چاہیے تاکہ ہم اردو ادب و زبان کی اور بہتر ڈھنگ سے خدمت کر سکیں۔ کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین نے میٹنگ کے ایجنڈوں پر گفتگو کی اور کہا کہ کونسل اردو زبان و ادب سے متعلق تمام پروجیکٹوں کو جلد سے جلد مکمل کرنے کے لیے پرعزم ہے۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ نے میٹنگ کی غرض و غایت بیان کرتے ہوئے بتایا کہ یہ میٹنگ آج ایک طویل مدت کے بعد ہو رہی ہے اس لیے مجھے امید ہے کہ اس میٹنگ میں اہم فیصلے کیے جائیں گے۔ آج کی یہ میٹنگ اس معنوں میں بھی اہم ہے کہ یہ میٹنگ پروفیسر وسیم بریلوی اور ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین کے ساتھ پہلی دفعہ کی جا رہی ہے اور ان دونوں کی فعالیت سے ہی یہ میٹنگ ممکن ہو پائی ہے۔ میٹنگ کی صدارت کرتے ہوئے پروفیسر گوپی چند نارنگ نے کہا کہ کوئی بھی زبان ماضی کی کمائی کے سہارے زندہ نہیں رہتی۔ مستقبل کی ضرورتوں، نئی نسلوں، نئے تقاضوں اور نئے چیلنجوں سے ہم آہنگ کرنا بہت ضروری ہوتا ہے۔ اردو محض شعر و ادب کی زبان نہیں ہے اس لیے اس بات کی کوشش ہونی چاہیے کہ اردو میں زیادہ سے زیادہ موضوعات کا احاطہ کیا جائے۔ کونسل کو چاہیے کہ وہ رائٹ ٹو ایجوکیشن سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اردو کی ابتدائی تعلیم کو فروغ دے۔ ڈائرکٹر قومی اردو کونسل نے گوپی چند نارنگ صاحب کی تجاویز کی حمایت کرتے ہوئے کہا کہ کونسل اب ہر تین مہینوں میں اس طرح کی میٹنگ کا انعقاد کرے گی اور ہم اپنی تمام اشاعتی سرگرمیوں اور کارکردگی کی تفاصیل کو ویب سائٹ پر بھی ڈالیں گے تاکہ کونسل کے کاموں میں مزید شفافیت لائی جا سکے۔ ڈاکٹر توقیر راہی نے اردو ادب پینل خصوصی طور پر پروجیکٹ کے تعلق سے یو جی سی پیٹرن پر وضع کیے گئے قواعد و ضوابط پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ میٹنگ میں یہ طے کیا گیا کہ کونسل کے اشاعتی کاموں اور پروجیکٹوں کا جائزہ لینے کے لیے ایک جائزہ کمیٹی تشکیل دی جائے گی جو کونسل کو موصول پروجیکٹ اور تجاویز پر غور و خوض کرے گی اور انھیں منظور کرے گی۔ پروجیکٹ کے تعین پر ماہرین کی رائے ہونی ضروری ہے تاہم حتمی فیصلہ کونسل کرے گی۔ گذشتہ دنوں منعقدہ ذیلی کمیٹی کی میٹنگ کی زیادہ تر سفارشات کو منظوری دی گئی۔ میٹنگ میں کونسل کے ذریعہ پیش کردہ تجاویز کا خیر مقدم کیا گیا اور اسے بھی منظوری دی گئی۔ بچوں کے لیے ایک علٰحدہ رسالہ شائع کرنے کی تجویز کو بھی منظوری دی گئی۔ شرکا نے بچوں کے ادب پر مزید توجہ دینے کی ضرورت پر زور دیا۔ میٹنگ میں کتابوں اور تحقیقی پروجیکٹوں کی موصول شدہ بیشتر تجاویز کو منظور کیا گیا۔ اردو ادب پینل کی میٹنگ کا وقفہ کم کر کے اسے ہر تین مہینوں میں منعقد کرنے سے بھی اتفاق کیا گیا۔ میٹنگ کے آخر میں کونسل کے ڈائرکٹر نے سبھی ممبران اور حاضرین کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ یہاں موجود حضرات اردو ادب کی کہکشاں ہیں اور آپ سب کی تجاویز اور مشوروں پر کونسل جلد سے جلد عمل کرے گی اردو زبان و ادب سے متعلق تحقیقی پروجیکٹوں اور اشاعتوں میں تیزی لائی جائے گی۔ انھوں نے اس بات کا بھی یقین دلایا کہ ان تمام تجاویز اور ان کی منظوری سے متعلق تمام ضروری نکات ای میل اور پوسٹ کے ذریعہ ممبران کو جلد سے جلد بھیج دیے جائیں گے۔ آج کی میٹنگ میں اردو ادب پینل کے ممبران پروفیسر ابوالکلام قاسمی، پروفیسر عتیق اللہ، پروفیسر خالد محمود، قاضی عبیدالرحمٰن ہاشمی، پروفیسر بیگ احساس، پروفیسر ابن کنول، پروفیسر صغیر افراہیم، پروفیسر فاروق صدیقی، پروفیسر قدوس جاوید، جناب فاروق راہب، پروفیسر معین الدین اے جینا بڑے، پروفیسر ارتضیٰ کریم، پروفیسر اقبال مسعود، پروفیسر آفاق احمد اور ڈاکٹر انور پاشا نے شرکت کی۔ کونسل کے پرنسپل پبلی کیشن آفیسر نسیم احمد، اسسٹنٹ ڈائرکٹر (اکیڈمک) شمع کوثر یزدانی، ریسرچ آفیسر مسرت جہاں، ڈاکٹر کلیم اللہ، ایس ایم خرم، اعزازی مدیر نصرت ظہیر، اسسٹنٹ ایڈیٹر ڈاکٹر عبدالحئی، ریسرچ اسسٹنٹ ڈاکٹر توقیر راہی، عبدالمعید، اکیڈمک اسسٹنٹ ڈاکٹر عبدالسلام وغیرہ بھی اس موقع پر موجود تھے۔



پریس نوٹ، رابطہ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 30 اپریل 2012

http://urducouncil.nic.in/Urdu-Duniya/Urdu-Duniya-June-2012/P83.jpg 1/1

اردو کونسل کے کمپیوٹر سینٹروں کو ہمہ جہت اور خود کفیل بنایا جائے گا

نئی دھلی: تکنیکی تعلیم نہ صرف اس وقت کی سب سے اہم ضرورت ہے بلکہ اردو زبان کو روزگار سے جوڑنے کی مہم میں بہت اہم رول ادا کر رہی ہے۔ قومی اردو کونسل نے اردو زبان اور اس سے وابستہ طالب علموں اور اساتذہ کے لیے کمپیوٹر ڈپلومہ کورس کے ذریعے ہندوستان کے بیشتر علاقوں میں اپنے تقریباً 400 کمپیوٹر سینٹر قائم کر دیے ہیں تاکہ ہر اردو طالب علم کی رسائی تکنیکی تعلیم تک آسان ہو جائے۔ اس عظیم مقصد کی تکمیل کے لیے قومی اردو کونسل ہمیشہ کوشاں رہی ہے اور آئندہ سالوں میں اس کا مستقبل اور بھی تابناک ہوگا اور موجودہ سینٹروں کو ہمہ جہت اور خود کفیل بنانے کی ہر ممکن کی جائے گی۔ ان خیالات کا اظہار اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر اکرام الدین نے ایک اہم میٹنگ میں کیا۔ ڈاکٹر لوبیال کی صدارت میں قومی اردو کونسل کے صدر دفتر 'فروغ اردو بھون' میں 31 ویں تکنیکی تعلیم کمیٹی کی ایک اہم میٹنگ منعقد کی گئی۔ یہ میٹنگ ٹیکنیکل ایجوکیشن کمیٹی کے نام سے رواں مالی سال 2012-13 کی اپنی نوعیت کی پہلی میٹنگ ہے۔ اس کا مقصد کمپیوٹر سینٹروں کی کارکردگی سے متعلق میکانزم میں ضروری تبدیلیوں پر غور و فکر کرنا اور مہیا عوامل کا بہتر سے بہتر استعمال کرنا ہے۔ یہ میٹنگ اس لحاظ سے بھی اہم تھی کہ قومی اردو کونسل کی جانب سے چلائے جا رہے کمپیوٹر سینٹروں سے تعلیم حاصل کر رہے طالب علموں اور اساتذہ کی تکنیکی تعلیم سے وابستہ بنیادی سہولیات اور مالی ضروریات کا احاطہ کیا گیا۔ اس نو تشکیل شدہ تکنیکی کمیٹی میں جن ممبران اور کمپیوٹر ماہرین نے شرکت کی ان کے نام اس طرح ہیں۔ جناب گوہر رضا (CSIR)، جناب ڈاکٹر زاہد رضا (JNU)، جناب دیوان محمد خان (NIC)، ڈاکٹر رضوان الرحمن، جناب ایم اے خان، ڈاکٹر ایس اختر حسین (JNU)، جناب سید پرویز، پروفیسر جمیل احمد (انجینئرنگ کالج، بہار)، جناب بادشاہ عالم (جامعہ ملیہ اسلامیہ پالیٹیکنک)، جناب این کے جین، National institute of Electronics and Information Technology چنڈی گڑھ)، جناب محمد انور خان سائنس داں ڈی (وزارت اطلاعات وٹکنالوجی)، پروفیسر پرویز شاردہ یونیورسٹی (گریٹر نوئیڈا) نے شرکت کی۔ ان اہم ممبران اور تکنیکی تعلیم کے ماہرین کی موجودگی میں کچھ اہم نکات زیر بحث آئے مثلاً کمپیوٹر سینٹروں کے لیے آن لائن درخواستوں سے متعلقہ نظام کو Review کرنے کے لیے بہت ہی جلد ایک تکنیکی تعلیم سے متعلقہ سب کمیٹی تشکیل دی جائے گی تاکہ آن لائن درخواستوں کو صحیح طریقے سے جانچ پرکھا جا سکے۔ کونسل اب تک اپنی CABA-MDTP کمپیوٹر اسکیم کے تحت سینٹروں کو 10 سال سے مالی تعاون فراہم کرتا آیا ہے اور اس کے بعد یہ امید کرتا ہے کہ وہ اپنی ذمے داریوں کو خود اٹھا سکیں اور خود کفیل ہو جائیں، لیکن اگر 10 سال کی مدت کے بعد بھی وہ ایک سینٹر جو اچھی طرح چل رہا تھا لیکن کسی وجہ سے وہ خود کفیل نہ ہو پایا تو اس کو بند کرنا پڑتا ہے۔ کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر اکرام الدین نے کہا کہ ہم بہت ہی جلد اس سلسلے میں ایک ایسی کمیٹی تشکیل دینے جا رہے ہیں جو Phase-out سینٹروں پر غور و خوض کر کے انھیں دوبارہ بحال کرنے کی کوشش کی جائے گی ساتھ ہی نئے سینٹروں کے لیے ایسی ترکیب اپنائی جائے گی کہ وہ خود پانچ سال کے بعد خود کفیل ہو جائیں۔ NIIT کے ڈائرکٹر کے ساتھ بھی بجٹ میں عملی پریشانیوں پر بھی تبادلہ خیال ہوا۔ اس سلسلے میں آنے والی 13 تاریخ میں ایک اور اہم میٹنگ کی جائے گی، جس میں اخراجات میں تخفیف کے امکانات کی تلاش کی جائے گی۔ تکنیکی تعلیم کمیٹی کے تحت کونسل کیلی گرافی ڈیزائن اور گرافک ڈیزائن کورس کا دو سالہ ڈپلومہ بھی چلا رہی ہے۔ اس میٹنگ میں خطاطی اور طغرا نویسی کے حوالے کورل ڈرا، فوٹو شاپ، فلاش ٹو ڈی وغیرہ جیسے سافٹ ویئر کو Uni-code میں ڈالا جائے تاکہ اس میں ہم آہنگی لائی جا سکے۔



پریس نوٹ، رابطہ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 4 مئی 2012

قومی اردو کونسل کی ریاضی اور کامرس کی فرہنگ اصطلاحات کی دوبارہ اشاعت

نئی دھلی: قومی اردو کونسل نے اردو زبان و ادب کی اشاعت و ترویج کے سلسلے میں کئی اہم کارنامے انجام دیے ہیں اور کونسل نے ہمیشہ یہ پہل کرنے کی سعی کی ہے کہ اردو زبان کو نئی جہت سے ہمکنار کرنے کے لیے نئی پالیسیاں اور طریقہ کار وضع کیا جائے۔ اس لیے ہر ایک نئی اشاعت اور پرانی کتابوں کی دوبارہ اشاعت پر دھیان رکھا جاتا ہے کہ زیادہ سے زیادہ اردو شائقین، اور طلبا اردو کتابوں سے مستفید ہو سکیں۔ ان خیالات کا اظہار قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر محمد خواجہ اکرام نے ایک اہم ورکشاپ میں کیا۔ کونسل نے تمام موضوعات کی اصطلاحات کی فہرستوں کی اشاعت کی ہے۔ بدلتے منظر نامے میں ان اصطلاحات میں اہم تبدیلیوں کی ضرورت محسوس کرتے ہوئے کونسل کے صدر دفتر 'فروغ اردو بھون' میں ریاضی اور کامرس کی فرہنگ اصطلاحات سے متعلق پانچ روزہ ورکشاپ کا اہتمام کیا گیا۔ کونسل کی شائع شدہ ریاضی کی فرہنگ اصطلاحات جو 421 صفحات پر مشتمل ہے جبکہ کامرس کی فرہنگ 204 صفحات کی ہے۔ سال 2001 میں ان اصطلاحات کے بعد دوبارہ ان کی اشاعت کی ضرورت کے پیش نظر ریاضی اور کامرس اور ترجمے کے ماہرین جن میں ڈاکٹر پرویز شہریار (NCERT) ڈاکٹر قدوس خان الیسوی ایٹ پروفیسر شبلی کالج محمد قاسم (اینگلو عربک سینئر سیکنڈری اسکول) عارف کاظمی (اینگلو عربک اسکول، اجمیری گیٹ، دہلی) ڈاکٹر سہیل فاروقی ڈاکٹر محمد نفیس حسن (گورنمنٹ بوائز اردو میڈیم اسکول اجمیری گیٹ) سید ظفر الاسلام، افتخار احمد، راشد الاسلام (جامعہ ملیہ اسلامیہ) نے ان اصطلاحات پر سات روزہ ورکشاپ میں کام کیا۔ قومی اردو کونسل کے پرنسپل پبلی کیشن آفیسر جناب نسیم احمد، محترمہ شمع کوثر یزدانی، جناب محمد انصر نے بھی شرکت کی۔

پریس نوٹ، رابطہ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 11 مئی 2012

قومی اردو کونسل کی قانونی کتابوں کی اشاعت اور نئے پراجیکٹس پر گہری نظر

ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین

نئی دہلی: قومی اردو کونسل 13-2012 کے لیے ایک نیا لائحہ عمل طے کر رہی ہے کیوں کہ کونسل اردو زبان و ادب کے فروغ کے سلسلے میں ہونے والی تمام قومی سطح کی سرگرمیاں، پینلوں اور کمیٹیوں کے ذریعے کرتی آئی ہے اس کے لیے ہر نئے سال وقت کی ضرورت کے مدنظر نئی کمیٹیاں تشکیل دی جاتی ہیں، جن کا مقصد کامیکیر سطح پر نگرانی کرنا اور اردو زبان و ادب کے فروغ کے لیے زیادہ سے زیادہ وسائل مہیا کرانا ہوتا ہے۔ کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر خواجہ اکرام الدین نے پچھلی دو اہم میٹنگوں کے تعلق سے بات کرتے ہوئے کہا کہ کونسل اردو کا وہ واحد ادارہ ہے جو کامیابی کے ساتھ اردو دنیا ٹیلی ایڈیشن پروگرام ای ٹی وی کے ذریعے ٹیلی کاسٹ کر رہا ہے۔ اس پروگرام کو دلچسپ بنانے اور مزید جدت لانے کے لیے کل میڈیا کے ماہرین کی ایک اہم میٹنگ بلائی گئی، جس کا مقصد اردو دنیا کے ٹیلی ایڈیشن کے ذریعے جڑی سرگرمیوں کا جائزہ لینا اور مزید وسعتیں تلاش کرنا تھا۔ آج قومی اردو کونسل کے صدر دفتر 'فروغ اردو بھون' میں Law-Panel کی ایک اہم میٹنگ کا اہتمام کیا گیا۔ جس کا ایک مقصد یہ طے کرنا تھا کہ کونسل کی قوانین اور انسانی حقوق سے متعلق کتابوں کی اشاعت میں اور نیا کیا کیا جا سکتا ہے۔ اس کے تحت پینل کے سامنے تجاویز اور پروجیکٹ سامنے آئے۔ اس سال خاص طور سے ڈاکٹر طاہر محمود صاحب کی کتاب مسلم قانون قابل ذکر ہے، جس کا اردو ترجمہ جلد ہی قومی اردو کونسل سے شائع کیا جائے گا۔ اس کے علاوہ 'مسلمانوں سے متعلق قوانین کے حوالے سے سپریم کورٹ کے آٹھ ایسے فیصلے جو ایک عام مسلمان کے لیے جاننے ضروری ہیں، ترجمے کے آخری مرحلے میں ہیں۔ کچھ اور کتابیں مثلاً اقلیتوں کے تعلیمی حقوق، ہندوستانی نظام قانون اور Law-Dictionary جیسے اہم پراجیکٹس زیر غور ہیں۔ وزارت قانون کی جانب سے قومی اردو کونسل کو اردو میں Nine-Bare Acts کے متن مہیا کرائے گئے جنھیں کونسل شائع کر چکی ہے، وہ یہ ہیں:

(1) نیشنل انویسٹی گیشن ایجنسی ایکٹ 2008
(2) دی ڈرگس کنٹرول ایکٹ 1950
(3) ان آرگنائزڈ ورکرس سوشل سیکوریٹی ایکٹ 2008
(4) دی پروہی بشن آف چائلڈ میرج ایکٹ 2006
(5) دی نیشنل کمیشن فار مائنارٹی ایجوکیشن انسٹی ٹیوشن ایکٹ 2004
(6) دی سینٹرل ایجوکیشنل انسٹی ٹیوشن (ریزرویشن ان ایڈمشن) ایکٹ 2006
(7) دی ڈائجسٹر مینجمنٹ ایکٹ 2005
(8) دی گرام نیالیزا ایکٹ 2008
(9) دی گورنمنٹ سیکورٹیز ایکٹ 2006

قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ پر جج کمیٹی ایکٹ 2002، رائٹ ٹو انفارمیشن ایکٹ 2005، کمیشن فار پروٹیکشن آف چائلڈ رائٹس ایکٹ 2005، دی پروٹیکشن آف وومین فروم ڈومیسٹک وائلنس ایکٹ 2005 کو دیکھا جا سکتا ہے۔ آج کی میٹنگ میں پروفیسر امتیاز غلام احمد (کلکتہ) جسٹس اے ایس قریشی (نئی دہلی) پروفیسر خواجہ منتقم (نئی دہلی) ڈاکٹر محمد ظفر محمود نعمانی (علی گڑھ) جناب ایس ایم اے کاظمی (الہ آباد) کے علاوہ کونسل کے پی پی او نسیم احمد، شمع کوثر یزدانی اور ذیشان فاطمہ نے شرکت کی۔

پریس نوٹ، رابطہ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 15 مئی 2012

وائس چیئرمین اردو کونسل وسیم بریلوی مرکزی مشاورتی بورڈ برائے تعلیم کے رکن

نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو کے وائس چیئرمین اور اردو کے مشہور شاعر جناب وسیم بریلوی کو حکومت نے مرکزی مشاورتی بورڈ برائے تعلیم (سینٹرل ایڈوائزری بورڈ آف ایجوکیشن CABE) کا ممبر نامزد کیا ہے۔ شعبۂ تعلیم کی یہ سب سے اعلیٰ مشاورتی تنظیم ہے جو تعلیمی و ثقافتی فروغ سے متعلق امور پر ایک وسیع مشاورتی اور تجزیاتی فورم کا کام انجام دیتی ہے۔ یہ بورڈ مرکزی زیر انتظام علاقوں کے وزرائے تعلیم، سرکردہ ماہرین تعلیم اور اعلیٰ افسروں پر مشتمل ہوتا ہے۔



قومی اردو کونسل کی موبائل وین کا دورۂ اتر پردیش و بہار

1 جون سے 2 جون 2012	دہلی سے مبارکپور	3 جون سے 5 جون 2012	مبارکپور
6 جون سے 7 جون 2012	پھول پور	8 جون سے 9 جون 2012	اکبرپور
11 جون سے 12 جون 2012	ٹانڈہ	13 جون سے 14 جون 2012	بلیا
15 جون سے 16 جون 2012	بکسر	18 جون سے 19 جون 2012	آرا
20 جون سے 21 جون 2012	پھلواری شریف	22 جون سے 25 جون 2012	پٹنہ
26 جون سے 27 جون 2012	بہار شریف	28 جون سے 29 جون 2012	نوادہ
30 جون سے 1 جولائی 2012	شیخ پورہ	2 جولائی سے 3 جولائی 2012	مونگیر

قومی اردو کونسل کے مالی تعاون سے



سچر کمیٹی اور اردو تعلیم پر سیمینار میں مرکزی وزیر جناب کپل سبل اور جناب وجاہت حبیب اللہ کے ساتھ دائیں سے پروفیسر اختر الواسع اور جناب فرید احمد

سچر کمیٹی کی سفارشات اور اردو تعلیم

نئی دھلی: سچر کمیٹی کی مسلم اقلیت کے تعلق سے کی گئی تمام سفارشات پر جلد از جلد عمل درآمد کی حکومت ہند پابند ہے۔ اس سمت میں موثر طریقے سے کام شروع ہو چکا ہے اور اقلیتی طبقہ کی تعلیمی نشوونما نیز ان تمام سفارشات پر فوری عمل کیا جائے گا جو اردو زبان کی ترقی کے تعلق سے کی گئی ہیں۔ وزارت فروغ انسانی وسائل حکومت ہند نے اپنے تحت آنے والے ہر ادارے کو خاص ہدایات جاری کردی ہیں کہ ہر حالت میں اردو داں طبقہ اور مسلم اقلیت کے ساتھ پورا پورا انصاف کیا جائے۔ ان خیالات کا اظہار، جناب کپل سبل نے دہلی کے ذاکر حسین دہلی کالج کے عالیشان آڈیٹوریم میں منعقد ایک قومی سیمینار بعنوان 'سچر کمیٹی کی سفارشات کی روشنی میں اردو تعلیم کے مواقع' میں بحیثیت مہمان خصوصی شرکت کرتے ہوئے کیا۔ سیمینار کا انعقاد قومی اردو کونسل کے مالی تعاون سے دہلی کی مشہور سماجی اور تعلیمی تنظیم حرمین ایجوکیشن سوسائٹی نے کیا تھا۔ سیمینار کی صدارت کے فرائض قومی اقلیتی کمیشن حکومت ہند کے چیرمین جناب وجاہت حبیب اللہ نے انجام دیے جبکہ سچر کمیٹی کے سابق او ایس ڈی اور نامور سماجی رہنما جناب ظفر محمود نے کلیدی خطبہ دیتے ہوئے سچر کمیٹی کی سفارشات اور اغراض ومقاصد پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ فرید احمد جنرل سکریٹری حرمین ایجوکیشن سوسائٹی نے اپنے تعارفی کلمات میں کہا کہ سچر کمیٹی کی سفارشات کی روشنی میں واضح طور پر یہ کہا گیا ہے کہ بچہ کی ذہنی اور تعلیمی نشوونما اسی وقت ممکن ہے جب اس کی ابتدائی تعلیم اس کی مادری زبان میں مہیا کرائی جائے۔ جبکہ المیہ یہ ہے کہ ہندوستان میں جہاں جہاں اردو بولنے والوں کی اکثریت ہے وہاں اردو میڈیم کے اسکول دستیاب نہیں ہیں۔ فرید احمد نے کہا کہ سچر کمیٹی کی ان سفارشات کے مدنظر ہی اس سیمینار کا انعقاد عمل میں آیا ہے۔ اپنے صدارتی خطبہ میں جناب وجاہت حبیب اللہ نے کہا کہ قومی اقلیتی کمیشن سمیت حکومت کے تمام ان اداروں کو جو فروغ اردو کے لیے قائم کیے گئے ہیں نیز حرمین ایجوکیشن سوسائٹی جیسی دیگر تنظیموں کو مل جل کر کام کرنا ہوگا جب ہی اردو کی زبوں حالی کو دور کیا جاسکتا ہے۔ سیمینار میں کچھ نامور اردو اخبارات کے سربراہان اور مدیر حضرات کو شان اردو ایوارڈ سے بھی نوازا گیا۔ یہ ایوارڈ جناب کپل سبل نے راشٹریہ سہارا اردو کے سربراہ اور نامور صحافی قوم اسد رضاء، روزنامہ صحافت کے مدیر حسن شجاع، روزنامہ انقلاب اردو کے ایڈیٹر محترم شکیل شمسی، روزنامہ ہمارا سماج کے مدیر محترم خالد انور، ہفت روزہ چوتھی دنیا کی مدیرہ محترمہ وسیم راشد اور نامور عکاس اردو محترم سید قدا علی کو اردو زبان کے لیے ان کی نمایاں خدمات کے لیے دیے۔ جن دیگر شخصیات اور اردو اسکالرز اور مقالہ نگار حضرات نے اس سیمینار کو رونق بخشی ان میں دہلی اقلیتی کمیشن کے چیرمین صفدر حسین خاں، نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف اوپن اسکولنگ کے چیرمین ڈاکٹر ایس ایس بینا، ذاکر حسین دہلی کالج کے پرنسپل ڈاکٹر اسلم پرویز، دہلی اردو اکادمی کے وائس چیئرمین پروفیسر اختر الواسع، ڈاکٹر خلیق انجم، پروفیسر غضنفر علی، پروفیسر ارتضی کریم، ڈاکٹر مولا بخش، حکومت دہلی کے اردو افسر ڈاکٹر اشفاق عارفی کے نام قابل ذکر ہیں۔

پریس ریلیز، دہلی، 11 مارچ 2012



جناب کپل سبل اور جناب وجاہت حبیب اللہ (دائیں) سرکردہ اردو صحافیوں کے ساتھ جنھیں سیمینار میں اعزاز سے نوازا گیا



پروفیسر عبدالقوی دسنوی سیمینار میں مائک پر آفاق حسین صدیقی، داؤس پر دائیں سے سابق ایم پی کیلاش سارنگ، پروفیسر آفاق احمد اور پروفیسر عتیق اللہ

پروفیسر عبدالقوی دسنوی پر سیمینار

بھوپال: اردو تحقیق وتنقید کی معروف شخصیت پروفیسر عبدالقوی دسنوی کی حیات اور علمی وادبی خدمات پر علما ایجوکیشن سوسائٹی بھوپال کے زیر اہتمام قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی دلی کے مالی تعاون اور مدھیہ پردیش اردو اکادمی بھوپال کے اشتراک سے دو روزہ قومی سیمینار یکم و 2 اپریل 2012 کو مولانا رمزی سنسکرتی بھون بھوپال میں منعقد کیا گیا۔ سیمینار کا افتتاح سابق ممبر پارلیمنٹ جناب کیلاش سارنگ صاحب نے کیا۔ صدارت پروفیسر آفاق احمد صاحب نے کی۔ پروفیسر شکور خاں، اردو کے نامور نقاد پروفیسر عتیق اللہ اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے صدر شعبہ اردو پروفیسر خالد محمود مہمانانِ خصوصی تھے۔ علما ایجوکیشن سوسائٹی کے صدر سہ ماہی کاروانِ ادب کے مدیر جناب کوثر صدیقی نے استقبالیہ خطبہ دیا۔ پروفیسر آفاق حسین صدیقی نے کلیدی خطبے میں پروفیسر عبدالقوی دسنوی کے وسیع ادبی نقطہ نظر اور قابلِ قدر علمی و ادبی خدمات پر روشنی ڈالی۔ ڈاکٹر ارجمند بانو افشاں کی پروفیسر عبدالقوی دسنوی کے نام منسوب تصنیف 'ریاست بھوپال اور مشاہیر اردو' کا اجرا بھی عمل میں آیا۔ پروفیسر محمد نعمان خاں این سی ای آر ٹی نے کتاب کا تعارف کرایا اور اسے بھوپالیات کے باب میں ایک قابل قدر اضافہ قرار دیا۔ پہلے اجلاس کی مجلسِ صدارت میں پروفیسر عتیق اللہ، ڈاکٹر خالد محمود اور ڈاکٹر رضیہ حامد شامل تھے۔ اجلاس میں مولوی سید شرافت علی ندوی، ماسٹر اختر، صحافی عارف عزیز، این سی ای آر ٹی دلی کے استاد فاروق انصاری اور افسانہ نگار فرحت جہاں نے مقالات پیش کیے۔ نظامت اقبال مسعود نے انجام دی۔ یکم اپریل 2012 کے دوسرے اجلاس کی مجلس صدارت میں سلفیہ کالج کے سابق پرنسپل پروفیسر شکور خاں، ڈاکٹر مولا بخش اور نثار راہی شامل تھے۔ ڈاکٹر عتیق اللہ (دلی)، ڈاکٹر خالد محمود (دلی)، ڈاکٹر احمد امتیاز (دلی)، ڈاکٹر سیفی سرونجی (سرونج)، ڈاکٹر شان فخری (سرونج)، ڈاکٹر رضیہ حامد اور جناب رشید انجم نے پُرمغز مقالے پیش کیے۔ اظامت ڈاکٹر ارجمند بانو افشاں نے کی۔ تیسرے اجلاس کی مجلسِ صدارت جبل پور یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے سابق صدر ڈاکٹر عبدالوحید خاں، ماسٹر اختر اور برکت اللہ یونیورسٹی کے شعبہ عربی کی صدر پروفیسر عائشہ کمال پر مشتمل تھی۔ اس میں خالد بشر (دلی)، اقبال مسعود، خالد عابدی، ڈاکٹر مہتاب عالم، حذیفہ رحمانی (رانچی)، ضیا فاروقی، ڈاکٹر ارجمند بانو افشاں، جاوید یزدانی اور انعام اللہ لودھی نے مقالات پیش کیے۔ چوتھے اجلاس کی مجلس صدارت میں ڈاکٹر سید محمد حامد، ڈاکٹر انیس سلطانہ اور اقبال مسعود شامل تھے۔ اس اجلاس کے مقالہ نگار ڈاکٹر مولا بخش (دلی) پروفیسر آفاق احمد، پروفیسر مظفر حسین (رانچی) اور ڈاکٹر محمد نعمان خاں تھے۔ اختتامی اجلاس کی مجلسِ صدارت میں پروفیسر آفاق حسین صدیقی، پروفیسر عبدالقوی دسنوی کے بڑے صاحبزادے علی متقی دسنوی اور جاوید یزدانی شامل تھے۔ اختتامی اجلاس میں مقبول شاعر کامل بہزادی، پروفیسر اقتدار افسر اور ڈاکٹر ارجمند بانو نے پروفیسر عبدالقوی دسنوی کو شعری نذرانہ عقیدت پیش کیا۔

پریس ریلیز، بھوپال، 2 اپریل 2012

ترقی پسند تحریک کے 75 سال

الہ آباد: جوش وفراق لٹریری سوسائٹی کی جانب سے اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دلی کے تعاون سے 'ترقی پسند تحریک کے 75 سال' موضوع پر ہوٹل ملن پیلیس، سول لائنز الہ آباد میں معروف نقاد پروفیسر شارب ردولوی کی صدارت میں دو روزہ قومی سیمینار منعقد کیا گیا۔ سابق ایڈوکیٹ جنرل اور جوش وفراق لٹریری سوسائٹی کے صدر انیس اعظمی نے مہمانوں کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا کہ یہ ہمارے لیے فخر کی بات ہے کہ جس تحریک کی بنیاد اسی شہر الہ آباد میں پڑی اور جس نے ادب وسماج کی سمت ورفتار بدل دی، آج ہم اسی کا



ترقی پسند تحریک کے 75 سال سیمینار میں مائک پر اقبال مجید، داؤس پر دائیں سے ڈاکٹر علی جاوید، انیس اعظمی، پروفیسر شارب ردولوی اور سید شاہد مہدی

پچھر سالہ جشن منا رہے ہیں۔ اردو کے معروف افسانہ نگار اقبال مجید نے 'ایک عہد ساز سفر کے بعد' کے عنوان سے اپنا کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ آج اس بات پر غور وفکر کرنے کی ضرورت ہے کہ کس طرح سائنس اور ٹکنالوجی کو بشر دوست بنایا جائے۔ پروفیسر شارب ردولوی نے صدارتی تقریر میں کہا کہ ترقی پسند تحریک سے پہلے ادب میں قاری اور ادیب کے مابین وابستگی نظر نہیں آتی۔ ترقی پسند تحریک نے اس خلا کو پُر کیا اور قاری و ادیب کے درمیان مکالمے کی ابتدا کی۔ ایک وقت وہ بھی آیا تھا جب ہمیں یہ بتایا گیا کہ لفظ کے معنی ہیں ہی نہیں، جس کے نتیجے میں استعارات اور علامات ڈھالنے کے کارخانے کھلتے چلے گئے اور ہم زندگی کی حقیقتوں سے دور ہونے لگے۔ اجلاس کے مہمان خصوصی اور جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی کے سابق وائس چانسلر اور آئی سی سی آر کے وائس چیئرمین سید شاہد مہدی نے اپنی عالمانہ تقریر میں کہا کہ ترقی پسند فکر کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ اس میں عوام کے سبھی مسائل کا احاطہ ہوجاتا ہے۔ مہمانِ اعزازی اور انجمن ترقی پسند مصنفین کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر علی جاوید نے موجودہ سیاسی منظرنامے کا جائزہ لیتے ہوئے کہا کہ یہ دور چھوٹی چھوٹی خوشنودی، ایوارڈ وانعامات حاصل کرنے کا ہے، لہٰذا ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ کہیں ہم ان سمجھوتوں کا شکار تو نہیں ہورہے ہیں۔ اردو کے بزرگ ترقی پسند ادیبوں اور دانشوروں کا مریڈ ضیاالحق، پروفیسر سید محمد عقیل رضوی، رتن سنگھ، اقبال مجید، عابد سہیل، پروفیسر محمود الحسن رضوی، پروفیسر شارب ردولوی اور شاہد مہدی کو ان کی پچاس سالہ ادبی خدمات کے پیش نظر جشن وفراق لٹریری سوسائٹی کی جانب سے سمنکھ اور شال پیش کیے گئے اور پروفیسر علی احمد فاطمی کی نئی کتاب 'مجاز شخص اور شاعر' کی رونمائی بھی کی گئی۔ اجلاس کی نظامت جشن اینڈ فراق لٹریری سوسائٹی کے جنرل سکریٹری پروفیسر علی احمد فاطمی نے کی اور شکریہ کی رسم نائب صدر ڈاکٹر فخرالکریم نے ادا کی۔ سیمینار کے پہلے اجلاس کی صدارت پروفیسر سید محمد عقیل رضوی و پروفیسر راجندر کمار نے کی۔ اس اجلاس میں ڈاکٹر صغیر افراہیم نے 'ترقی پسند تحریک اور افسانہ' ڈاکٹر محمد کاظم نے 'ترقی پسند تحریک اور ڈراما' لئیق رضوی نے 'ترقی پسند تحریک اور ادبی صحافت' اور ڈاکٹر عبدالحی نے 'ترقی پسند تحریک اور رپورتاژ' کے عنوانات پر اپنے اپنے مقالے پیش کیے۔ اجلاس کے بعد رتن سنگھ کی صدارت میں محفل افسانہ کا انعقاد کیا گیا جس میں اقبال مجید، عابد سہیل، اظہر راہی اور قائد حسین کوثر نے اپنے افسانے پیش کیے۔ نظامت ڈاکٹر ابوظہیر ربانی نے کی۔ دوسرے دن تین اجلاس ہوئے جن میں دس مقالے پڑھے گئے۔

دوسرے اجلاس کی صدارت مشہور افسانہ نگار عابد سہیل نے اور نظامت ڈاکٹر حسین جیلانی نے کی۔ پروفیسر شارب ردولوی نے 'ترقی پسند تحریک اور تنقید'، ڈاکٹر انور پاشا نے 'ترقی پسند تحریک اور ناول' ڈاکٹر محمد رضی الرحمٰن نے 'ترقی پسند تحریک اور نظم' ڈاکٹر سراج اعظمی نے 'ترقی پسند تحریک اور غزل' اور ڈاکٹر ابوظہیر ربانی نے 'ترقی پسند تحریک اور نیا ادب' کے عنوانات پر اپنے مقالے پیش کیے۔ تیسرے اجلاس کی صدارت پروفیسر محمود الحسن و پروفیسر سنتوش بھدوریہ نے اور نظامت جاوید نظر نے کی۔ پروفیسر فضلِ امام رضوی نے 'ترقی پسند تحریک اور انیس' ڈاکٹر نفیس بانو نے 'ترقی پسند تحریک اور تانیثی مسائل' ڈاکٹر آفتاب احمد آفاقی نے 'ترقی پسند تحریک اور غالب' اور ڈاکٹر محمد ہادی نے 'ترقی پسند تحریک اور نئی شاعری' کے عنوانات سے اپنے مقالے پیش کیے۔ اختتامی اجلاس کی صدارت وی این راے، وائس چانسلر مہاتما گاندھی انٹرنیشنل یونیورسٹی، وردھا نے کی۔ پروفیسر محمود الحسن نے 'ترقی پسند تحریک ایک جائزہ' کے عنوان سے اپنا مقالہ پیش کیا۔ جشن وفراق لٹریری سوسائٹی کی جانب سے منعقدہ اس دو روزہ سیمینار میں دو اہم تجاویز پیش کی گئیں۔ پہلی یہ کہ سوال لائنز واقع اس مقام پر جہاں دسمبر 1935 انجمن ترقی پسند مصنفین کی میٹنگ ہوئی تھی الہ آباد میونسپلٹی ایک تختی لگائے تاکہ لوگوں کو معلوم ہوسکے کہ ترقی پسند تحریک کی بنیاد کس جگہ رکھی گئی تھی اور دوسری یہ کہ پریم چند کے خستہ حال سرسوتی پریس کو گورنمنٹ مالی تعاون دے تاکہ یہ پھر سے زندہ ہوسکے۔

پریس ریلیز، الہ آباد 7 اپریل 2012

گلوبل کمپیوٹر اکادمی جلسہ تقسیم اسناد

ناگپور: شرینا گپور مسلم ویلفیئر سوسائٹی کے زیر اہتمام تاج بابا نائٹ ہائی اسکول و جونیئر کالج آف آرٹس وکامرس گزشتہ 26 سال سے جاری ہے جس میں وہ بچے زیر تعلیم ہیں جو دن میں کسی کاروباری مصروفیات کی وجہ سے زیور تعلیم سے آراستہ نہیں ہوپاتے۔ اسی اسکول میں قومی اردو کونسل برائے فروغ اردو کے زیر اہتمام 'گلوبل کمپیوٹر اکادمی' کئی سال سے جاری ہے۔ امسال (2010-11) جن طلبا وطالبات نے ایک سالہ کورس میں نمایاں کامیابی حاصل کی انھیں اسناد بھی تقسیم کی گئی۔ اس پروگرام کی صدارت ناگپور کے محقق و دانشور ڈاکٹر محمد شرف الدین ساحل نے کی نیز اسی حلقے کے نومنتخب کارپوریٹر جناب نجمے بال پاٹڑے، الحاج کامل انصاری، زیجون بی اور اشرف النساصاحبہ کا شال دے کر استقبال کیا گیا۔ مہمانِ خصوصی کے طور پر ڈاکٹر عمران خان، عافی خان، شیخ یوسف رہے۔ ادارے کے صدر جناب سعید خان اور سکریٹری عظمت خان وائس کی زینت رہے۔ اختتامی کلمات میں صدر سعید خان نے ادارے کی رپورٹ پیش کی نیز ادارہ کا تعارف اور مختلف کورسیس کی جانکاری سکریٹری جناب عظمت خان صاحب نے دی۔ نومنتخب کارپوریٹروں نے ادارہ کی کارگزاریوں کو سراہا اور ادارے کے لیے تعاون کا وعدہ بھی کیا۔ پروگرام کی ترتیب جناب شیخ یوسف نے کی اور نظامت رضوانہ بیگم اور صالحہ آفرین نے کی اور بدیہ تشکر ادارے کے پرنسپل جناب محمد غوث نے پیش کیا۔ اس پروگرام کو کامیاب بنانے میں جملہ اسٹاف ممبران کا تعاون رہا۔

پریس ریلیز، ناگپور 2012



گلوبل کمپیوٹر اکادمی کے جلسہ تقسیم اسناد کا ایک منظر

اردو سے متعلق دیگر قومی اور علاقائی خبریں



'منٹو صدی تقریبات' کا دھلی سے آغاز

سعادت حسن منٹو گنگا جمنی تہذیب کے نمائندہ ادیب تھے: ایس وائی قریشی

نئی دھلی: عہد ساز افسانہ نگار سعادت حسن خاں منٹو کے یوم پیدائش 11 مئی 1912 کے سلسلے میں عالمی اردو ٹرسٹ کے زیر اہتمام نزد یک راؤز ایونیو میں واقع ہندی بھون میں منٹو صدی تقریبات کا افتتاح کیا گیا۔ افتتاحی تقریبات کا باقاعدہ آغاز چیف الیکشن کمشنر آف انڈیا سید یعقوب قریشی نے شمع روشن کر کے کیا۔ اس موقعے پر ان کے ساتھ سابق گورنر کرناٹک اور ہندی بھون کے چیئرمین ترلوکی ناتھ چترویدی اور عالمی اردو ٹرسٹ کے چیئرمین اے آر رحمٰن ایڈووکیٹ بھی تھے۔ افتتاحی اجلاس کی صدارت ترلوکی ناتھ چترویدی نے کی جب کہ مہمان خصوصی طور پر ایس وائی قریشی نے شرکت کی۔ مہمان ذی وقار کی حیثیت سے سابق سفیر ہند و ممبر پارلیمنٹ م افضل، اردو اکادمی کے وائس چیئرمین پروفیسر اختر الواسع، راشٹریہ سہارا اردو کے سربراہ اسدرضا، این سی پی یو ایل کے ڈائرکٹر خواجہ اکرام الدین، دہلی یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے سابق صدر پروفیسر صادق، روزنامہ انقلاب کے ایڈیٹر ناتھ کلیل مشی، ہندی بھون کے سکریٹری گووند دیاس، ڈوگری زبان کی شاعرہ پدما سچدیو اور پنجاب کی ساحر لدھیانوی اکادمی کے چیئرمین ڈاکٹر کیول دھیر شریک ہوئے۔ اس موقعے پر اے آر رحمٰن کی مرتب کردہ منٹو کے 25 منتخب افسانوں پر مشتمل ایک کتاب 'منٹو کہانی' کا ایس وائی قریشی کے ہاتھوں اجرا بھی کیا گیا۔ پروگرام کی نظامت دہلی یونیورسٹی کی اسکالر افسانہ حیات نے کی۔ اس موقعے پر پروفیسر صادق نے کی استقبالیہ تقریب میں کہا کہ ان کے نام کا صحیح تلفظ دراصل 'منٹو' ہے۔ پروفیسر صادق نے منٹو کی حیات و شخصیت اور ادبی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے تقسیم وطن سے متاثرہ ان کی تصانیف کا ذکر کیا۔ اس موقعے پر ایس وائی قریشی نے کہا کہ منٹو ہماری مشترکہ گنگا جمنی تہذیب کے نمائندہ ادیب تھے جو بلا لحاظ مذہب و زبان پورے برصغیر کے لے باعث فخر ہیں۔ راشٹریہ سہارا اردو کے سربراہ اسدرضا نے منٹو کی ملک گیر سطح پر صدی تقریبات کا انعقاد کرانے پر اے رحمٰن کو مبارکباد پیش کرتے ہوئے اپنے دیرینہ ناتھ اشک کے حوالے سے کہا کہ منٹو کے مخالفین بھی ان کی شخصیت اور فنی خوبیوں کی تعریف کرتے تھے جو منٹو کی ایک بڑی کامیابی ہے۔ انھوں نے منٹو صدی تقریبات میں پڑھے جانے والے مقالات، مضامین اور تقاریر کو سہارا کے ماہانہ میگزین بزم سہارا میں یکجا کر کے خصوصی نمبر نکالنے کا بھی اعلان کیا۔ جلیل حسن شمسی نے کہا کہ منٹو جس وقت بمبئی رہے تھے اس وقت قلم میں روشنائی نہیں خون بھرا ہوا تھا۔ اس کے باوجود انھوں نے اپنی تحریروں میں فرقہ واریت کو حاوی نہیں ہونے دیا۔ خواجہ اکرام نے اپنی تقریر میں این سی پی یو ایل کے رسالہ 'فکر و تحقیق' کا منٹو پر خصوصی نمبر نکالنے کا اعلان بھی کیا۔ پدما سچدیو نے منٹو کی اردو خدمات کا ذکر کرتے ہوئے مختلف حوالوں سے ان کی حیات، شخصیت اور ان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کا تفصیل سے ذکر کیا۔ پروفیسر عتیق اللہ نے کہا کہ غالب اور منٹو ہمارے اردو ادب کے دو بڑے معمار ہیں جنھیں ہم سمبل کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ سید محمد اشرف نے کہا کہ منٹو نے اپنے افسانوں میں عورت کی ذلت کے خلاف آواز بلند کی۔ انھوں نے گیتے فرشتے کے حوالے سے ان کی تخلیقی صلاحیتوں کا ذکر کیا۔ ترلوکی ناتھ چترویدی نے منٹو کی کہانیوں کی تعریف کرتے ہوئے ان کی گہرائیوں اور پیغام کو سمجھنے کی ضرورت پر زور دیا۔ اس موقعے پر م افضل، ڈاکٹر کیول دھیر، ڈاکٹر ریحانہ سلطانہ، گووند دیاس نے بھی اظہار خیال کیا اور منٹو کی ادبی خدمات کو سراہا۔ اے رحمٰن ایڈووکیٹ نے ہندی بھون کا شکریہ ادا کرتے ہوئے تمام مہمانان کا خیر مقدم کیا اور شکریہ ادا کیا۔ اس موقعے پر قاروق ارگلی کی ادبی خدمات کو بھی سراہا گیا اور اے رحمٰن کی اس پروگرام کو کرانے کی ستائش کی گئی۔ منٹو صدی تقریبات کے افتتاحی اجلاس میں وسیم راشد، انجم عثمانی، پروفیسر ابن کنول، دیپک بدکی، ڈاکٹر شاہینہ تبسم، نصرت ظہیر، علیم الدین اسعدی، ڈاکٹر صغیر اختر، جمیل انجم، ڈاکٹر مشتاق صدف، ڈاکٹر مولا بخش، اسرار جامعی، شہباز ندیم ضیائی، اقبال فردوسی، اور سپن بھٹا چاریہ سمیت بڑی تعداد میں لوگ موجود تھے۔

روزنامہ راشٹریہ سہارا دہلی، 12 مئی 2012

• اوپر تصویر میں دائیں سے جناب م افضل، ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین، جناب ٹی این چترویدی، جناب ایس وائی قریشی، جناب اے رحمٰن، جناب گووند دیاس اور محترمہ پدما سچدیو

قومی :

آج کے اردو ادب پر سیمینار

حیدرآباد: ''تہذیب وتمدن اور ثقافت جس سیاق و سباق میں استعمال کیے جاتے ہیں وہ واضح نہیں ہے۔ خلط مبحث سے بچنا چاہیے۔ زندہ معاشرت میں تبدیلیاں ہورہی ہیں دنیا ہر لحظہ بدل رہی ہے۔ اسے محسوس کرنا ادب ہے۔ کوئی نظریہ پڑھ کر بڑا ادب تخلیق نہیں کیا جاتا۔ جب نظریہ اندر کی آگ بن جاتا ہے اور اس کی روشنی میں تخلیق اپنے آتش کدہ کو روشن کرتی ہے تو ادب پیدا ہوتا ہے۔ ادب میں فلسفہ، تواریخ تہذیب، بشریات، اساطیر، سماجیات سب کچھ شامل ہے۔ ان خیالات کا اظہار پروفیسر گوپی چند نارنگ، سابق صدر، ساہتیہ اکادمی نئی دہلی نے بحیثیت مہمان خصوصی شعبۂ اردو، یونیورسٹی آف حیدرآباد کے زیر اہتمام منسٹری آف کلچر کے اشتراک سے 17,18 اپریل کو منعقدہ دو روزہ سیمینار میں کیا۔ پروفیسر راما کرشنا راما سوامی وائس چانسلر یونیورسٹی آف حیدرآباد نے صدارت کی۔ انھوں نے کہا کہ یونیورسٹی آف حیدرآباد میں بے شمار سیمینار ہوتے ہیں۔ شعبۂ اردو کا اپنا ایک معیار ہے۔ یہ شعبہ معاصر موضوعات پر سیمیناروں کا انعقاد کرتا ہے۔ پروفیسر موہن جی رَتن نے مابعد جدیدیت کے بارے میں اظہار خیال کیا۔ انھوں نے کہا کہ ہم انگریزی سے اثرات قبول کرنے پر مجبور ہیں لیکن ہمارے اپنے مسائل ہیں جنھیں نظرانداز نہیں کیا جاسکتا ہے۔ پروفیسر شافع قدوائی، مہمان اعزازی نے آج کے گلوبل کلچر کو مکمل لٹلڈ اور میڈونا کلچر گردانا۔ انھوں نے کہا کہ آج کوئی بھی تہذیب محفوظ نہیں ہے۔ پروفیسر بیگ احساس نے ابتدا میں سیمینار کے موضوع پر روشنی ڈالی اور کہا کہ یہ سیمینار مابعد جدید ثقافتی تھیوری کو سمجھنے کے لیے منعقد کیا جارہا ہے۔ آج جو سماج کی صورت حال ہے جو کمیونیکیشن کا انقلاب ہے، جو تہذیبی تصادم ہے اور جو تہذیبی آلودگی ہے اس کا جائزہ لینا ضروری ہے۔ پہلے اجلاس کی صدارت نظام صدیقی نے کی۔ پروفیسر شافع قدوائی نے 'ثقافت کا بدلتا تناظر اور معاصر فکشن کی تفہیم' اور جناب خالد قادری نے 'نارنجی اور ادبی ڈسکورسیز کی ہم رشتگی' کے عنوان سے مقالے پیش کیے۔ دوسرا اجلاس پروفیسر سلیمان اطہر جاوید کی صدارت میں منعقد ہوا۔ جناب نظام صدیقی نے 'نئے عہد کی نظریہ تخلیقیت کی تیسری کائنات' اور جناب رؤف خیر نے مقالہ 'اردو نظم میں سماجی وثقافتی مسائل' پیش کیا۔ تیسرے اجلاس کی صدارت جناب خالد قادری نے کی۔ ڈاکٹر مشتاق صدف نے مقالہ 'نئی پیڑھی کا تخلیقی مزاج' اور ڈاکٹر غضنفر اقبال نے مقالہ بعنوان 'عصری افسانہ: سماجی وتہذیبی منظرنامہ' پیش کیا۔ دوسرے دن 18 اپریل ساڑھے دس بجے صبح چوتھا اجلاس منعقد ہوا جس کی صدارت پروفیسر گوپی چند نارنگ نے کی۔ ڈاکٹر مولا بخش نے 'معاصر افسانے میں اساطیری استعاریت' کے عنوان سے مقالہ پیش کیا اور جناب علی ظہیر نے 'آج کا اردو ادب سماجی وثقافتی مسائل: غزل کے حوالے سے' پر مقالہ پیش کیا۔



پروفیسر گوپی چند نارنگ حیدرآباد یونیورسٹی کے سیمینار سے خطاب کرتے ہوئے

ایک سال میں ایک لاکھ لوگوں کو اردو سکھائیں گے: وسیم بریلوی

نئی دھلی: قومی اردو کونسل برائے فروغ اردو زبان (این سی پی یو ایل) کے وائس چیئرمین اور ممتاز شاعر وسیم بریلوی نے اتر پردیش میں اردو زبان کی صورت حال پر شدید تشویش ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ اردو کونسل نے ریاست میں ایک لاکھ افراد کو اردو زبان اور رسم الخط سکھانے کا فیصلہ کیا ہے اور اس کام میں کونسل سے وابستہ رضا کار تنظیموں سے مدد لی جائے گی۔ یو این آئی اردو سروس سے بات کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ آزادی کے بعد اردو زبان اتر پردیش میں ایک مخصوص فرقے تک محدود ہو کر رہ گئی ہے اور ہم چاہتے ہیں کہ اردو زبان کے دائرے کو وسیع تر کیا جائے اور اردو والوں کے قافلے میں غیر اردو داں لوگوں کو بھی شامل کیا جائے۔ اردو کونسل کے وائس چیئرمین نے کہا کہ کونسل اردو کے فروغ کے لیے وسیع پیمانے پر پیش رفت کرنا چاہتی ہے اور یہ بھی چاہتی ہے کہ کونسل کے تحت چلنے والے اردو اسٹڈی سرکل پوری طرح متحرک ہوں اور اردو رسم الخط کو عام کرنے کے لیے ہر سطح پر بھرپور کوشش کی جائے۔ ملک میں اردو کا سب سے برا حال اتر پردیش میں ہے اور اسے بہتر بنانے کے لیے ہمیں اسی ریاست سے اردو کی ترویج وترقی کے لیے اپنا سفر شروع کرنا ہوگا۔ انھوں نے کہا کہ اردو کی بقا کے لیے اس کا خواتین تک پہنچنا بہت ضروری ہے کیونکہ اگر آپ نے ایک لڑکی کو اردو سکھا دی تو اردو نسل در نسل چلتی رہے گی۔ وائس چیئرمین نے کہا کہ کونسل نے فیصلہ کیا ہے کہ دور افتادہ علاقوں میں گمنامی کی زندگی گزارنے والے اردو کے قلمکاروں کی خدمات کو عوام تک پہنچایا جائے گا۔ ساتھ ہی ان شخصیات کی ایک فہرست مرتب کی جائے گی اور انھیں قومی سطح پر روشناس کراتے ہوئے ان کی خدمات کو عام کیا جائے گا تاکہ ہمارا معاشرہ ان کی خدمات کا بھی بھرپور اعتراف کر سکے۔ کونسل نے یہ بھی طے کیا ہے کہ اردو کی خدمات انجام دینے والے نادار اور ریٹائرڈ لوگوں کی گروپ انشورنس پالیسی شروع کی جائے اور اس ضمن میں بنکوں اور ایل آئی سی کی مدد حاصل کی جائے۔ انھوں نے کہا کہ کونسل کے دائرے کو وسیع کرنے کے لیے اس میں ہندوستان کے ہر حصے سے نمائندگی ہونی چاہیے تاکہ ملک کے ہر قلمکار کی صلاحیتوں اور خدمات سے معاشرے کو واقف کرایا جاسکے۔ پروفیسر وسیم بریلوی نے کہا کہ 50 برس قبل اردو کی جو فضا تھی آج کے حالات اس سے مختلف ہیں پہلے کوئی دروازہ ہی نہیں تھا آج جگہ جگہ اردو کے لیے دروازے موجود ہیں صرف دستک دینے کی ضرورت ہے۔ اس ضمن میں انھوں نے ای ٹی وی اردو، راشٹریہ سہارا اردو اور روزنامہ انقلاب کا خاص طور پر ذکر کیا اور کہا کہ غیر اردو داں طبقے کی طرف سے اردو کی زبردست خدمات انجام دی جارہی ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ملک کے ہر خطے میں لوگ اردو سیکھنے کے لیے بے تاب ہیں اور کونسل اردو سے دلچسپی رکھنے والوں کو پوری طرح مدد دے گی۔ پروفیسر وسیم بریلوی نے ای ٹی وی اردو کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ خسارے کے باوجود گزشتہ 14 برسوں سے یہ چینل جاری ہے اور ایسے اداروں اور ان کی سرپرستی کرنے والی شخصیات کو کونسل اعزاز دے گی۔

روزنامہ ہندوستان ایکسپریس، دہلی، 3 مئی 2012



اردو کو ترقی سے کوئی نہیں روک سکتا: خواجہ اکرام

نئی دھلی: انسٹی ٹیوٹ آف آبجکٹو اسٹڈیز نئی دہلی کے زیر اہتمام این سی پی یو ایل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین کو استقبالیہ دیا گیا جس کی صدارت سہارا گروپ کی اردو اشاعتوں کے سربراہ اسد رضا نے کی۔ انسٹی ٹیوٹ آف آبجکٹو اسٹڈیز نئی دہلی کے چیئرمین ڈاکٹر محمد منظور عالم نے خواجہ محمد اکرام الدین کا استقبال کرتے ہوئے کہا کہ این سی پی یو ایل کی کارکردگی قابل قدر ہے اور مجھے امید ہے کہ اس ادارے کے نئے سربراہ اسے ترقی کی نئی سمت و رفتار عطا کریں گے۔ انھوں نے کہا کہ آئی او ایس نے درسی کتابوں کی تیاری کا کام نہایت اعلیٰ معیار پر کیا ہے لیکن اس کی ترسیل اور فروختگی کی راہ میں آنے والی رکاوٹوں نے ہم کو مزید تیز نہیں ہونے دیا۔ انھوں نے کہا کہ آئی او ایس اور این سی پی یو ایل ایک بہتر مشاورتی میکانزم قائم کر سکتے ہیں۔ بشرطیکہ اعلیٰ دماغ کے ساتھ آگے بڑھنے کی کوشش کریں۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبہ اسلامک اسٹڈیز کے سربراہ پروفیسر اختر الواسع نے این سی پی یو ایل اور انسٹی ٹیوٹ آف آبجکٹو اسٹڈیز کی کارکردگی کو سراہتے ہوئے کہا کہ ہمیں اردو کے فروغ کے لیے مزید کارگر قدم اٹھانے ہوں گے انھوں نے خواجہ اکرام کی صلاحیتوں کا اعتراف کیا اور یہ توقع ظاہر کی کہ این سی پی یو ایل ان کی قیادت میں بہتر کام کرے گی۔



پروفیسر ایم ایچ قریشی نے اعتراف کیا کہ خواجہ اکرام الدین دینی علوم سے بھی واقف ہیں اور عصری علوم کے بھی وہ عالم ہیں، ایسے میں ان سے بہت سی امیدیں وابستہ ہیں۔ ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین نے اپنے خطاب میں کہا کہ اردو دنیا کی چوتھی بڑی زبان ہے، میں دنیا کے بہت سے ممالک کے مشاہدے کی بنیاد پر کہہ سکتا ہوں کہ ہر جگہ اردو کی نئی بستیاں آباد ہیں، اس لیے میرا یقین ہے کہ اردو کو ترقی کرنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ انھوں نے کہا کہ مجھے جو عہدہ دیا گیا ہے وہاں میں کوئی منصب دار بن کر نہیں بلکہ اردو کے خادم کے طور پر کام کرنا چاہتا ہوں۔ بلاشبہ این سی پی یو ایل نے غیر معمولی کام کیے ہیں اور میرا ابھی ارادہ ہے اس کارکردگی کا دائرہ ان ریاستوں تک پھیلایا جائے جہاں اس کی روشنی ابھی نہیں پہنچی ہے۔ انھوں نے کہا میں کام پر یقین رکھتا ہوں اس لیے میری کوشش ہوگی کہ ترجیحی بنیاد پر اس کے فروغ کے لیے پیش قدمی کی جائے۔ اسد رضا نے اپنے صدارتی خطاب میں اردو کے مسائل و مشکلات پر روشنی ڈالی اور غیر اردو علاقوں میں روزنامہ راشٹریہ سہارا کی مانگ کی بنیاد پر کہا کہ اردو زندہ زبان ہے اور اس کا جغرافیہ کافی وسیع ہے۔ تقریب کی نظامت راشٹریہ سہارا کے سب ایڈیٹر عبدالقادر شمس نے کی۔ روزنامہ راشٹریہ سہارا، دہلی 28 اپریل 2012

پیش کیا۔ پانچواں اجلاس پروفیسر اشرف رفیع کی صدارت میں منعقد ہوا۔ ڈاکٹر دیپم بیگم نے 'آج کی تانیثی شاعری کا منظر نامہ' ڈاکٹر آمنہ حسنین نے 'اردو میں تانیثی ادب کے عنوان سے مقالے پیش کیے۔ چھٹا اور آخری اجلاس جناب علی ظہیر کی صدارت میں منعقد ہوا۔ جس میں ڈاکٹر تسکیم ریس فاطمہ نے 'اندھیرا پگ: سماجی و ثقافتی مطالعہ' ڈاکٹر فیروز عالم نے 'اکیسویں صدی کی پہلی دہائی میں لکھے گئے ناولوں کا سماجی و ثقافتی مطالعہ' ڈاکٹر عبدالرب منظر نے 'دویہ بانی: ایک دلت آواز' ڈاکٹر طیب خراوی نے 'مجتبیٰ حسین کے مزاحیہ مضامین کا سماجی مطالعہ' اور ڈاکٹر محمد کاشف نے 'نور الحسنین کے افسانوں کا تجزیہ: سماجی و ثقافتی تناظر میں' مقالے پیش کیے۔

اختتامی تقریب کی صدارت پروفیسر گوپی چند نارنگ نے کی۔ پروفیسر مجتبیٰ حسین نے بحیثیت مہمان خصوصی کہا کہ طنز و مزاح کا ہمیشہ سماجی و تہذیبی مسائل سے سروکار رہا ہے۔ یہ سیمینار عصری منظر نامے کی وجہ سے خاصی اہمیت کا حامل ہے۔ آخر میں پروفیسر بیگ احساس نے شکریہ ادا کیا۔

پریس ریلیز، حیدرآباد، 18 اپریل 2012

ممبرا میں یونیک ایجوکیشنل سوسائٹی کا پروگرام

ممبوا: مہاراشٹر اسٹیٹ اردو ساہتیہ اکادمی کے اشتراک سے ممبرا میں یونیک ایجوکیشنل سوسائٹی کے زیر اہتمام مقالہ خوانی اور ڈراموں کا پروگرام منعقد کیا گیا جس کی صدارت ڈاکٹر مجاہد حسین حسینی نے کی، علاقہ کے ممبر اسمبلی جتیندر اوہاڑ نے افتتاحی تقریر میں کہا اردو ایک شیریں زبان ہے، کوئی اچھی اردو بولتا ہے تو محسوس ہوتا ہے کہ یہ اعلا تعلیم یافتہ اور مہذب انسان ہے، بدقسمتی سے اسے مسلمانوں کی زبان بنا دیا گیا، یہ کسی ایک مذہب کی زبان نہیں بلکہ پریم اور محبت کی بھاشا ہے۔ انھوں نے اسلامک کلچرل سینٹر، لائبریری اور کمیونٹی ہال کے لیے اپنی کوششوں کا ذکر کیا اور کہا کہ جلد ہی ممبرا کوسہ میں 'اردو گھر' کے لیے زمین بھی مل جائے گی، ڈاکٹر قاسم امام نے حاضرین کا خیر مقدم اور اکادمی کی سرگرمیوں کا تذکرہ کیا۔ رجب جعفری کی ہدایت میں منٹو کے مضمون پر مشتمل ڈرامہ 'میری شادی' اور 'مرزا اور غالب' اور نکیش جالھوکی ہدایت میں ڈرامہ منٹو کے خطوط پیش کیا گیا۔

پریس ریلیز، ممبرا، 2012

شعبۂ عربی دہلی یونیورسٹی میں دو روزہ سیمینار

نئی دھلی: دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ عربی نے ہندوستان میں سیرت لٹریچر "ادب السیر و فی الہند" کے اہم موضوع پر دو روزہ سیمینار کے افتتاحی اجلاس کا انعقاد کیا۔ افتتاحی اجلاس کی صدارت پروفیسر محمد محسن عثمانی ندوی سابق صدر شعبہ عربی المظفر یونیورسٹی حیدرآباد نے کی اور معروف اسکالر پروفیسر اختر الواسع نے اس موضوع پر اپنا کلیدی خطبہ پیش کیا جب کہ نظامت شعبہ عربی سے پروفیسر محمد نعمان خان نے کی۔ پروفیسر اختر الواسع نے کلیدی خطبے میں موضوع کا پورا احاطہ کرتے ہوئے ہندوستانی علما کے کارہائے نمایاں کو بڑے منطقی انداز میں عہد بہ عہد اجاگر کیا اور سیرت نگاری میں ان کی خدمات کا تذکرہ کرتے ہوئے بتایا کہ یہاں پر فن حدیث و سیرت پر ہمارے علما نے جو کام کیا ہے وہ نہ صرف ہندوستان میں بلکہ پورے عالم اسلام میں قدر کی نگاہوں سے دیکھا گیا ہے۔ پروفیسر محمد محسن عثمانی نے اپنی صدارتی گفتگو میں کلیدی خطبے کو سراہا۔

روزنامہ ہمارا سماج، دہلی 22 مارچ 2012

جے این یو میں یوم اردو

نئی دھلی: جواہر لال نہرو یونیورسٹی میں یوم اردو کے موقعے پر منعقدہ جلسے کو خطاب کرتے ہوئے ڈاکٹر انور پاشا نے اردو کی بقا کو ہندوستان میں لسانی و تہذیبی جمہوریت کی بقا سے تعبیر کیا اور کہا کہ کسی بھی ملک کی جمہوریت صرف سیاسی جمہوریت تک محدود رہ کر فروغ نہیں پا سکتی۔ کسی بھی ملک کے عوام کے لسانی و تہذیبی حقوق محفوظ نہ ہوں، وہاں

3/21/2018 P92.jpg (1758×2358)

کی جمہوریت حقیقی جمہوریت نہیں کہلا سکتی۔ اس موقعے پر ڈاکٹر اخلاق آہن، ڈاکٹر ابوظہیر ربانی، ڈاکٹر عمران، ایڈووکیٹ سہیل اور ڈاکٹر عبدالقیوم نے بھی جلسے کو خطاب کیا۔ ڈاکٹر عمران نے کہا کہ اردو ہی ملک کی وہ واحد زبان ہے جو ہر طبقے کی بہترین نمائندگی کرتی ہے۔ اس جلسے میں تین ریزولیوشن بھی پاس کیے گئے جو مختلف ریاستی حکومتوں اور مرکزی حکومت کو بھیجے جائیں گے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، یکم اپریل 2012

انجمن ترقی پسند مصنّفین کی 15ویں کانفرنس

نئی دہلی: انجمن ترقی پسند مصنّفین کی کل ہند پندرھویں کانفرنس 14، 13، 12 اپریل 2012 کو دہلی یونیورسٹی کے کانفرنس سنٹر میں منعقد ہوئی جس کا افتتاح ممتاز ادیب اور سماجی کارکن اصغر علی انجینئر نے کیا۔ کانفرنس میں ملک بھر کی بیس ریاستوں کے تقریباً چار سو مندوبین نے شرکت کی۔ ان ادیبوں، شاعروں اور صحافیوں نے ہندوستان کی تقریباً ہر بڑی زبان کی بھی نمائندگی کی۔ ان کے علاوہ مصر، جاپان، پاکستان اور ازبکستان سے بھی خیر سگالی اور کامیابی کا پیغام لے کر بالترتیب ڈاکٹر حلمی حدیدی (صدر ایفرو ایشین رائٹرز ایسوسی ایشن)، آکیو ہاگا، بابر ایاز اور محیہ عبدالرحمان نے شرکت کی۔ 'قلم' برائے امن اور رواداری' کے موضوع پر منعقد اس کانفرنس کا آغاز انقلابی گیتوں سے ہوا۔ جنرل سکریٹری علی جاوید کے تعارفی کلمات کے بعد انجمن کے صدر پروفیسر نامور سنگھ نے استقبالیہ خطبہ دیا جس کے بعد جناب اصغر علی انجینئر نے کانفرنس کا باقاعدہ افتتاح کیا۔ اس اجلاس میں مہمانِ خصوصی کے طور پر مصر کے حلمی حدیدی نے شرکت کی۔ دیگر مقررین میں ہندی کے معروف نقاد پروفیسر وشوناتھ ترپاٹھی اور کھگیندر ٹھاکر، دلت مفکر پروفیسر تلسی رام، اپٹا کے جنرل سکریٹری جیتندر رگھوونشی، پاکستان کے نمائندے بابر ایاز اور جاپان کے اکیو ہاگا وغیرہ شامل تھے۔

پریس ریلیز، دہلی 15 اپریل 2012

تفہیم غالب کے امکانات

نئی دہلی: مرزا غالب کی عظمت یہی ہے کہ وہ ہر زمانے کا شاعر ہے۔ یہ بات جواہر لعل نہرو یونیورسٹی کے لینگویجز بلاک کے سیمینار ہال میں ہندوستانی زبانوں کا مرکز کے زیر اہتمام 'فیض میموریل لکچر' کے دوسرے توسیعی خطبے کے تحت تفہیم غالب کے نئے امکانات پر روشنی ڈالتے ہوئے اردو کے دانشور اور نقاد پروفیسر ابوالکلام قاسمی نے کہی۔ توسیعی خطبے کا آغاز پروگرام کے مہتمم پروفیسر معین الدین جینا بڑے نے پروفیسر ابوالکلام قاسمی کے تعارف اور فیض و غالب میں فکری مماثلت پر اپنی گفتگو سے کیا۔ پروفیسر جینا بڑے نے فیض کے شعری مجموعوں کی وجہ تسمیہ میں غالب کے مصرعوں کی نشان دہی کرتے ہوئے توسیعی خطبے کی غرض و غایت پر روشنی ڈالی۔ ہندوستانی زبانوں کے مرکز کے چیئرمین پروفیسر کرشنا سوامی نچی متو پروفیسر چمن لال نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ ڈاکٹر آصف زہری نے کلمات تشکر ادا کیے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 29 مارچ 2012

مہدی حسن کو ہندوستان کا ویزا



نئی دہلی: عظیم غزل سنگر مہدی حسن کو ہندوستان آنے کا ویزا مل گیا ہے اور اب وہ ہندوستان علاج کے لیے آسکیں گے۔ طویل عرصے سے علالت کا شکار مشہور غزل سنگر مہدی حسن کو علاج کے لیے ہندوستان آنے کا ویزا مل گیا ہے۔ 3 ماہ قبل مشہور غزل سنگر مہدی حسن کو کراچی کے آغا خان اسپتال میں تشویشناک حالت میں داخل کیا گیا تھا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 26 اپریل 2012

جمیل مہدی پر سیمینار

نئی دہلی: لفظ کی صداقت اور وطن سے محبت شاعری کو درخشندہ بناتی ہے۔ جمیل مظہری کے یہاں سیاسیات اور عمرانیات کے موضوعات بھی ملتے ہیں گرچہ انھوں نے اقبال کا تتبع کیا لیکن اپنی شناخت قائم رکھی۔ ان خیالات کا اظہار پروفیسر گوپی چند نارنگ نے غالب انسٹی ٹیوٹ میں اردو اکادمی دہلی، غالب انسٹی ٹیوٹ، اردو پریس کلب اور سب رنگ کے زیر اہتمام جمیل مظہری پر منعقد 2 روزہ قومی سیمینار کی 'افتتاحی تقریب میں کیا۔ انھوں نے اس موقعے پر جاری کی گئی کتاب 'انتخاب کلام مظہری' کو عطر مجموعہ قرار دیا۔ افتتاحی تقریب کی صدارت سید شاہد مہدی نے کی۔ اس موقعے پر غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر شاہد ماہلی، اردو پریس کلب کے صدر شمیم احمد خان اور سب رنگ کے صدر ڈاکٹر عبیدالرحمٰن نے خصوصی طور سے شرکت کی کلیدی خطبہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے پروفیسر ابوالکلام قاسمی نے پیش کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 28 اپریل 2012

غالب اور رفیع بھی 'بھارت رتن' کے مستحق



نئی دہلی: اردو کے نامور شاعر مرزا غالب اور ہندی فلموں کے مشہور گلوکار محمد رفیع کو بھارت رتن دیے جانے کا مطالبہ کیا گیا ہے۔ سماج وادی پارٹی کے شیلندر کمار نے پارلیمنٹ میں یہ معاملہ اٹھاتے ہوئے کہا کہ بھارت رتن دیے جانے کے سلسلے میں ایک بار پھر مختلف خبروں کا سلسلہ شروع ہو گیا ہے جس میں سچن تندولکر کا بھی نامل شامل ہے۔ انھوں نے کہا کہ سچن کے نام پر کچھ سیاست بھی ہو رہی ہے لیکن صدا بہار فلمی گلوکار محمد رفیع اور عظیم شاعر مرزا غالب جیسی شخصیتوں کا کوئی ذکر نہیں ہے جن کے بارے میں یہ کہنا بجا ہے کہ ان کا ہے انداز بیاں اور، مسٹر کمار نے کہا کہ غالب اور رفیع کو بھارت رتن دینا خود ملک کے عوام کے لیے باعث عز و شرف ہوگا۔

روزنامہ 'جدید میل' دہلی، 28 اپریل 2012

دہلی:

ماضی قریب سے مکالمہ

نئی دہلی: قومی راجدھانی خطہ دہلی سرکار محکمہ فن، ثقافت اور السنہ، اردو سیل کے زیر اہتمام، غالب انسٹی ٹیوٹ میں 'ماضی قریب سے مکالمہ' کے عنوان سے دو روزہ سیمینار کا انعقاد کیا گیا۔ افتتاحی جلسے کی صدارت پروفیسر گوپی چند نارنگ، جب کہ نظامت اشفاق عارفی نے کی۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ نے صدارتی خطبے میں کہا کہ جن مرحومین کو آج یہاں یاد کیا جا رہا ہے ان میں زیادہ تر علی گڑھ اور دہلی کے ہیں اور دونوں ادب کے بڑے شہر ہیں۔ انھوں نے تمام ادب کے ستاروں کو نام بنام خراجِ عقیدت پیش کیا۔ انھوں نے کہا کہ شہریار اور مغنی تبسم میرے وجود کا حصہ ہیں۔ میں شہریار کی نظموں سے زیادہ متاثر ہوں۔ ایسے فنکار بہت کم ہوتے ہیں جو فیض رساں

http://urducouncil.nic.in/Urdu-Duniya/Urdu-Duniya-June-2012/P92.jpg 1/1

ہوتے ہیں۔ ماضی قریب سے مکالمہ میں فیضانِ فن و کردار کے گلہائے نیرنگ آپ کے اذہان کو یقیناً معطر کریں گے۔ اردو سیل کے آفیسر ڈاکٹر اشتاق عارفی نے خیر مقدمی کلمات کے ساتھ سیمینار کے موضوع پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ اکیسویں صدی کے ابتدائی حصے میں اردو زبان وادب کی مشہور و معروف اور ممتاز شخصیات ماضی کی یادوں کا خزینہ بن گئی ہیں جنھیں خراج عقیدت پیش کرنا ہمارا اولین فریضہ ہے۔ سیمینار میں پروفیسر شہریار، مظہر امام، مغنی تبسم، عبدالقوی دسنوی، پروفیسر ساجدہ زیدی، پروفیسر زاہدہ زیدی، راج بہادر گوڑ، ہلراج ورما، شجاع خاور، صلاح الدین پرویز، ڈاکٹر فرید پرتی اور ساجد رشید وغیرہ کو یاد کرنے اور ان کے علمی اور فنی کمالات اور ان کی خدمات کا اعتراف کرنے کے لیے مقالے پڑھے گئے۔

روزنامہ انقلاب دہلی 23 اپریل 2012

دہلی یونیورسٹی میں خورشید فاروقی میموریل لیکچر

نئی دھلی: شعبۂ عربی دہلی یونیورسٹی کی جانب پروفیسر خورشید احمد فاروقی یادگاری خطبے کا انعقاد کیا گیا جس میں خصوصی مقرر کے طور پر پروفیسر ذکر الرحمان نے اپنا کلیدی خطبہ انگریزی زبان میں پیش کیا۔ پروفیسر ذکر الرحمان انڈیا، عرب کلچرل سینٹر کے صدر اور سفارت کار ہیں۔ اپنے خطبے میں انھوں نے پروفیسر خورشید احمد فارق اور پروفیسر سلیمان اشرف کی حیات وخدمات کا ذکر کرتے ہوئے آزادی کے بعد ہندوستان میں عربی ادب کے ارتقا پر تفصیلی روشنی ڈالی، جس میں ان دونوں مرحوم پروفیسروں کا کردار بہت اہم ہے، جنھیں کبھی فراموش نہیں کیا جائے گا۔ کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے پروفیسر شریف الحسن قاسمی نے کہا کہ پروفیسر محمد سلیمان اشرف کی شخصیت ایک سبق آموز شخصیت تھی۔

روزنامہ انقلاب دہلی، 21 مارچ 2012

اخبار نو لٹریری فورم کا استقبالیہ

نئی دھلی: اردو ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن اور اخبار نو لٹریری فورم، نئی دہلی کے زیر اہتمام دفتر اخبار نو، واقع پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی میں ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین (ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی) کے اعزاز میں تہنیتی جلسے کا انعقاد کیا گیا، جس کی صدارت ڈاکٹر عبدالحق (پروفیسر ایمرٹس، دہلی یونیورسٹی) نے اور نظامت معروف صحافی سہیل انجم نے کی۔ اسرار جامعی نے تہنیتی قطعہ پیش کیا۔ صدارتی کلمات میں پروفیسر عبدالحق نے کہا کہ NCPUL میں بحیثیت ڈائرکٹر ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین کا تقرر تمام اساتذہ برادری کے لیے باعث مسرت ہے اور ہم سب کی یہ ذمے داری بنتی ہے کہ ہم ان کو کامیاب بنانے میں اپنا مخلصانہ تعاون پیش کریں۔ ڈاکٹر شعیب رضا خاں نے کہا کہ ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین کو قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کا ڈائرکٹر بنایا جانا خوش آئند ہے۔ دہلی یونیورسٹی کے شعبہ صدر اردو پروفیسر توقیر احمد خاں نے کہا کہ ڈاکٹر ایک فعال اور نیک سیرت انسان ہیں اور انھیں کام کرنے میں خوشی کا احساس ہوتا ہے۔ سابق صدر شعبہ اردو، دہلی یونیورسٹی پروفیسر ابن کنول نے کہا کہ وہ وسیع النظر شخصیت کے حامل ہیں اور ان کے سامنے اردو کو فروغ دینے کا حوصلہ اور عزم ہے اور اب تک وہ اپنے سبھی مقاصد میں کامیاب رہے۔ پروفیسر شاہد حسین (سابق صدر شعبہ اردو، جواہر لعل نہرو یونیورسٹی) نے کہا کہ ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین آج جو کچھ ہیں وہ اپنی ذاتی محنت ومشقت کے بل بوتے ہیں۔ ڈاکٹر شریف احمد (سابق صدر شعبہ اردو، دہلی یونیورسٹی) نے ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین کے تقرر پر خوشی کا اظہار کیا۔ جناب م افضل (سابق سفیر انگولہ و ترکمانستان) نے کہا کہ وہ اپنی زمین سے جڑے ہوئے ہیں اس لیے انھیں ہر چھوٹا بڑا شخص جانتا ہے اور یہی خوبی انھیں ڈائرکٹر NCPUL بنانے میں کامیاب رہی۔ ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین نے استقبالیہ پر شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ اللہ تعالیٰ کا بڑا کرم ہے کہ اس نے مجھے اردو کی خدمت کا موقع فراہم کیا۔ انھوں نے NCPUL کو مزید توسیع وترقی دینے کے تمام منصوبوں پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ NCPUL کا تعلق ہندوستان سے ہے اس لیے ہندوستان کے سبھی صوبوں کی نمائندگی بھی ضروری ہے۔ ڈاکٹر سیّد احمد خاں اور مودود صدیقی نے گل پوشی کے ذریعے ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین کا استقبال کیا اور اخبار نو لٹریری فورم کے سکریٹری عظیم اختر نے تمام شرکا کا شکریہ ادا کیا۔

پریس ریلیز، نئی دہلی، 21 اپریل 2012

ہادی حسن یادگاری خطبہ

نئی دھلی: جامعہ ملیہ اسلامیہ شعبہ فارسی کی جانب سے ہندو عرب ثقافتی مرکز کے سیمینار ہال میں بارہویں ہادی حسن یادگاری خطبے کا اہتمام کیا گیا۔ شعبۂ فارسی کے صدر پروفیسر محمد اقبال نے مہمانوں کا استقبال کرتے ہوئے پروفیسر ہادی حسن مرحوم کی حیات پر مختصر روشنی ڈالی اور بتایا کہ پروفیسر ہادی حسن کا اصل تعلق باغی سے تھا اور ان کو فارسی سے اتنا لگاؤ تھا کہ آپ نے فارسی میں پی ایچ ڈی کی اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں شعبہ فارسی کے صدر رہے۔ ڈاکٹر وجیہ الدین بڑودہ یونیورسٹی بڑودہ نے جلال اسیر (صفوی دور کے مشہور شاعر) کے عنوان سے اپنا خطبہ دیا۔ اپنے خطبے میں انھوں نے کہا کہ جلال اسیر وہ شاعر ہے جو کبھی ہندوستان نہیں آیا لیکن یہاں اسے کافی شہرت نصیب ہوئی۔ مہمان خصوصی پروفیسر قاضی عبید الرحمن ہاشمی نے اپنے خطاب میں کہا کہ ہمارے طلبا کو چاہیے کہ صفوی دور کے شاعروں کا بخوبی مطالعہ کریں۔ تقریب کی صدارت اکیڈمک اسٹاف کالج جامعہ ملیہ کے ڈائریکٹر سید حسن محمود نے کی۔

روزنامہ صحافت دہلی، 21 مارچ 2012

پروفیسر محمد حسن کی دوسری برسی



نئی دھلی: جواہر لال نہرو یونیورسٹی میں پروفیسر محمد حسن کی دوسری برسی پر منعقدہ محمد حسن میموریل لکچر کے دوران مقررین نے انھیں معاصر تنقید کا معمار قرار دیا۔ پروفیسر ظہور الدین، پروفیسر انور پاشا، پروفیسر چمن لال، پروفیسر کرشنا سوامی، پروفیسر گنگا پرساد ویمل، پروفیسر محمد حسن کے فرزند خورد نوید حسین، صاحب زادی ڈاکٹر ثمینہ حسن اور ان کی اہلیہ ڈاکٹر روشن آرا بیگم نے بھی اظہار خیال کیا۔ پروفیسر انور پاشا نے ہر سال 24 اپریل کو محمد حسین میموریل لکچر کے اہتمام کا اعلان کیا۔

روزنامہ ہمارا سماج ہلی، 28 اپریل 2012

اردو اکادمی کے بجٹ میں اضافہ

نئی دھلی: دہلی سرکار نے اردو اکادمی دہلی کا سالانہ بجٹ ساڑھے چار کروڑ روپے سے بڑھا کر تقریباً 6 کروڑ کر دیا ہے۔ اس اقدام پر دہلی سرکار اور وزیر اعلیٰ شیلا دیکشت کا شکریہ ادا کرنے کے ساتھ انھیں سچا اردو دوست قرار دیا جا رہا ہے۔ وزیر اعلیٰ شیلا دیکشت نے اردو اکادمی کے فنڈ کی اضافی رقم سے اردو کی متعدد تاریخی وقدیمی کتب کا ہندی اور انگریزی ترجمہ کرانے کی ضرورت پر زور دیا۔

دوسروں پر ظلم کا نام جہاد نہیں

نئی دھلی: صوفی خدا کی عبادت جہنم کے ڈر اور جنت کے لالچ میں نہیں کرتا بلکہ وہ خدا کی عبادت اس لیے کرتا ہے کہ وہ ہی بندگی کے لائق ہے۔ صوفی کو لٹریچر سے سمجھا نہیں جاسکتا اسے سمجھنے کے لیے اس کے ساتھ رہنا ضروری ہے اسی لیے خانقاہیں قائم کی گئیں۔ صوفی ازم میں عمل زیادہ ہے اور تھیوری کم ہے۔ ان خیالات کا اظہار آل انڈیا علماء و مشائخ بورڈ کے جنرل سکریٹری مولانا سید محمد اشرف کچھوچھوی نے ویلکامنڈ انٹرنیشنل فاؤنڈیشن اور گلوبل فاؤنڈیشن فار سویلائزیشنل ہارمنی کے اشتراک سے منعقد ذاکرہ 'صوفی ازم اینڈ انٹرنیشنل اسلام' میں کیا۔ انھوں نے کہا کہ اس دور میں نام نہاد اسلام کے ماننے والے پیدا ہوگئے جنھیں اسلامی تعلیم سے کوئی سروکار نہیں بلکہ وہ اپنے مقصد کے لیے اسلام کے نام کا استعمال کررہے ہیں۔ جہاد حفاظت کا نام ہے گناہ کا نہیں۔ جہاد کرنا ہے تو اپنے نفس سے کرو یہ جہاد اکبر ہے دوسرے پر ظلم کرنے کا نام جہاد نہیں ہے۔ آج جہاد کو حکومت حاصل کرنے کا ذریعہ بنا لیا گیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ اسلام اور اس کے ماننے والوں کا ایسے لوگوں سے کوئی تعلق نہ کبھی تھا اور نہ کبھی رہے گا۔ میں


سبھاش چندرا

خواجہ محمد اکرام

نے اسی مقصد سے بورڈ کا قیام کیا کہ ہندوستان ہی نہیں بلکہ پوری دنیا میں صوفی ازم کو عام کرنے کی ضرورت ہے تبھی جا کر دہشت گردی کا خاتمہ ہوگا۔ دراصل صوفی ازم ان لوگوں تک پہنچا ہی نہیں۔ انھوں نے کہا کہ صوفیا اور اولیا جب اس زمین کے اوپر تھے تب بھی بندگان خدا ان کے قریب تھے اور اب وہ زمین کے نیچے ہیں تب بھی مخلوق ان کے قریب ہے۔ انھوں نے کہا کہ وہ شخص ادھورا ہے جس کے پاس علم اور عشق دونوں میں سے ایک بھی کم ہو لیکن صوفی وہ ہوتا ہے جو علم بھی رکھتا ہے اور عشق بھی۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر خواجہ اکرام الدین نے کہا کہ صوفی ازم نے محبت، بھائی چارہ اور اتحاد کا پیغام دیا ہے۔ صوفی ازم اسلام کی حقیقی روح ہے۔ ڈی بیٹ ورک اور جی ایف سی ایچ کے چیئرمین سبھاش چندرا نے کہا کہ میں حضرت کی اس بات سے اتفاق کرتا ہوں کہ صوفی ازم لوگوں تک نہیں پہنچا۔ کچھ لوگ اس پاک مذہب اسلام کو بدنام کررہے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ میں مولانا محمد اشرف کے اس مشن میں برابر کا شریک ہوں اور ان کے ساتھ قدم بہ قدم چلوں گا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 25 اپریل 2012

بیٹھے شائقین جھومے بغیر نہ رہ سکے۔ وہیں اس موقعے پر پاکستان کی صوفی گلوکارہ عمنہ ماردی کے ذریعے پیش کی گئی کبیر کی شاعری کو لوگوں نے خوب پسند کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، یکم مئی 2012

محمود ذکی کی یاد میں جلسہ و مشاعرہ

نئی دھلی: معروف ادیب، شاعر اور صحافی محمود ذکی کی یاد میں بستی حضرت نظام الدین اولیا میں واقع غالب اکادمی میں جلسہ و مشاعرہ کا انعقاد کیا گیا جس کا اہتمام عالمی اردو ٹرسٹ نے محمود ذکی کے بیٹے مظہر محمود، نظر محمود، ظفر محمود اور بھائی پروفیسر صادق کے تعاون سے کیا۔ جلسے کی صدارت جسٹس فخر الدین نے کی جب کہ مہمانان خصوصی کے طور پر پروفیسر عتیق اللہ، پروفیسر ابن کنول، پروفیسر اختر الواسع اور پروفیسر صادق نے شرکت کی۔ جلسے و مشاعرے کی نظامت ڈاکٹر شکیل ایوب نے کی۔ اس موقعے پر ڈاکٹر عقیل احمد، عالمی اردو ٹرسٹ کے سرپرست اے رحمٰن ایڈووکیٹ، خاتون صحافی وسیم راشد، ڈاکٹر خالد اشرف نے محمود ذکی کی ادبی، علمی، دینی و صحافتی خدمات اور سرگرمیوں کی تفصیلات بیان کیں۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 4 مئی 2012

اتر پردیش :

جگر مرادآبادی اور ان کے فن پر سیمینار



سنبھل: جگر مرادآبادی کی شاعری کا موضوع محبت اور اس کا والہانہ انداز ہے لیکن جگر زندگی کا احترام اور انسانی اقدار کو ترجیح دیتے بھی دکھائی دیتے ہیں۔ ان خیالات کا اظہار علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے پروفیسر سراج اجملی نے آزاد گرلز انٹر کالج میں فخر الدین علی احمد میموریل کمیٹی کے زیر اہتمام منعقدہ سیمینار 'نغمہ فراموش جگر مرادآبادی شخصیت اور شاعری' کے دوران بطور مہمان خصوصی کیا۔ انھوں نے کہا کہ وضع داری اور شرافت ان کا طرہ امتیاز نظر آتا ۔ ڈاکٹر عصمت شیخ آبادی (لکھنؤ) فرقان سنبھلی نجیب الرحمٰن سنبھلی سابق پرنسپل محمد راشد سحر نعمانی محمد اویس سنبھلی تنویر محمد یوسف حماد احمد ایڈووکیٹ اور شہزاد احمد نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

روزنامہ 'جدید خبر' دہلی، 2 اپریل 2012

مرادآباد میں جشن یوم صحافت

مرادآباد: اردو زبان کی تعلیم اور ترقی کے بغیر اردو صحافت کا فروغ ممکن نہیں ہے۔ جب تک اتر پردیش میں سرکاری سطح پر اردو تعلیم کا بندوبست نہیں ہوگا، اس وقت تک نہ تو اردو اخبارات کے نئے قارئین پیدا ہوں گے اور نہ ہی اس فن کو فروغ حاصل ہوگا۔ ان خیالات کا اظہار آج یہاں ملک کے سرکردہ صحافیوں نے جشن یوم صحافت کی تقریب کے دوران ٹاؤن ہال کے آڈیٹوریم میں کیا۔ روزنامہ 'آگ' لکھنؤ کے ایڈیٹر اور سینئر صحافی احمد ابراہیم علوی، 'جدید خبر' نئی دہلی کے ایڈیٹر معصوم مرادآبادی، ماہ نامہ 'نیا دور' لکھنؤ کے ایڈیٹر ڈاکٹر وضاحت حسین رضوی

کبیر کی شاعری اور صوفیانہ موسیقی

نئی دھلی: انسانی ذہن کو سکون دلانے والی موسیقی ہر شخص کو پسند آتی ہے۔ اگر وہی موسیقی مذہبی رس میں ڈبو کر نئے فیوزن کے ساتھ پیش کیا جائے تو ناظرین کے لیے یہ کسی نئے احساس سے کم نہیں ہوتا۔ کچھ اسی انداز میں چاکیہ پوری میں واقع نہرو پارک میں چل رہے سہ روزہ صوفیانہ موسیقی فیسٹیول کے آخری دن شائقین جھومتے رہے۔ ایک طرف دہلی کے بینڈ سائلنس آف سول بے جب 'بدھم شرنم گچھامی' سے پروگرام کی شروعات کی تو وہاں

نے بھی اظہار خیال کیا۔ سینئر صحافی مرتضیٰ اقبال کی مرتبہ کتاب 'کاروان آزادی' کا اجرا عمل میں آیا۔ احمد ابراہیم علوی، معصوم مرادآبادی اور ڈاکٹر وضاحت حسین رضوی کو صحافتی خدمات کے اعتراف میں مومنٹو پیش کیے گئے۔

شہروزنامہ 'خبر جدید' نئی دہلی، 27 مارچ 2012

اردو بیداری مہم جلسہ

سیتاپور: اردو صرف ہماری مادری زبان ہی نہیں بلکہ ہندوستانی تہذیب بھی ہے جس کی حفاظت کی ذمے داری ہماری ہونی چاہیے۔ یہ بات اردو بیداری مہم کے ایک جلسے کو خطاب کرتے ہوئے بزم اردو سیتاپور کے صدر مست حفیظ رحمانی نے مقامی اردو ہال میں کہی۔ مست حفیظ رحمانی نے مزید کہا کہ اردو کو بنیادی سطح پر مضبوط کرنے کے لیے ضروری ہے کہ درجہ ایک سے آٹھ تک اردو مضمون کو پڑھانا لازمی قرار دیا جائے اور ہر اسکول میں ایک استاد کی تقرری بھی کی جائے۔ انھوں نے بتایا کہ بزم اردو کی جانب سے ایک میمورنڈم وزیر اعلیٰ کو بھیجا جا رہا ہے جس میں ریاستی سطح پر اردو بورڈ کے قیام کا مطالبہ کیا جائے گا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج'، دہلی، 21 مارچ 2012

مرادآباد میں پروفیسر محمد حسن پر سیمینار

مرادآباد: ڈاکٹر محمد حسن فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام ایک سیمینار بیاد ڈاکٹر محمد حسن کے عنوان سے انڈین میڈیکل ایسوسی ایشن ہال کچہری کمپاؤنڈ میں منعقد کیا گیا۔ پروگرام کے مہمان خصوصی جسٹس مارکنڈے کاٹجو صدر پریس کونسل آف انڈیا تھے۔ اعزازی مہمان پروفیسر وسیم بریلوی وائس چیئرمین این سی پی یو ایل اور ڈاکٹر خواجہ اکرام الدین ڈائرکٹر این سی پی یو ایل تھے۔ صدارت ڈاکٹر مختار فہیم نے اور نظامت منصور عثمانی نے کی۔ کنوینر ایس ایم فردوس نے فاؤنڈیشن کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالی اور فاؤنڈیشن کی کارکردگی کی رپورٹ پیش کی۔ لکھنؤ یونیورسٹی کے پروفیسر شارق ردولوی پروفیسر عبدالحق، پروفیسر اے احمد فاطمی، پروفیسر انور پاشا، سرور الہدیٰ، عبدالسمیع نے ڈاکٹر محمد حسن کی خدمات ان کے اوصاف حمیدہ اور علمی و ادبی خدمات کا تفصیل سے ذکر کیا۔ میئر ڈاکٹر ایس ٹی حسن اور شہر کمشنر لال جی رائے نے ڈاکٹر محمد حسن کی خدمات کو سراہتے ہوئے ایس کمار کے نام سے موسوم چوراہے کو ڈاکٹر محمد حسن چوک کرنے کا اعلان کیا۔ سابق میئر سینئر صحافی ہمایوں قدیر نے ڈاکٹر محمد حسن کی علمی و ادبی خدمات کو ملک کے لیے نہیں سارے عالم کے لیے مفید قرار دیا۔ مشہور شاعر پروفیسر وسیم بریلوی نے کہا کہ محمد حسن میرے چچا تھے اور انھوں نے ہمیشہ اردو کے فروغ کی بات کی۔ ڈاکٹر انور پاشا نے کہا کہ ڈاکٹر محمد حسن نے معاشرے کو پاک صاف اور معلوماتی کتابوں سے آراستہ کیا جو ادب اور علم کا خزانہ ہیں۔ پروفیسر فاطمی نے کہا کہ ڈاکٹر محمد حسن نے اردو ادب کی جو خدمت کی اس کے لیے انھیں رہتی دنیا تک یاد رکھا جائے گا۔ ڈاکٹر شارق ردولوی نے کہا کہ میری خوش نصیبی ہے کہ مجھے ڈاکٹر محمد حسن فاؤنڈیشن کے شاندار پروگرام میں شرکت کا موقع ملا۔ مشہور افسانہ نگار رتن سنگھ نے کہا ہے ڈاکٹر محمد حسن اپنی ادبی خدمات کی وجہ سے اتنے مقبول تھے کہ جب میں پاکستان گیا تو وہاں صحافیوں نے مجھ سے ڈاکٹر محمد حسن سے متعلق سوالات کیے۔ مہمان خصوصی جسٹس مارکنڈے کاٹجو نے کہا کہ ڈاکٹر محمد حسن علم، ادب، سیاست، صحافت اور ثقافت کا ادارہ تھے۔ انھوں نے اردو ادب کو بیش قیمت گوہروں سے نوازا۔ ڈاکٹر محمد حسن کے افسانوی مجموعے آڑے ترچھے آئینے کا اجرا بھی مہمان خصوصی جسٹس مارکنڈے کاٹجو کے دست مبارک سے عمل میں آیا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 23 اپریل 2012

میلہ نوچندی کمیٹی کی اردو کانفرنس

میرٹھ: میلہ نوچندی کمیٹی کے زیر اہتمام اردو کانفرنس منعقد ہوئی جس میں اردو زبان کے سیکھنے اور سکھانے سے متعلق گفتگو ہوئی۔ پروگرام کی شمع ڈاکٹر سروجنی اگروال ایم ایل سی نے روشن کی۔ صدارت ڈاکٹر اسلم جمشید پوری پروفیسر شعبۂ اردو چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی نے اور نظامت سید اظہر علی و ڈاکٹر جویری نے کی۔ سید اظہر علی نے تنظیم کی رپورٹ پڑھ کر سنائی۔ ڈاکٹر سروجنی اگروال نے اردو کو ادب کی جوان بتایا اور کہا کہ سرکار کو اردو کی ترقی کی فکر کرنی چاہیے۔ نگر آیکت راجکمار سچان ہوری نے اردو پروگرام کی تعریف کی اور اردو کو ترقی دے کر روزگار سے جوڑنے کو کہا ہے۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 10 مئی 2012

امروہہ میں لائبریری کا افتتاح

امروہہ: شہر علم و ادب امروہہ، دورِ حاضر میں جب تمام تہذیب دنیا سے رخصت ہو رہی ہیں ایسے دور میں بھی تہذیب و تمدن کا مرکز بنا ہوا ہے۔ اس شہر نے اردو کے فروغ کے لیے جو بین الاقوامی خدمات انجام دی ہیں اس کی شہرت پورے برصغیر میں ہے۔ ان خیالات کا اظہار قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے نائب صدر اور ہندوستان کے معروف شاعر پروفیسر وسیم بریلوی نے امروہہ کی اشرف المساجد کے سلونی ایجوکیشنل سینٹر میں قائم سلیم لائبریری کے افتتاح کے موقعے پر کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 24 اپریل 2012

بہار:

مولانا ابوالکلام آزاد اور اعلیٰ تعلیم

جمشید پور: کریم سٹی کالج جمشید پور کے شعبۂ تاریخ میں یو جی سی کے تعاون سے نیشنل کانفرنس بعنوان 'مولانا ابوالکلام آزاد اور ہندوستان میں اعلیٰ تعلیم' منعقد ہوئی جس میں کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی شعبۂ اسلامک اسٹڈیز کے سربراہ پروفیسر اختر الواسع نے کہا کہ مولانا ابوالکلام آزاد کے نظریات خالص اسلامی تھے اور مولانا کا قومیت کا نظریہ میثاق مدینہ پر منحصر تھا۔ انھوں نے کہا کہ ہجرت کے بعد حضرت محمدؐ نے کافروں اور یہودیوں سے معاہدہ کیا تھا اور سب کو ایک قوم قرار دیا تھا۔ اسی کے پیش نظر مولانا ابوالکلام آزاد نے نظریہ پیش کیا کہ ایک قوم میں مختلف مذاہب کے لوگ رہ سکتے ہیں اور اسی تناظر میں مولانا آزاد نے تقسیم ہند کے وقت ہندوستان میں رہنے کا فیصلہ کیا۔ پروفیسر اختر الواسع نے کہا کہ مولانا آزاد کا ہندوستان میں رہنے کا فیصلہ صحیح تھا اور جو لوگ پاکستان گئے انھوں نے حضور کی سیرت کے خلاف کام کیا۔ کانفرنس میں افتتاحی خطبہ ڈاکٹر محمد ذکریا پرنسپل کریم کالج نے پیش کیا۔ کانفرنس کی تفصیلات ڈاکٹر اندر سنگھ نے بتائی جب کہ مہمان خصوصی کی حیثیت سے ڈاکٹر پی کے پانی کولہان یونیورسٹی چائباسہ موجود تھے۔ ان کے علاوہ 40 سے زائد مقالہ نگار مختلف یونیورسٹیوں سے شریک ہوئے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا'، 28 مارچ 2012

قومی اردو کونسل کی تقسیم اسناد تقریب

گوپال گنج: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی سے منظور شدہ تعلیمی مرکز برائے ایک سالہ ڈپلوما کورس ان اردو لینگویج، ایک سالہ سرٹیفکیٹ کورس ان فنکشنل عربک کے لیے تقسیم اسناد کا ایک پروگرام منعقد کیا گیا۔ قومی اردو کونسل کا یہ سنٹر الہلال ویلفیئر سوسائٹی فار ایجوکیشن اینڈ سوشل سروسیز ضلع گوپال گنج بہار کے زیر نگرانی چلایا جا رہا ہے۔ سوسائٹی کے جنرل سکریٹری ظہیر احمد ندوی نے قومی اردو کونسل اور اس کی سرگرمیوں کا تعارف پیش کیا اور

مشرقی زبان وادب خصوصاً عربی اور اردو زبان کی ترقی اور فروغ میں قومی اردو کونسل نے جو کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں۔ ان پر بھرپور روشنی ڈالی اور کونسل کا شکریہ بھی ادا کیا جس کے تعاون سے ضلع گوپال گنج میں اردو اور عربی تعلیم کے لیے اسٹڈی سنٹر قائم ہے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' رانچی، 2012

رانچی یونیورسٹی میں منٹو صدی تقریبات

رانچی: 'منٹو کی کہانی کا اصل محور طوائف اور سیاست ہے۔ اس محور کو انصاف کی نظر سے دیکھنے کی ضرورت ہے۔ وہ ہمارے ایسے ادیب ہیں جنھوں نے اس محور کے اردگرد اپنے افسانوں کے تانے بانے بنے۔' ڈاکٹر منظر حسین نے ان خیالات کا اظہار شعبۂ اردو کے زیر اہتمام منٹو کی یاد میں منعقد ہونے والی پہلی ادبی تقریب کے موقعے پر کیا۔ ان سے پہلے شعبۂ ہندی کے ڈاکٹر متھلیش نے تقریب میں شامل مہمانوں کا استقبال کرتے ہوئے منٹو کی کہانیوں میں سماج کا درد اور تقسیم کے کرب کو دیکھنے کی جو صورتیں ملتی ہے، اس کے مختلف پہلوؤں پر اظہار خیال کیا۔ ڈاکٹر منج کمار نے اس موقعے پر کہا کہ ''منٹو ہندوستان میں رہے۔ بعد میں پاکستان چلے گئے لیکن ان کے بغیر نہ ہندوستانی ادب کی تاریخ لکھی جاسکتی ہے نہ پاکستان کی۔'' ہندی کے ایک اور ادیب رینندر نے منٹو کے افسانوں میں جابر نظام کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے کی قوت کی نشاندہی کی۔ شعبۂ اردو کے صدر ڈاکٹر جمشید قمر نے عصر حاضر میں منٹو کے افسانوں کی معنویت پر اظہار خیال کیا۔

پریس نوٹ، رانچی، 12 مئی 2012

مدھیہ پردیش :

کوثر چاندپوری کلچرل فورم کا جلسہ

بھوپال: ترقی پسند شعرا میں منفرد مقام و مرتبہ رکھنے والے محمد علی تاج مرحوم کی 34 ویں برسی پر اقبال لائبریری میں منعقد تقریب خراج عقیدت میں یاد رفتگاں کی پہلی کے موقعے پر مقررین نے مرحوم محمد علی تاج کو مضبوط ارادوں کا روشن خیال انقلابی شاعر قرار دیتے ہوئے کہا کہ تاج جیسے بہت سے ایسے شعرا ہیں جنھیں ادب میں وہ مقام نہیں ملا جس کے وہ مستحق ہیں۔ مہمان اعزازی ممتاز نقاد پروفیسر شفیق اللہ (نئی دہلی) نے محمد علی تاج کو عہد ساز شاعروں کی صف میں شمار کرتے ہوئے کہا کہ جو ہر ذات کا عکس تاج کی شاعری میں ملتا ہے وہ مختلف طرز اسلوب کے شاعر ہیں۔ ای ٹی وی اردو کے رپورٹر نیز شاعر و ادیب ڈاکٹر مہتاب عالم نے محمد علی تاج کو مستقبل کے شعرا کے لیے رہنما قرار دیا۔ ہندی اور اردو ادیب احمد پرکاش نے کہا کہ بھوپال میں تاج نہیں ہوتے تو ہندوستان میں دشینت کمار تیاگی کو ہندی غزل کا بادشاہ تسلیم نہیں کیا جاتا۔ دشینت کی غزلوں میں جو تیور اور انداز پایا جاتا ہے وہ محمد علی تاج کی ہی دین ہے۔

روزنامہ 'ندیم' بھوپال، 23 اپریل 2012

پنجاب:

مالیر کوٹلہ: اردو پنجابی کے نامور شاعر نازبھارتی کی طرف سے پنجاب اردو اکادمی کے لیے اپنی لائبریری میں سے دیے گئے تحفے کو اکادمی کے سکریٹری ڈاکٹر اقبال نے معززین شہر اور اردو قلمکاروں کی موجودگی میں وصول کیا۔ خیر مقدمی کلمات ادا کرتے ہوئے محمد اقبال نے ناز بھارتی کی اردو زبان کے ساتھ بے پناہ محبت کے لیے انھیں خراج تحسین پیش کیا اور اعلان کیا کہ اکادمی میں معیاری اردو لائبریری کا قیام ان کی اولین ترجیح ہے۔ اکادمی کی نائب صدر محترمہ فرزانہ عالم اور پنجاب وقف بورڈ کے چیئرمین محمد اظہار عالم کی اکادمی کے استحکام اور ترقی کے لیے کی گئی کوششوں کی بھی مقررین نے بھرپور تعریف کی۔

روزنامہ 'اخبار مشرق' دہلی، 22 اپریل 2012

راجستھان :

'ہند میں فارسی عربی ادب' پر سیمینار

راجستھان: 27، 28 اور 29 مارچ کو مولانا ابوالکلام آزاد عربی فارسی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں سہ روزہ سیمینار 'ہندوستان میں عربی فارسی شعر و ادب' (19 ویں صدی میں) کے موضوع پر منعقد کیا گیا جس میں مہمان خوصی پروفیسر آزرمیدخت ڈائریکٹر انسٹی ٹیوٹ آف پرشین ریسرچ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ تھیں جب کہ مہمان اعزازی ڈاکٹر ابوالفیض عثمانی اور صدارت صاحبزادہ شوکت علی خان فائونڈر ڈائرکٹر، اے پی آر آئی نوئیڈا تھے۔ تقریب افتتاحیہ میں مہمان خوصی آزرمیدخت نے کہا کہ یہ سمجھنا غلط ہوگا کہ 19 ویں صدی میں ہندوستان سے فارسی بالکل ختم ہوچکی ہے۔ اس سے پہلے فارسی ہندوستان میں سرکاری زبان، علمی اور ادبی زبان تھی اور تقریباً سات، آٹھ سو سال تک اس کو یہ مقام ہندوستان میں حاصل رہا تھا۔ تقریب افتتاحیہ کے بعد سیمینار کے پہلے اجلاس میں ڈاکٹر زیبا زینت نے 'نوٹک سے ڈاکٹر عمر جہاں اور علی گڑھ سے ڈاکٹر محمد قمر عالم نے اپنا مقالہ پیش کیا۔ اس اجلاس کی صدارت پروفیسر زبیر قریشی، پروفیسر عابد حسین صدر شعبہ فارسی پٹنہ یونیورسٹی اور ڈاکٹر جمیدہ خاتون نے کی۔ ایک نمائش 'اسلامی آثار و تبرکات' کا بھی افتتاح کیا گیا۔

روزنامہ 'صحافت' 2 اپریل 2012

کرناٹک :

بنگلور یونیورسٹی میں قومی سیمینار

بنگلور: بنگلور یونیورسٹی کے شعبۂ اردو اور کرناٹک اردو اکادمی کے باہمی اشتراک سے مورخہ 12، 13 مارچ 2012 کو دو روزہ قومی سیمینار بعنوان 'اردو ادب کا منظر نامہ 1985 کے بعد' (گلشن اور شاعری کے حوالے سے) منعقد ہوا۔ سیمینار کا افتتاح کرتے ہوئے ریاستی گورنر جناب ایچ آر بھاردواج نے کہا کہ اردو زبان خالص ہندوستانی زبان ہے اس کی ترقی و ترویج میں تمام ہندوستانیوں نے بلا لحاظ مذہب و ملت حصہ لیا ہے اس لیے اردو زبان کو خالص مسلمانوں سے جوڑنا مناسب نہیں ہے۔ اپنے خطاب میں ریاستی گورنر نے اردو کے اہم شعرا غالب، اقبال کا حوالہ دیتے ہوئے ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب، قومی یکجہتی تحریک آزادی اور حب الوطنی کے فروغ میں اردو زبان وادب کے رول کا جامع تبصرہ پیش کیا۔ یونیورسٹی کے وائس چانسلر جناب این پربھودیو نے صدارتی خطبہ پیش کیا اور شعبۂ اردو کے چیئرمین اور کنوینر محترمہ ڈاکٹر یاسمین محمدی بیگم کو سیمینار کے انعقاد پر مبارکباد دیتے ہوئے شعبہ اردو کی ترقی اور توسیع کے لیے ہر ممکن تعاون کرنے کا یقین دلایا۔ پروفیسر عتیق اللہ نے کلیدی خطبہ میں 1985 کے بعد اردو ادب کے تیزی سے بدلتے منظر نامہ کا جائزہ لیا۔ ڈاکٹر یاسمین محمدی بیگم صدر شعبۂ اردو نے استقبالیہ پیش کیا اور محترمہ اقبال النسا بیگم نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔

پریس ریلیز، بنگلور، 12، 13 مارچ 2012

مہاراشٹر :

کرشمہ کپور اردو سیکھ رہی ہیں!

ممبئی: بالی ووڈ میں پھر پور واپسی کے لیے کرشمہ کپور نے اردو زبان میں مہارت حاصل کرنا شروع کردی ہے۔ بالی ووڈ میں اپنی واپسی کو بہترین بنانے اور کسی بھی غلطی کا امکان نہ چھوڑنے کے لیے کرشمہ کپور ہر شعبے میں بھرپور محنت کررہی ہیں، کرشمہ کپور 5 سال کے وقفے کے بعد فلم 'ڈینجرس عشق



سے ہالی ووڈ میں واپس کررہی ہیں اور وہ چاہتی ہیں کہ ان کی ہالی ووڈ میں واپسی کسی بھی قسم کے عیب سے پاک ہو، اس سلسلے میں وہ جو کچھ کررہی ہیں ان میں اردو زبان سیکھنے کا عمل اہمیت کا حامل ہے۔ کرشمہ اردو زبان سیکھنے اور اس کی صحیح ادائیگی کے لیے روزانہ کئی کئی گھنٹے اردو محاورے دہرا رہی ہیں۔ کرشمہ کپور کے دادا راج کپور اداکاری کے ساتھ ساتھ اردو پر دسترس اور بہترین اردو تلفظ کی شہرت بھی رکھتے تھے۔

روزنامہ جدید میل، دہلی، 4 مئی 2012

اعزاز و اکرام:

شموئل احمد

نئی دھلی: اس سال سولہواں 'مجلس فروغ اردو ادب ایوارڈ، دوحہ قطر' کے لیے اردو کے ممتاز افسانہ نگار شموئل احمد کا انتخاب کیا گیا ہے۔ شموئل احمد کا شمار



ہندوستان کے ممتاز افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ 'سنگھاردان' جیسی شاہکار کہانی کے خالق شموئل احمد اپنے منفرد اسلوب اور بے باک لہجے کے لیے جانے جاتے ہیں۔ 'عقبوت'، 'سنگھاردان'، 'القمبوس کی گردن' وغیرہ ان کے افسانوی مجموعے ہیں جبکہ 'ندی' اور 'مہاماری' ان کے دو اہم ناول شائع ہوکر داد و تحسین حاصل کرچکے ہیں۔ مجلس فروغ اردو ادب دوحہ قطر کا 2012 کا ایوارڈ فکشن میں ان کی مجموعی تخلیقی خدمات کے لیے دیا جارہا ہے۔ مجلس فروغ اردو ادب دوحہ قطر کے سولہویں ایوارڈ کے لیے پینل آف ججز کا اجلاس جیوری کے چیئرمین اردو کے ممتاز نقاد اور دانشور پدم بھوشن پروفیسر گوپی چند نارنگ کی صدارت میں انڈیا انٹرنیشنل سنٹر میں منعقد ہوا۔ اراکین جیوری میں پروفیسر ڈاکٹر محمد ذاکر، جناب چندر بھان خیال اور ڈاکٹر پرویز شہریار شامل تھے۔ اس سال ایوارڈ کی تقریب دوحہ قطر میں 8 نومبر کو منعقد ہوگی۔ یہ ایوارڈ ڈیڑھ لاکھ روپے نقد، طلائی تمغہ اور سپاس نامہ پر مشتمل ہے۔

پریس ریلیز، نئی دہلی، 4 مئی 2012

پروفیسر منظر عباس کو اعزازیہ

علی گڈھ: علی گڈھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کی انجمن اردوئے معلّٰی کی جانب سے ممتاز محقق و نقاد پروفیسر منظر عباس نقوی کے اعزاز میں ایک استقبالیہ جلسے کا انعقاد کیا گیا جس میں انھوں نے اقبال کی شاعری پر فکر انگیز مقالہ پیش کیا۔ آرٹس فیکلٹی لاؤنج میں پروفیسر محمد زاہد نے پروفیسر منظر عباس نقوی کا مختصر تعارف پیش کرتے ہوئے کہا کہ وہ شعبۂ اردو میں ممتاز و مقبول اساتذہ میں سے تھے۔ پروفیسر ابوالکلام قاسمی نے کہا کہ وحید الدین سلیم پر لکھی ہوئی منظر عباس نقوی کی کتاب بنیادی نوعیت کی ہے۔ اسلوبیات پر آپ کی کتاب 'نثر، نظم اور شعر لائق ستائش ہے۔ پروفیسر قاضی افضال حسین نے کہا کہ منظر عباس نقوی کا تنقیدی موقف خاصا صاف ستھرا اور نہایت دیانت دارانہ ہے۔ مہمانِ خصوصی پروفیسر منظر عباس نقوی نے گڑھ کو علم و ادب کے فروغ کے لیے نہ صرف ملک کا بلکہ برصغیر کا مدینۃ العلم قرار دیا۔ نظامت کے فرائض انجمن اردوئے معلّٰی کے سکریٹری عقیل احمد نے انجام دیے۔ انجمن کے انچارج ڈاکٹر مہتاب حیدر نقوی نے اظہار تشکر کیا۔

روزنامہ ہمارا سماج، دہلی، 26 اپریل 2012

اردو اکادمی، دہلی کے سالانہ ایوارڈز کا اعلان

نئی دھلی: اردو اکادمی، دہلی کی ایوارڈ و اکزیکیٹیو کمیٹی کے فیصلے سے اتفاق کرتے ہوئے محترمہ شیلا دکشت نے اکادمی کے سال 2011 کے سالانہ ایوارڈز کی توثیق کردی ہے، جس کے مطابق آخری مغل تاجدار بہادر شاہ ظفر کے ڈیڑھ سو سالہ یوم وفات کے خصوصی موقع پر صرف اس سال کے لیے بہادر شاہ ظفر ایوارڈ کی تعداد تین کردی گئی۔ 'کل ہند بہادر شاہ ظفر ایوارڈ' فکشن، ادیب و دانشور جناب وارث علوی، بزرگ شاعر جناب محمد علوی اور جناب مظہر الحق علوی کو علاحدہ علاحدہ دینے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ 'پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی ایوارڈ' جواہر لعل نہرو یونیورسٹی کے سابق استاد ڈاکٹر اسلم پرویز کو دینے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ یہ چاروں ایوارڈ ڈیڑھ لاکھ روپے نقد، سند، شال اور تمغہ پر مشتمل ہیں۔ تخلیقی نثر کا ایوارڈ محترمہ انور زبیدہ کو، شاعری کا ایوارڈ معروف شاعر جناب قمر صبیلی کو، تحقیق و تنقید کا ایوارڈ ڈاکٹر مولا بخش کو، اردو ترجمہ کا ایوارڈ جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے شعبۂ فارسی کے استاد، ڈاکٹر اخلاق احمد آہن اور اردو صحافت کا ایوارڈ جناب مودود صدیقی کو دینے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ فنونِ لطیفہ کے سلسلے میں ماہر موسیقی استاد چاند خاں کی وراثت کے امین استاد اقبال احمد خاں کو دینے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ یہ تمام ایوارڈز پچاس ہزار روپے نقد، شال، سند اور تمغہ پر مشتمل ہیں۔ یہ ایوارڈ عنقریب ایک پُروقار تقریب میں پیش کیے جائیں گے۔

پریس ریلیز، اردو اکادمی، 30 اپریل 2012

سال 2011 کی کتابوں پر انعامات

نئی دھلی: اردو اکادمی دہلی کی ایوارڈ و اکزیکیٹیو کمیٹی کی میٹنگ میں 28 کتب میں سے سال 2011 میں شائع شدہ آٹھ کتابوں کو پہلے انعام اور آٹھ کتابوں کو دوسرے انعام کا مستحق قرار دیا گیا۔ واضح ہو کہ پہلا انعام سات ہزار ایک سو روپے کا اور دوسرا انعام پانچ ہزار ایک سو روپیہ کا دیا جاتا ہے۔ پہلے انعام کی مستحق کتابوں میں ہندوستانی فارسی ادب (پروفیسر شریف حسین قاسمی)، ہماری تہذیبی تاریخ (سید محمد عزیز الدین حسین)، کہیں کچھ کھو گیا ہے (انجم عثمانی)، اردو افسانہ (پروفیسر ابن کنول)، غزل نامہ (ڈاکٹر تابش مہدی)، ہمارے گاؤں ہمارے لوگ (ڈاکٹر رضوان اللہ)، آٹھ راتیں سات کہانیاں، ڈاکٹر نعیمہ جعفری پاشا)، آزادی کے بعد اردو شاعری میں تانیثی حسیت (ڈاکٹر وسیم بیگم) دوسرے انعام کی مستحق کتابوں میں شامل ہیں: تنقید و تفہیم (پروفیسر قاضی

عبیدالرحمٰن ہاشمی)، نظیر اکبرآبادی حیات وشاعری اور نثری خدمات (پروفیسر عبدالحی فاروقی)، کچھ درد کے صحرا سے (نفیس بانو شمع)، روحِ غزل (عبدالعزیز یاس)، رائیگاں بلندی (ناظمہ جبیں)، تعلیم وتدریس کے روشن پہلو (ڈاکٹر ریاض احمد)، چاند میرا ہے (غزالہ قمر اعجاز)، تذکرۂ صابریہ (محمد انور علی سہیل فریدی) منشی نول کشور انعام برائے ناشر 2011 'البلاغ پبلی کیشنز' کو دیا جائے گا۔

پریس ریلیز، اردو اکادمی، یکم مئی 2012

زہرہ نگاہ کو استقبالیہ

دھلی: پاکستان سے تشریف لائی معروف شاعرہ زہرہ نگاہ کے اعزاز میں ذاکر حسین دہلی کالج کے سیمینار ہال میں ایک استقبالیہ کا انعقاد کیا گیا۔ کالج پرنسپل ڈاکٹر اسلم پرویز نے پھول پیش کرکے کالج کی جانب سے زہرہ نگاہ کا استقبال کیا۔ اس موقعے پر کالج کے شعبہ انگریزی کی سپریتا پال نے ان کی شخصیت اور خدمات کے حوالے سے گفتگو کی۔ ڈاکٹر خالد علوی نے زہرہ نگاہ کا تعارف پیش کیا۔ طلبا نے زہرہ نگاہ سے دل چسپ سوال کئے۔ پرنسپل اسلم پرویز نے ان کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 31 مارچ 2012

حیدر قریشی کے اعزاز میں جلسہ



نئی دھلی: غالب انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی کی صدارت میں جرمنی کے معروف ادیب حیدر قریشی کے اعزاز میں ایوانِ غالب میں ایک جلسے کا اہتمام کیا گیا۔ اس موقعے پر شاہد ماہلی، اے رحمان، ڈاکٹر خالد علوی، کیول دھیر، پروفیسر صادق، ڈاکٹر خلیق انجم، اور ڈاکٹر رضا حیدر نے حیدر قریشی کی علمی و ادبی خدمات پر گفتگو کی۔ حیدر قریشی نے یوروپ میں اردو زبان وادب کی صورتِ حال پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ اردو یوروپی ملکوں میں تیزی کے ساتھ ترقی کررہی ہے اور ہماری کوشش ہے کہ ہم رسالوں اور اخبارات کے ذریعے اردو زبان وادب کو مزید فروغ دیں۔

روزنامہ 'صحافت' 27 مارچ 2012



'لولاک' کے ہندی ایڈیشن کے اجرا کی تقریب میں دائیں سے، ساہتیہ اکادمی کے سکریٹری اے کرشنا مورتی، سابق ایم پی عبیداللہ خاں اعظمی، روزنامہ سہارا کے گروپ ایڈیٹر عزیز برنی، پروفیسر اختر الواسع، اجے مشرا، محمد موسیٰ انصاری، مشتاق صدف، جانکی پرساد شرما اور مصنف چندر بھان خیال

بلیغ ہاپوڑی 'امین سخن'

علی گڑھ: مسلم یونیورسٹی کے کنیڈی ہال میں اردو کے فروغ کے لیے آذر اکادمی علی گڑھ کے زیر اہتمام ایک سیمینار اور کل ہند مشاعرے کا انعقاد کیا گیا جس میں استاد شاعر بلیغ ہاپوڑی کو 'امین سخن' کے خطاب سے سرفراز کیا گیا۔ بلیغ ہاپوڑی کو ردائے ادب اور سپاس نامہ آذر اکادمی علی گڑھ کے جنرل سکریٹری مشرف حسین محضر نے پیش کیا۔ راشد باقی حیا نے بلیغ الرحمٰن عرف بلیغ ہاپوڑی کا تعارف کرایا۔ شاعر جاوید عرشی اندوری نے کہا کہ بلیغ ہاپوڑی کا لہجہ بڑا ہی پختہ ہے، ایسا لہجہ سالہا سال کی ریاضت کے بعد حاصل ہوتا ہے، آذر اکادمی کے جنرل سکریٹری مشرف حسین محضر نے کہا کہ بلیغ ہاپوڑی کو یہ ایوارڈ دیتے ہوئے اکادمی فخر محسوس کررہی ہے۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 12 اپریل 2012

رسم اجرا:

'لولاک' کا ہندی اڈیشن

نئی دھلی: ساہتیہ اکادمی میں منعقدہ ایک پروقار تقریب میں اکادمی کے نائب صدر وشوناتھ پرساد تیواری اور سابق ممبر پارلیمنٹ مولانا عبیداللہ خاں اعظمی نے ملک کے معروف شاعر اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے سابق وائس چیئرمین چندر بھان خیال کی منظوم سیرت 'لولاک' کے ہندی ایڈیشن کی رسم اجرا انجام دی۔ اس موقع پر اپنے صدارتی خطاب میں وشوناتھ پرساد تیواری نے کہا کہ انھوں نے لولاک کا پورا مطالعہ کیا ہے اور یہ بات بے جھجک کہہ سکتے ہیں کہ اس کتاب سے اسلام اور جہاد کا صحیح مفہوم معلوم ہوا ہے۔ واضح رہے کہ اس کا ہندی ترجمہ ساہتیہ اکادمی کے اہم کارکن محمد موسیٰ رضا انصاری نے کیا اور اس کے ہندی ایڈیشن کی اشاعت سوراج پرکاشن نے کی ہے۔ ساہتیہ اکادمی کے سکریٹری اے کرشنا مورتی نے چندر بھان خیال کو مبارکباد دیتے ہوئے کہا کہ اس کتاب کے موضوع نے انھیں بہت متاثر کیا ہے۔ ڈاکٹر مولا بخش نے کہا کہ ہندوستان میں قومی یک جہتی کی ایک شاندار روایت رہی ہے اور چندر بھان خیال اس روایت کے امین کے طور پر سامنے آئے ہیں۔ ساہتیہ اکیڈمی میں پروگرام آفیسر ڈاکٹر مشتاق صدف نے متعدد احادیث کے حوالے سے اللہ کے رسول کی سیرت کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔ ہندی کے شاعر اور ادیب جانکی پرشاد شرما نے ہندوستانی تہذیب وثقافت پر بات کرتے ہوئے کہا چندر بھان خیال کی یہ کتاب اسی ہندوستانی ثقافت کی ایک اعلیٰ مثال ہے۔ انھوں نے کہا کہ انھیں اس کتاب کے مطالعہ سے دو کتابوں کی بے ساختہ یاد آگئی۔ ایک مولانا حالی کی مسدس حالی اور دوسری جے شنکر پرساد کی کامائنی کی۔ تقریب میں اردو اور ہندی ادب وصحافت کے چنندہ لوگوں نے شرکت کی۔ جن میں عزیز برنی، نصرت ظہیر، انجم عثمانی، سہیل انجم، معصوم مرادآبادی، ڈاکٹر سید احمد خاں، عظیم اختر، پرویز شہریار اور اشفاق عارفی قابل ذکر ہیں۔ صاحب کتاب چندر بھان خیال نے کتاب کے کچھ بند پڑھ کر سنائے۔

پریس ریلیز، نئی دہلی، 14 مئی 2012

اعراف

کلکتہ: مسلم انسٹی ٹیوٹ کی لٹریری سب کمیٹی کی جانب سے خوش فکر شاعر مضطر افتخاری کے شعری مجموعے 'اعراف' کی رسم اجرا انسٹی ٹیوٹ کے لائبریری ہال میں مشہور شاعر قیصر شمیم کے ہاتھوں انجام پائی۔ صدارت ڈاکٹر معصوم

شرقی نے کی اور نظامت کے فرائض انجم عظیم آبادی نے انجام دیے۔ مقررین نے مضطر کے فکر وفن پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ پروفیسر سلیمان خورشید نے کہا کہ مضطر کے اشعار میں انسانیت کے لیے تڑپ ہے۔ انجم عظیم آبادی نے کہا مضطر کی شاعری عصری تقاضے کو پورا کرتی ہے۔ کلیم حاذق، قیصر شمیم اور صدر جلسہ ڈاکٹر معصوم شرقی نے اپنے اپنے خیالات ظاہر کیے۔

پریس ریلیز، کلکتہ، اپریل 2012

چند شخصیتیں

دیوبند: دیوبند ایک تاریخ ساز سرزمین ہے اور ہر زمانے میں یہاں کے فنکاروں اور ادیبوں نے عہد قدیم کی علمی روایات کو زندہ رکھا ہے۔ ان خیالات کا اظہار آل انڈیا اقتصادی کونسل کے چیئرمین مولانا حبیب صدیقی نے محمود ہال میں منعقدہ عبداللہ عثمانی کی کتاب 'چند شخصیتیں' کے رسم اجرا کے موقعے پر کیا۔ پروفیسر حکیم حامد تحسین، ڈاکٹر عبدالقبال عاصم، مولانا ندیم الواجدی، مولانا تسیم اختر شاہ نے بھی اظہار خیال کیا۔ عبداللہ عثمانی نے مہمان اردو سے اپیل کی کہ وہ اپنی پیشیدہ صلاحیتوں کو بروئے کار لائیں اور تحریر وقلم سے اپنا رشتہ جوڑیں۔ پروگرام کے کنوینر فہیم عثمانی نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ راشٹریہ سہارا، 28 مارچ 2012

اپنی مٹی کی مہک

کانپور: مولانا آزاد ایجوکیشن سینٹر بیگم پروہ کے زیر اہتمام معروف افسانہ نگار اشفاق برادر کے افسانوی مجموعے 'اپنی مٹی کی مہک' کی رسم اجرا جناب شری پرکاش جائسوال (وزیر کوئلہ حکومت ہند) کے بدست انجام پائی۔ پروفیسر خان فاروق نے اشفاق برادر کے افسانوں کی عصری معنویت پر ایک سیر حاصل تقریر کی۔ افسانہ نگار اور شاعر قائد حسین کوثر، نقاد عشرت ظفر، اردو کے استاد جناب اظہر صدیقی اور صدر جلسہ ظفر اقبال ظفر نے اشفاق برادر کے افسانوں پر اظہار خیال کیا۔ جلسے کے اختتام پر تمام حاضرین جلسہ کا ڈاکٹر اقبال احمد انصاری نے شکریہ ادا کیا۔

پریس ریلیز، کانپور، 15 اپریل 2012

گنبد کے کبوتر

نئی دھلی: غالب اکادمی بستی حضرت نظام الدین میں اردو پریس کلب (انٹرنیشنل) کے زیر اہتمام اردو کے معروف افسانہ نگار شوکت حیات کے افسانوی مجموعہ 'گنبد کے کبوتر' کی رسم اجرا عمل میں آئی۔ اس موقعے پر ڈاکٹر محمد کاظم، ڈاکٹر خالد اشرف، ڈاکٹر انور پاشا، پروفیسر اختر الواسع نے، انجم عثمانی، سابق مرکزی وزیر اسلم شیر خان، ڈاکٹر نگار عظیم، الیاس شوقی، پروفیسر ابن کنول اور صدر جلسہ رتن سنگھ نے شوکت حیات اور ان کے فن پر روشنی ڈالی۔

روزنامہ انقلاب، دہلی، 20 مارچ 2012

تھوڑا سا میں

نئی دھلی: کوئی بھی فن کار بغیر 'میں' کے ایک اچھا اور سچا تخلیق کار نہیں بن سکتا اسی لیے 'تھوڑا سا میں' ہی انسان کو بڑا بناتا ہے۔ ان خیالات کا اظہار پروفیسر اختر الواسع نے غالب اکادمی میں لدھیانہ کے ڈی آئی جی فیاض فاروقی کے شعری مجموعے 'تھوڑا سا میں' کی تقریب اجرا میں کیا۔ فیاض فاروقی نے کہا کہ آج کے دور میں اردو پر کام کرنا بہت مشکل ہوتا جارہا ہے اور وہ بھی کتاب شائع کرنا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اردو کی کتابوں کے خریدار نہیں رہے۔ عالمی اردو ٹرسٹ کے چیئرمین عبدالرحمٰن نے کہا کہ فیاض فاروقی ایک آئی پی ایس افسر ہونے کے ساتھ ساتھ اردو کی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ فیاض فاروقی کے شعری مجموعہ 'تھوڑا سا ... میں' کی رسم اجرا قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر خواجہ اکرام الدین کے ہاتھوں عمل میں آئی۔ دہلی اردو اکادمی کے سکریٹری انیس اعظمی نے کہا کہ پولیس میں رہ کر ادبی کام کرنا ایک مشکل امر ہے۔ پروفیسر توقیر خاں، اسد رضا، شکیل شمسی، خواجہ اکرام الدین، نے بھی اظہار خیال کیا۔ نظامت ڈاکٹر شفیع ایوب نے انجام دی۔

روزنامہ انقلاب، دہلی، 19 اپریل 2012

تجلیات کلیم

امروہہ: مولانا محمد عبادت ایجوکیشنل سوسائٹی کے زیر اہتمام ڈاکٹر احسن اختر سروش کی مرتب کردہ 'تجلیات کلیم' مجموعہ نعت ومنقبت مولانا محمد عبادت کلیم طالب نژاد کا اجرا سلونی ایجوکیشنل سینٹر اشرف الساجد میں پروفیسر وسیم بریلوی وائس چیئرمین قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے دست مبارک عمل میں آیا اور اسی موقعے پر سلیم لائبریری کا افتتاح بھی پروفیسر عزیز الدین ہمدانی ڈائرکٹر رضا لائبریری رامپور نے کیا۔ مہمانان میں پروفیسر مظفر عباس سابق صدر شعبۂ اردو ایم یو علی گڑھ، پروفیسر ناشر نقوی صدر شعبۂ اردو پنجاب یونیورسٹی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ سوسائٹی کے صدر مولانا سید محمد سیادت نقوی نے بھی مہمانان وحاضرین کا شکریہ ادا کیا۔ نظامت پروفیسر حسنین اختر شہباز نے کی۔

روزنامہ صحافت، دہلی، 23 اپریل 2012

چوتھا فنکار

نئی دھلی: ادب میں علاقائیت یا مقامیت عیب نہیں ہے۔ بالخصوص افسانے کا اختصاص یہی ہے۔ شبیر احمد کے افسانوں میں بنگال کی تہذیب اور کلچر موجود ہے تو یہاں کی نمایاں خوبی نہیں بلکہ افسانے کی ازلی فطرت کا اظہار ہے۔ یہ باتیں زبیر رضوی نے کاوش لٹریری فورم کے زیر اہتمام شبیر احمد کے افسانوی مجموعہ 'چوتھا فن کار' کے اجرا کے موقع پر جواہر لعل نہرو یونیورسٹی میں کہیں۔ افسانہ نگار معین الدین جینا بڑے نے کہا کہ فن کار کو خود اعتمادی کا مظاہرہ کرنا ہوگا۔ کہانیاں وکالت سے زندہ نہیں رہ سکتیں۔ نوجوان نقاد ابوبکر عباد، ڈاکٹر محمد کاظم، فراغ روہوی راغب اختر، جاوید زمان، راغب شمیم فیاض احمد وجیہ اور معید رشیدی نے شبیر احمد کے فن پر اظہار خیال کیا۔

روزنامہ راشٹریہ سہارا، دہلی، 23 اپریل 2012

'جعفرانیہ ابن آدم'

میرٹھ: طالب زیدی کے انشائیوں کا مجموعہ 'جعفرانیہ ابن آدم' ہمیں ان کی تخلیقی بصیرت اور اظہاری ایک نئی سطح سے متعارف کراتا ہے۔ یہ ایک طرح کی سراپا نگاری ہے۔ طالب نے 14 عنوانات کے تحت سر سے پاؤں تک اولاد آدم کا ایک رنگا رنگ مرقع ترتیب دیا ہے۔ ان خیالات کا اظہار معروف ناقد پروفیسر شمیم حنفی نے چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ کے پریم چند سمینار ہال میں منعقدہ رسم اجرا کی تقریب کے صدارتی خطبے میں کیا۔ شیخ الجامعہ وکرم چندر گوئل، اٹل کمار سنگھ (فائنانس آفیسر)، ڈاکٹر کمال احمد صدیقی، معروف شاعر اسلم بدر، ڈاکٹر معراج الدین احمد (سابق آبپاشی وزیر، حکومت یوپی) اور منظور عثمانی مہمانان خصوصی تھے۔ ڈاکٹر خالد حسین خاں (صدر شعبۂ اردو، میرٹھ کالج، میرٹھ)، ڈاکٹر حسین ماجد اور معروف افسانہ نگار مسعود اختر نے 'جعفرانیہ ابن آدم' کا تجزیاتی مطالعہ پیش کیا۔ نظامت صدر شعبۂ اردو ڈاکٹر اسلم جمشید پوری نے انجام دی۔

روزنامہ راشٹریہ سہارا، دہلی، 21 مارچ 2012

'پالمیکی رامائن'

نئی دھلی: جناب حامد انصاری نائب صدر جمہوریہ ہند نے رام پور رضا لائبریری کے زیر اہتمام نہرو میموریل میوزیم کے لائبریری آڈیٹوریم، تین مورتی ہاؤس نئی دہلی



نائب صدر جمہوریہ عزت مآب حامد انصاری، رام پور رضا لائبریری کی شائع کردہ 'والمیکی رامائن' کی رسم اجرا ادا کرتے ہوئے

میں سمیر چندر کی والمیکی رامائن کے رسم اجرا کے موقعے پر کہا کہ رام پور رضا لائبریری کے زیر اہتمام علمی و تحقیقی کام ضرور ہونا چاہیے۔ انھوں نے کہا کہ یہ ہندوستان کی عظیم ترین لائبریریوں میں سے ایک ہے جہاں بیش قیمت مخطوطات کے علاوہ نادر و نایاب کتابوں کا ذخیرہ ہے۔ گورنر اتر پردیش بی ایل جوشی نے اس موقعے پر خطاب کرتے ہوئے کہا کہ رام پور رضا لائبریری ہمارا تہذیبی و ثقافتی ورثہ ہے۔ اپنی تہذیب و ثقافت سے ہمیں عشق کرنا چاہیے۔ رام پور رضا لائبریری کے زیر اہتمام شائع ہونے والی یہ کتاب ایک بیش قیمت اور نادر کتاب ہے۔ اس سے ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کا پیغام عام ہوگا۔ پروفیسر عزیز الدین حسین، ڈائرکٹر، رام پور رضا لائبریری نے بھی مہمانان کا استقبال کیا اور رام پور رضا لائبریری کی تاریخی اہمیت پر روشنی ڈالی۔

روزنامہ 'خبر جدید' دہلی، 10 مئی 2012

'اورما'

نئی دھلی: راجیہ سبھا کے سابق ڈپٹی چیئرمین کے رحمٰن خان نے انڈیا اسلامک کلچرل سینٹر میں اردو پریس کلب انٹرنیشنل کے زیر اہتمام تقریب میں دیبی کی مصنفہ دیبا سلیم عرفان کے ناول 'اورما' کی رسم اجرا ادا کی۔ دہلی اردو اکادمی کے وائس چیئرمین پروفیسر اختر الواسع نے کہا کہ ناول 'اورما' اس دور کی یاد دلاتا ہے جب ایران میں پہلوی دور سے جمہوریت کی طرف پیش رفت ہو رہی تھی۔ دیبا سلیم عرفان کو مبارک باد پیش کرتے ہوئے اردو پریس کلب کے وائس چیئرمین اور کانگریس کے لیڈر ڈاکٹر معراج الدین نے کہا کہ دیبا سلیم نے جس ایرانی خاتون کے کردار کی عکاسی کی ہے وہ قابل ستائش ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 19 اپریل 2012

دہلی اردو اکادمی کی چودہ کتابیں

نئی دھلی: دہلی سکریٹریٹ میں وزیر اعلیٰ شیلا دیکشت نے اردو اکادمی دہلی کی شائع کردہ 14 کتابوں کا اجرا کیا ان میں 1919 کی مولوی بشیر الدین احمد کی شاہجہاں آباد کی تاریخ پر مبنی تصنیف 'واقعات دار الحکومت' کا نیا طبع کردہ ایڈیشن اہم تھا۔ ڈاکٹر دھریندر ناتھ کی تصنیف اور انیس مرزا کی ترجمہ کردہ کتاب 'دہلی اور آزادی' ڈاکٹر علی جاوید کی 'داستانی ادب'، پروفیسر عبدالحق کی 'محمد حسن فگار و اسلوب'، سعید الظفر چغتائی کی 'خون کے دھبے'، ریحان عباسی کی 'ہمارے پیشل پارک'، انور علی دہلوی کی 'اردو صحافت'، سراج انور کی 'غالب شناسی'، سرسید احمد خاں کی 'آثار الصنادید'، قیصر



زاہدی کی 'مقلد بادشاہ'، ڈاکٹر قاسم دہلوی کی مونوگراف 'واصف دہلوی'، ڈاکٹر دیوان حنان کی مونوگراف 'پنڈت دتاتریہ کیفی'، حکیم عطاء الرحمٰن کی 'دہلی اور طب یونانی'، وکیل نجیب کی 'مہربان جن' نامی کتب کا اجرا عمل میں آیا۔ اس موقعے پر وزیر اعلیٰ شیلا دیکشت نے اردو اکادمی کی سرگرمیوں پر اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے دہلی کی تاریخ و تہذیب پر مبنی کتاب 'واقعات دار الحکومت دہلی' کی تعریف کی اور اس کا ہندی اور انگریزی میں ترجمہ کرانے کی ہدایت دی۔ شیلا دیکشت نے اہم اور تاریخ گیت کا اردو سے انگریزی اور ہندی میں ترجمہ کرانے کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے کہا کہ اس کے لیے دہلی سرکار ہر ممکن تعاون کرے گی۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 24 اپریل 2012

وفیات:

پروفیسر عبدالحق ازہری

نئی دھلی: جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے مرکز برائے مطالعات زبان عربی ادب کے ریٹائرڈ پروفیسر اور ماہر لسانیات اور عربی ادب میں صدر جمہوریہ ایوارڈ یافتہ ڈاکٹر عبدالحق ازہری جو کینسر کے عارضہ میں تقریباً ایک برس سے مبتلا تھے 7 مئی کی صبح بوقت فجر انتقال کر گئے۔ پسماندگان میں ان کی اہلیہ دو بیٹے اور ایک بیٹی شامل ہیں۔ پروفیسر ازہری نے جامعہ ازہر قاہرہ سے لسانیات، عربک اور اسلامک اسٹڈیز میں ڈگریاں حاصل کی تھیں۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 8 مئی 2012

ایم سلیم



نئی دھلی: مولانا محمد علی جوہر اکادمی کے جنرل سکریٹری اور معروف صحافی ایم سلیم کا 23 اپریل کی شام دل کا دورہ پڑنے سے انتقال ہو گیا۔ وہ 62 سال کے تھے۔ ان کے پسماندگان میں اہلیہ اور چار بیٹے شامل ہیں۔ مرحوم کی تدفین آج بعد نماز عصر قبرستان جھارکھنڈی شاہدرہ میں عمل میں آئی جس میں بہت بڑی تعداد میں سماجی، ادبی اور سیاسی شخصیات نے شرکت کی۔ ایم سلیم ایک معروف صحافی تھے جنھوں نے عرصہ دراز تک ممبئی سے شائع ہونے والے ہفت روزہ بلٹز کے لیے کرائم رپورٹنگ کی۔ اس کے علاوہ انھوں نے روزنامہ 'قومی آواز'، روزنامہ 'فیصل جدید'، روزنامہ 'ان دنوں' کے لیے بھی کرائم رپورٹنگ کی۔ انھوں نے عرصہ تک اپ ٹو ڈیٹ ہفت روزہ اخبار 'پیغام' چمن بھی شائع کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 24 اپریل 2012